# آج

## ۷۴

طاہر بن جلون

افضال احمد سید

عذرا عباس

ژولیاں

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

# آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 74

جولائی۔دسمبر 2012

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے)800روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک:ایک سال (چار شمارے) 80امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

بینک: میزان بینک،صدر برانچ، کراچی

اکاؤنٹ: City Press Bookshop

اکاؤنٹ نمبر:0100513669

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35650623 35213916

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

# ملالہ یوسف زئی

کے نام

جو پاکستانی سماج کی ان تمام قدروں
کی نمائندہ ہے جو ہر قیمت پر
بچائے جانے کے لائق ہیں

Scanned with CamScanner

# ترتیب

طاہر بن جلون

7

رخصت

(ناول)

❄

افضال احمد سید

241

ناظم حکمت کے ساتھ ساڑھے تین سال

شاعرلر پارک

معصومیت میوزیم

معصومیت کا ایک اور میوزیم

معمارِ اعظم کا کاسۂ سر

جو سرِ نخلِ صنوبر ہے، لحد کس کی ہے

آئینہ ساز

Scanned with CamScanner

عذرا عباس

261

یہ بارش حیران کرتی ہے مجھے    کام سے گھر کی طرف جاتے ہوئے

آنکھیں کتنا خوش ہوں    ایک آنچ کی دوری پر    نظم    وقت

نظم    کسی کو پتا نہیں    نظم    آدمی مرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے

کمال کر دیا ہے    غموں کی زبان نہیں ہوتی    نظم

دل بھٹک گیا تو کیا ہوگا    نظم    رینے

اب جیسے سب کچھ اچھا ہو رہا ہے    بے اختیار    بول میری مچھلی

نظم    میرے غم    جلاوطن    نظم    غلام بچہ

ویلنٹائن ڈے    میرے راز

ژولیاں

297

منیر جعفری شہید

# نئی کتابیں

## نئے نام کی محبت

نظمیں

تنویر انجم

Rs.350

## یاقوت کے ورق

نظمیں

علی اکبر ناطق

Rs.200

## فارسی کہانیاں

انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال

Rs.450

## ہندی کہانیاں : ۴

انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال

Rs.350

## بالوں کا گچھا

(ناول)

خالد طور

Rs.500

Scanned with CamScanner

# ریشارد کاپوشنسکی

# شہنشاہ

## انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

## قیمت :200 روپے

ایران میں 1979 میں برپا ہونے والا انقلاب ہمارے خطے میں پیش آنے والا ایک نہایت اہم اور پر معنی واقعہ تھا، اور اس کے بارے میں بے شمار مضامین اور کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتاب پولینڈ سے تعلق رکھنے والے معروف صحافی ریشارد کاپوشنسکی (Ryszard Kapuscinski) کے ادبی رپورتاژ shah of shah کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد غالباً آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ایران کی جدید تاریخ کے پس منظر میں اس انقلاب کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے اور پُراثر انداز میں بیان کرنے میں مشکل ہی سے کوئی اور تحریر اس بلندی کو پہنچی ہوگی۔ یہ ترجمہ پہلی بار سہ ماہی آج، کراچی کے شمارہ 14 (گرما خزاں 1993) میں اور پھر کتاب کی شکل میں 1997 میں شائع ہوا۔

آج کی شورش زدہ دنیا کی گرفت میں لانے کے ایک خاص طرح کی فہم اور خاص طرح کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس پیچیدہ دنیا کے واقعات کو اُن اصطلاحوں اور اظہار کے اُن سانچوں کی مدد سے سمجھنا اور بیان کرنا ممکن نہیں رہا جنھیں ایک نسبتاً سادہ تر دنیا کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ معمولی درجے کے صحافی بلکہ تخلیقی ادیب بھی۔ واقعات کے اس جم غفیر میں راہ کھو بیٹھتے ہیں اور اپنے بیان کو کوئی واضح اور مکمل شکل نہیں دے پاتے۔ کاپوشنسکی کے پاس یہ گُر موجود ہے۔ ان کی تحریریں عام صحافتی تحریروں سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے لیے ایک خاص زمرہ وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ادب اور صحافت کے درمیان تمام امتیازات یہاں آ کر اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں۔

کاپوشنسکی کے مخصوص اسلوب اور بیانیے کی ہیئت کو بعض لوگوں نے ''طلسمی حقیقت نگاری'' کی وضع پر ''طلسمی خبر نگاری'' کا نام دیا، اگرچہ خود ان کے خیال میں اسے ''ادبی رپورتاژ'' کہا جانا چاہیے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ عمدہ صحافت کا راستہ شاعری سے ہو کر گزرتا ہے کیونکہ شاعری اظہار میں درستی اور تناسب کی تربیت دیتی ہے۔ کسی وسیع حقیقت کو احتیاط سے چنی ہوئی چھوٹی چھوٹی تفصیلات ایک حساس بیانیے کی ہیئت میں مرتب کر کے بیان کیا جا سکتا ہے، اور یہ ہنر کاپوشنسکی کی تحریروں میں کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ کاپوشنسکی اُس شے پر بالکل یقین نہیں رکھتے جسے ''غیر جانبدار صحافت'' کہا جاتا ہے: ان کے خیال میں صحافی کبھی ایک لاتعلق گواہ نہیں ہو سکتا۔ وہ یورپ میں ادبی رپورتاژ کی اس روایت کا حصہ ہیں جس میں واقعہ نگار کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کاپوشنسکی کا کہنا تھا کہ وہ دنیا کے ہر خطے میں موجود ایسے لوگوں کے لیے لکھتے ہیں جو ابھی اتنے عمر رسیدہ نہیں ہوئے کہ دنیا کے بارے میں تجسس کھو بیٹھیں۔

Scanned with CamScanner

# صادق ہدایت

# بوف کور

## فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

## قیمت: 200 روپے

شہر رے کے نواح میں ایک خستہ و درماندہ شخص اپنی زندگی اور تخلیق کے کابوس کو کاغذ پر منتقل کر رہا ہے تاکہ خود کو پہچان پانے سے پہلے مر نہ جائے۔ اپنی تلاش کا یہ آسیب اُسے خود کو دہراتی ہوئی ایک تاریک اور مہیب دنیا میں لے جاتا ہے جہاں وجود انسانی کے ناقابلِ علاج زخم تازہ ہیں۔ ڈراؤنے خوابوں کی یہ دنیا ایڈگر ایلن پو کی دنیا سے مماثل ہے اور اس کی تعبیر وجودیت کے فلسفے کی مدد سے بھی کی جاتی رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اہم ناول، جو اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک زندہ دستاویز اور فنی معیار کے لحاظ سے ایک مکمل شہ پارہ ہے، جدید فارسی ادب کو ادبِ عالیہ کے بڑے دھارے سے جوڑ دیتا ہے۔

اس ناول کے مصنف صادق ہدایت کو متفقہ طور پر فارسی فکشن کا پہلا بڑا نام سمجھا جاتا ہے۔ ہدایت ۱۹۰۳ء میں تہران میں پیدا ہوا اور ۱۹۳۰ء میں اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ ہدایت کی دوسری تصانیف میں تاریخی ڈرامے، طنزیہ خاکے (''وغ وغ ساہاب'')، تنقیدی مقالے اور مغربی زبانوں کے فکشن کے ترجمے شامل ہیں۔ اپنے زمانے کی مذہبی رسومیات پر اس کی شدید طنز آمیز تحریر ''توپ مرواری'' اس کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ تاہم ''بوف کور'' کو ہدایت کا اہم ترین ادبی کارنامہ خیال کیا جاتا ہے۔ زندگی سے بیزاری، موت کی کشش اور خودکشی کا میلان ہدایت کی گنجلک شخصیت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اس تاریک طرزِ احساس کی وجہیں اس کے ذاتی احوال میں بھی تلاش کی گئی ہیں اور اپنے وقت کے ایرانی معاشرے سے اس کی عدم مناسبت میں بھی۔ وہ رفتہ رفتہ ایران میں جینے مرنے سے بالکل بیزار ہو کر ۱۹۵۰ء میں فرانس چلا گیا اور اپریل ۱۹۵۱ء میں پیرس میں گیس سے دم گھونٹ کر خودکشی کر لی۔

اس اردو ترجمے کے لیے ناول کے اصل فارسی متن کے علاوہ ڈی پی کاستیلو کے کیے ہوئے انگریزی ترجمے The Blind owl کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

طاہر بن جلّون

# رخصت

(ناول)

انگریزی سے ترجمہ:

محمد عمر میمن

Scanned with CamScanner

آج کے شمارہ 69 میں طاہر بن جلون (Tahar Ben Jalloun) کے ناول کرپشن کا اردو ترجمہ شائع ہوا تھا۔ اس بار محمد عمر میمن نے ان کے ایک تازہ ناول کا ترجمہ رخصت کے عنوان سے کیا ہے جو آئندہ صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ ناول فرانسیسی زبان میں *Partir* کے عنوان سے 2006 میں اور لنڈا کوورڈیل کا کیا ہوا اس کا انگریزی ترجمہ *Leaving Tangiers* کے عنوان سے 2009 میں شائع ہوا۔

طاہر بن جلون مراکش سے تعلق رکھتے ہیں اور شمالی افریقہ کے ان ادیبوں میں سے ہیں جو فرانسیسی میں لکھتے ہیں اور فرانسیسی ادب کے بڑے دھارے میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ وہ مراکش کے شہر فاس میں 1944 میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ برس کی عمر تک طنجہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے رباط کی محمد خامس یونیورسٹی میں فلسفے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر فلسفہ پڑھانا شروع کیا۔ طالب علمی کے دنوں میں وہ نظمیں لکھنے لگے تھے۔ 1971 میں انھوں نے اس بنا پر مراکش چھوڑ دیا کہ فلسفے کا ذریعہ تعلیم عربی کو بنا دیا گیا تھا جبکہ انھیں فرانسیسی ہی میں پڑھانے کی خواہش تھی۔ پیرس جا کر انھوں نے نفسیات میں مزید تعلیم حاصل کی اور زیادہ سرگرمی سے لکھنا شروع کیا۔ ان کے متعدد ناول اور دیگر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

1994 میں شائع ہونے والے ناول کرپشن کی طرح رخصت کا موضوع بھی تیسری دنیا کے ملکوں اور ان میں رہنے والوں کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس ناول کا تانابانا اپنے تبدیلی سے دوچار اور آمریت، ناانصافی اور تشدد میں مبتلا ملک کو چھوڑ کر ترقی یافتہ دنیا کے کسی ملک میں جا بسنے کی تگ و دو کرنے والوں کی زندگی کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ترکِ وطن کی یہ بے پناہ آرزو اور اسے حاصل کرنے کی راہ میں اٹھائی جانے والی اندوہناک دشواریاں ہمارے اپنے قومی تجربے کے لیے بھی اجنبی نہیں، اگرچہ ہمارے فکشن نے اس اہم موضوع کی طرف کم ہی توجہ دی ہے۔ دوسرے کنارے کی یہ کشش اس ناول کے محلِ وقوع، مراکش کے شہر طنجہ، کے مخصوص جغرافیے کے باعث اور بھی زیادہ نمایاں ہو کر ابھرتی ہے کیونکہ اس ساحلی شہر کے رہنے والے اس کنارے سے آبنائے جبرالٹر کے اُس طرف اسپین کی ساحلی بستی کی روشنیاں تک دیکھ سکتے ہیں۔ ناول کے مرکزی اور ضمنی کردار مہاجرت کے اس تجربے کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں اور طاہر بن جلون نے اپنی دردمند اور باریک بین نگاہ اور فکشن کے فن میں اپنی منفرد مشاقی سے اس تجربے کی گہرائی میں پڑھنے والوں کو شریک کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

Scanned with CamScanner

میرا کا میرونی دوست فلوبئیر رخصت ہوتے وقت ''یہ رہا میں!'' کہتا ہے، اور خدا حافظی کے لیے: ''ہم ساتھ ہیں!'' یہ بدقسمتی کو دور رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ اس ناول میں رخصت ہونے والے واپسی کی نیت سے رخصت نہیں ہو رہے ہیں، اور جب وہ کسی سے رخصت ہوتے ہیں تو یہ ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے۔ فلوبئیر نے، جس نے اسکول میں مادام بوواری کے چند صفحات کا مطالعہ کیا تھا، وعدہ کیا ہے کہ گرما کی تعطیل شروع ہوتے ہی جب گھر لوٹے گا تو یہ کتاب پوری کی پوری پڑھ ڈالے گا۔

Scanned with CamScanner

# 1

# توتیا

سردیوں کے دنوں میں طنجہ کا 'کیفے حافہ' خوابوں کے لیے ایک رصدگاہ اور ان کا کشتہ بن جاتا ہے۔ قبرستان، چھجہ نما چبوتروں، اور مارشن علاقے کے معروف عوامی تندور سے بلّیاں نکل نکل کر کیفے کے آس پاس جمع ہو جاتی ہیں، جیسے وہاں ہونے والے تماشے کو خاموشی سے دیکھ رہی ہوں، اور کسی کو اُتو نہ بنا رہی ہوں۔ کیف[1] پینے کی لمبی لمبی چلمیں ایک میز سے دوسری پر گردش کرتی رہتی ہیں اور پودینے کی چائے کے گلاس پڑے پڑے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، مکھیوں کو للچاتے ہیں جو بالآخر ان میں لڑھک ہی جاتی ہیں۔ گاہکوں کو، جو دیر ہوئی کہ حشیش اور بھڑکیلے خیالوں کے برزخ میں اتنا غفیل ہو چکے ہوتے ہیں، اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ایک کمرے کے عقبی حصے میں دو آدمی بے خودی کے دروا کرنے والی کنجی بڑی جانفشانی سے تیار کر رہے ہیں۔ وہ پتیوں کا انتخاب کرتے ہیں، پھر انھیں بڑی تیزی اور کارگزاری سے قیمہ کرتے ہیں۔ دیوار سے پشت ٹکائے چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے گاہک افق کو ٹکٹکی باندھ کر یوں دیکھتے ہیں جیسے اپنی تقدیر کا حال پڑھنا چاہتے ہوں۔ وہ سمندر کی طرف دیکھتے ہیں، ان بادلوں کی طرف جو پہاڑوں میں تحلیل ہو رہے ہیں، اور پھر اسپین کی جھلملاتی روشنیوں کے نمودار ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ بغیر دیکھے ہوئے ان کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور کبھی کبھار، اس وقت بھی جب روشنیاں دھند اور موسم کی خرابی میں گم ہو جاتی ہیں، وہ بہرحال انھیں دیکھتے ہیں۔

سب خاموش ہیں۔ سب ہمہ تن گوش ہیں۔ شاید آج شام وہ آئے گی۔ وہ ان سے بات کرے گی، انھیں اُس آدمی کا گیت سنائے گی جو ڈوب کر تنگنائے پر معلق سمندری ستارہ بن گیا تھا۔ انھوں نے طے کر رکھا ہے کہ کبھی اس کا نام نہیں لیں گے: یہ اسے تلف کر دے گا، اور مزید بدبختیوں

---

1۔ بھنگ؛ عربی لفظ 'کیف' (سرور، غنودگی اور احساسِ طمانیت) سے ماخوذ۔

کے ایک پورے سلسلے کو شبہ دے گا۔ سو حاضرین بس بیٹھے ایک دوسرے کو تکتے رہتے ہیں اور منھ سے کچھ کہتے نہیں۔ ہر کوئی اپنے خواب میں داخل ہوتا ہے اور اپنی مٹھیاں بھینچتا ہے۔ صرف بیرے اور چائے بنانے والا، جو کیفے کا مالک ہے، اس حلقے کے باہر رہتے ہیں؛ خوراک تیار کرتے ہیں اور بڑی چوکنی احتیاط سے گاہکوں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، کسی کے خواب میں مخل ہوے بغیر ایک چھجے سے دوسرے میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ گاہک ایک دوسرے کے شناسا ہونے کے باوجود باہم گفتگو نہیں کرتے۔ ان میں سے بیشتر ایک ہی محلے کے رہنے والے ہیں اور ان کے پاس بس اتنی ہی رقم ہوتی ہے کہ اپنی چائے اور کیف کی چند چلموں کی قیمت ادا کر سکیں۔ بعضوں کے پاس تختی ہوتی ہے جس پر وہ اپنے قرضے کا حساب رکھتے ہیں۔ وہ ہلتے جلتے نہیں، جیسے پہلے سے یہ طے کیے بیٹھے ہوں۔ خاص طور پر اس گھڑی اور اس نازک لمحے میں جب ان کا سارا وجود فاصلے میں غرق ہو، موجوں کی سبک ترین سلوٹ کا مطالعہ کر رہا ہو یا ساحل پر گھر لوٹتی ہوئی کسی کہنہ کشتی کی آواز پر لگا ہوا ہو۔ بعض اوقات، مدد کی طالب کسی صدا کی گونج سن کر، وہ ایک بال کو بھی جنبش دیے بغیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

ہاں، ہوسکتا ہے وہ نمودار ہو ہی جائے، اپنے چند اسرار ان پر منکشف کر ہی دے۔ ماحول حوصلہ افزا ہے: ایک صاف، تقریباً اجلا آسمان، شفاف سمندر میں منعکس، جو روشنی کے کنڈ میں بدل گیا ہے۔ کیفے میں خاموشی، ہر چہرہ پُرسکوت۔ شاید وہ بیش بہا لمحہ آ پہنچا ہے... بالآخر وہ کچھ کہے گی!

لوگ گاہے گاہے کنایوں میں اس کا ذکر ضرور کرتے ہیں، خاص طور پر اس وقت جب سمندر نے چند غرقاب جسموں کو لا پھینکا ہوتا ہے۔ اسے اَور مال مل گیا ہے، وہ کہتے ہیں، یقیناً ہماری کچھ نہ کچھ نوازش تو اس پر واجب الادا ہو گئی ہے! انھوں نے اسے 'توتیا' کا لقب دے رکھا ہے، ایک لفظ جو معنی سے بالکل تہی ہے لیکن ان کے لیے اس مکڑی کی مانند ہے جو انسانی ماس کی ضیافت کر سکتی ہے، تاہم کبھی کبھی انھیں خبردار بھی کر دیتی ہے، ایک ہمدرد آواز کے بھیس میں، کہ آج رات وہ رات نہیں، کہ انھیں اپنے سفر کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دینا چاہیے۔

وہ کھردری دیوار سے ٹیک لگائے، بچوں کی طرح اس کہانی کا یقین کر لیتے ہیں جو انھیں تسلی دلاتی ہے اور لوریاں دے کر سلا دیتی ہے۔ ٹھنڈی چائے کے لمبے لمبے گلاسوں میں پودینے کی سبزی

Scanned with CamScanner

سیاہ پڑ گئی ہے۔ مکھیاں ڈوب کر تہہ میں پہنچ گئی ہیں۔ لوگ اب اس چائے کی چسکیاں لینا چھوڑ دیتے ہیں جس میں تلخی آ گئی ہے۔ وہ چمچے سے ایک ایک کر کے مکھیاں نکال کر میز پر ڈال دیتے ہیں اور آہ بھر کر کہتے ہیں: ''بے چاری ننھی غرقاب ہستیاں، اپنی لالچ کی شکار!''

جیسے کسی مہمل خواب میں، جو ٹل کر نہ دے، عازل کو اپنا ننگا جسم دوسرے ننگے جسموں کے درمیان دکھائی دیتا ہے جو سمندری پانی سے پھول گئے ہیں: کھار اور آرزو نے اس کا چہرہ مسخ کر دیا ہے، کھال سورج کی تمازت سے جھلس گئی ہے، سینے کے ایک سرے سے دوسرے تک ادھڑ گئی ہے، جیسے کشتی ڈوبنے سے پہلے مار کٹائی ہوئی ہو۔ عازل کو اپنا جسم بتدریج اور صاف نظر آنے لگتا ہے، مچھلیاں پکڑنے کی ایک نیلی اور سفید کشتی میں جو بے حد ہولے ہولے سمندر کے وسط میں جا رہی ہے، کیونکہ عازل طے کیے بیٹھا ہے کہ اس سمندر کا ایک وسط ہے اور یہ ایک سبز دائرے کے اندر ہے، ایک قبرستان جہاں دھارا جسموں کو دبوچ لیتا ہے، سمندر کی تہہ میں لے جاتا ہے اور وہاں آبی گھاس کے ڈھیر پر لٹا دیتا ہے۔ عازل جانتا ہے کہ یہاں، اس مخصوص دائرے میں، ایک سیال حدِ فاصل کا وجود ہے، بحیرے اور سمندر کے درمیان ایک نوع کی حد بندی، بحیرۂ روم کے پرسکون، ہموار اور بحرِ اوقیانوس کے بپھرے ہوئے پانیوں کے درمیان۔ وہ انگلیوں سے ناک دباتا ہے، کیونکہ اتنے غور سے ان پیکروں کو دیکھتے رہنے کی وجہ سے اس کے نتھنے موت کی بو سے، ایک دم گھونٹ دینے اور چپک جانے والی مالش آور سڑاند سے بھر گئے ہیں۔ جب وہ آنکھیں موند لیتا ہے تو موت اس میز کے گرد رقص کرنے لگتی ہے جہاں وہ غروبِ آفتاب کا نظارہ کرنے اور تنگنائے کے اُس پار اسپین کے ساحل پر جھلملاتی اولین روشنیوں کو گننے کے لیے تقریباً ہر روز ہی آ بیٹھتا ہے۔ دوست خاموشی میں پتے کھیلنے کے لیے اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے چند ایک اس کی کسی دن ملک کو خیرباد کہہ دینے کی دیوانگی میں شریک ہوتے بھی ہیں، تو بھی وہ یہ جانتے ہیں، کیونکہ ایک رات انھوں نے تو تیا کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا، کہ انھیں خود کو غمزدگی کی ترغیب انگیز پکار کے سپرد نہ کر دینا چاہیے۔

عازل نہ اپنے منصوبے کے بارے میں منھ سے ایک لفظ نکالتا ہے نہ اپنے خواب کے بارے میں۔ لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ناخوش ہے، بے چین ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ ایک شادی شدہ عورت

کے عشق میں دیوانہ ہوگیا ہے۔ ان کے خیال میں اس کی غیر ملکی عورتوں کے ساتھ بلاخیز جنسی صحبتیں رہ چکی ہیں، اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ یہاں مراکش [2] سے کوچ کر جانے کے لیے ان کی مدد کا جویا ہے۔ ظاہر ہے، وہ اس کی تردید کرتا ہے اور معاملے کو ہنسی میں اڑا دینے کو ترجیح دیتا ہے۔ لیکن بہہ نکلنے، سبز رنگے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر تنگنائے کے پانیوں کو عبور کرنے کا خیال، ایسا سایہ بننے کا خیال جو صرف دن ہی میں نظر آتا ہو، ایک پیکر جو موجوں کے اس پار سرپٹ تیرتا ہوا جا رہا ہو، یہ خیال اب اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اسے اپنے تک ہی رہنے دیتا ہے، اپنی بہن کنزہ سے بھی اس کا ذکر نہیں کرتا، ماں سے تو اور بھی نہیں، جو پہلے ہی اس سے پریشان ہے کہ وہ بہت زیادہ تمباکو پھونکنے لگا ہے اور اس کا وزن گھٹتا جا رہا ہے۔

اب عازل بھی اس عورت کی کہانی پر یقین کرنے لگا ہے جو کسی دن ظاہر ہو کر انھیں، ایک ایک کر کے، اس فاصلے کو عبور کرنے میں مدد دے گی جو انھیں زندگی، اچھی زندگی، یا موت سے جدا کیے ہوئے ہے۔

# 2

## العافیہ

جب بھی عازل ہلکے پھلکے بے ترتیب خیالوں کے اس سمندری سبز دائرے سے خاموش اور تنہا باہر نکل آتا ہے تو اسے خنکی محسوس ہوتی ہے اور، موسم چاہے کچھ بھی ہو، جسم تھوڑا تھوڑا کپکپانے لگتا ہے۔ وہ بے اختیارانہ رات سے رخ پھیر لیتا ہے اور اس میں داخل ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ شہر کی سڑکیں ناپنے لگتا ہے، کسی سے بات نہیں کرتا، خود کو درزی متصور کرتا ہے، ایک خاص نوع کا پیرہن گر، جو سفید تاگے سے تنگ گلیوں کو کشادہ سڑکوں سے ملا کر سی رہا ہو، اس کہانی کی طرح جو ماں اس وقت سناتی تھی جب اسے سونے میں مشکل پیش آ رہی ہوتی۔ وہ یہ دریافت کرنا چاہتا ہے کہ آیا طنجہ ایک

---

2۔ مراکش ملک اور اس کے ایک شہر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ملک مراد ہے۔

مردانہ جلابہ ہے یا دلہن کا قفطان، لیکن شہر اتنا پھیل گیا ہے کہ اس کی جستجو ناکام رہتی ہے۔

فروری 1955 کی ایک رات، اس کا قائل ہو کر کہ طنجہ اب کوئی پیراہن نہیں رہا ہے بلکہ مصنوعی اون کا وہ کمبل بن کر رہ گیا ہے جو مہاجرت کر کے جانے والے بیلجیم سے اپنے ساتھ لاتے ہیں، عازل نے اپنی سلائی ترک کر دینے کا فیصلہ کیا۔ شہر ایسے پارچے کے نیچے چھپ گیا تھا جہاں حرارت حبس ہو کر رہ جاتی اور رطوبت منتشر ہونے کا نام نہ لیتی۔ طنجہ کی اب کوئی شکل وصورت نہیں رہی تھی، نہ کوئی مرکز، اس کے بجائے اس کے بے توازن عوامی چوراہے نکل آئے تھے جہاں کاریں ان دہقانی عورتوں کو باہر نکال پھینکتی تھیں جو کبھی فحص سے یہاں اپنی ترکاری اور پھل بیچنے لایا کرتی تھیں۔
شہر کی صورت بدل رہی تھی اور اس کی دیواریں تڑخنے لگی تھیں۔
عازل 'شارع ولی عہد' پر واقع 'وِسکی اَ گوگو' (Whisky à Gogo) نامی بار کے پاس ٹھہر گیا جسے دو ایک جرمن چلاتے تھے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھیں یہ یقین ہوتا ہے کہ انھیں پیش آنے والی ہر بات پہلے سے لکھی ہوتی ہے — عظیم آسمانی صحیفے میں نہ سہی، تاہم کہیں نہ کہیں ضرور۔ جو ہونا ہے ہو کر رہتا ہے؛ اس کے اپنے اختیار میں بہت کم ہے۔ یہ حکمت اس نے ماں کے زانو میں سیکھی تھی، پھر بھی کبھی کبھار وہ اپنے عمل کے ذریعے جبریت کے خلاف جدوجہد بھی کر لیتا تھا۔ اپنے معمول سے صرف اس لیے انحراف کرتا کہ اس طرح تقدیر کے ظلم سے سرتابی کا لطف اٹھا سکے۔ اُس رات، دروازے کے پاس لحاتی توقف کے دوران اسے پیش بینی سی ہوئی، ایک طرح کی جنونی خواہش کہ اپنی قسمت کی سمت چھلانگ لگا دے۔
جگہ خلاف توقع بہت پرسکون تھی۔ بار میں نوجوان عورت، جس نے اپنے بال سنہری رنگ رکھے تھے، بادہ خوروں کو ان کے مطلوبہ مشروب پیش کر رہی تھی۔ دو میں کا ایک جرمن گلّے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کبھی نہیں مسکراتا تھا۔
اندھیرے کمرے میں لوگ اپنی اپنی وِسکی کی بوتلوں کے ساتھ تنہا تھے۔ ہر شے پر نحوست اور دھندلاہٹ چھائی ہوئی تھی۔ ایک گٹھے ہوئے جسم کے آدمی کو بار پر لیمونیڈ پیتے دیکھ کر عازل کچھ ٹھٹک سا گیا۔ اس کی خوب موٹی گردن اور فرشی پتھر کی طرح چوڑی چکلی پیٹھ پھری ہوئی تھی۔ عازل اسے

Scanned with CamScanner

پہچان گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ مالا باطہ! بدقسمتی: یہ سید تھا، مقامی غنڈوں کا سرغنہ، ہیبتناک اور طاقتور، کم گو، سنگدل۔ لوگ اسے 'العافیہ' کہتے تھے، یعنی 'آگ'۔ یہ ایک نامی گرامی کشتی بان تھا جو کشتیاں بھر بھر کے ان غیر قانونی مہاجرت کرنے والوں کو اسمگل کیا کرتا تھا جو چوری چھپے تنگنائے کے پار جانے کا اتنا مصمم ارادے کیے ہوئے ہوتے — سمندر کو 'بھسم' کرنے کا — کہ اپنے شناختی کاغذات جلا ڈالتے، اس امید میں کہ اگر پکڑے گئے تو واپس گھر نہیں بھیجے جائیں گے۔

العافیہ جذبات کو اپنے اوپر بوجھ نہیں بننے دیتا تھا۔ ریف [3] کے پہاڑوں کا رہنے والا یہ شخص ہمیشہ سے اسمگلر رہا تھا۔ جب ذرا سا لڑکا تھا، راتوں کو اپنے چچا کے ساتھ الحسیمہ میں آنے والی کشتیوں سے 'سامان' اٹھانے جاتا تھا۔ اس کے ذمے نگہبانی کا کام تھا، اور وہ بڑے فخر کے ساتھ دوربین کو مہارت سے استعمال کرتا تھا، کسی فوجی کمانڈر کی طرح جو افق کا جائزہ لے رہا ہو۔ اسے اپنے باپ کو جاننے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کیونکہ وہ ٹرک کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ چچا نے لڑکے کو اپنی نگرانی میں لے لیا تھا اور اسے اپنا بھروسے کا آدمی بنا دیا تھا، سو جب یہ محافظ بھی اپنی باری آنے پر اٹھ گیا تو، ظاہر ہے، العافیہ نے اس کی جگہ لے لی۔ صرف وہی اس سے باخبر تھا کہ سارا معاملہ کیسے نبٹایا جاتا ہے۔ مشکل آ پڑنے پر کن لوگوں سے رابطہ قائم کرنا چاہیے، یورپ میں سازبازیوں سے رابطہ تھا جن کے فون نمبر اس نے زبانی یاد کر لیے تھے، ان خاندانوں کو ذہن میں رکھتا تھا جنھیں مدد کی ضرورت ہوتی تھی، کیونکہ ان کے باپ، چچا یا بھائی حوالات میں ہوتے۔ العافیہ کو کسی کا خوف نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے دھندے سے سروکار رکھتا تھا۔ اور یہ وہ آدمی تھا جس پر عازل، چند بیئر پینے کے بعد، ترنگ میں آ کر چلّانے لگا، اور حاضرین کو شہادت کے طور پر شامل کر لیا۔

''ذرا اس گول کپا پیٹ کو تو دیکھو، ہے نا پورے بدمعاش کا پیٹ؟ اور گردن، بالکل غنڈے کی نہیں لگ رہی؟ یہ ہر کسی کو خرید لیتا ہے — ظاہر ہے، یہ ملک ایک گرانڈیل منڈی جو ٹھہرا۔ دن رات مکر چکر ہوتا رہتا ہے۔ ہر کوئی بکاؤ ہے، بس ذرا سے اختیار ہی کی تو ضرورت ہوتی ہے، کچھ بھی مل جائے، بہت زیادہ نہیں، وسکی کی چند بوتلوں کی قیمت، کسی کسبی کے ساتھ ایک رات۔ لیکن اگر بڑا کام

---

3۔ مغرب کا شمال مشرقی ساحلی علاقہ جو پہاڑی سلسلے سے ملا ہوا ہے۔ یہاں کے بربر عرب باشندے بڑے مضبوط اور جفاکش خیال کیے جاتے ہیں۔

کروانا ہوتو پھر اس کی بھاری قیمت دینی ہوگی، پیسہ ایک ہاتھ سے دوسرے میں پہنچ جاتا ہے، سو اگر تم چاہتے ہو کہ میں منھ دوسری طرف کرلوں، تو وقت اور جگہ بتادو، زیادہ پاپڑ بیلنے کی ضرورت نہیں، میرے بھائی، دستخط چاہییں؟ صفحے کے نیچے ذرا سی گھسیٹ؟ کوئی مسئلہ نہیں، مجھ سے آ کر ملو، اور اگر بہت مصروف ہوتو اپنے ڈرائیور کو بھیج دو، وہی کانا، اسے کچھ نظر نہیں آنے کا، اور بس معاملہ فِٹ۔ میرے دوستو، یہ مراکش ٹھہرا، جہاں کچھ لوگ دیوانوں کی طرح سخت محنت کرتے ہیں، اس لیے کہ انھوں نے خود کو ایماندار رکھنے کا عزم کیا ہوتا ہے، یہ لوگ نظر سے اوجھل بیٹھے بیٹھے جان گھستے رہتے ہیں، ان پر کسی کی نظر نہیں جاتی، کوئی ان کا ذکر نہیں کرتا، جبکہ حقیقت میں انھیں تمغے ملنے چاہییں، کیونکہ ملک چل رہا ہے تو انھی کی دیانتداری کے دَم سے۔ اور پھر وہ دوسرے لوگ ہیں، مکھیوں کی طرح ہر طرف پھیلے ہوے ہیں، ساری وزارتوں میں، کیونکہ ہمارے پیارے ملک میں صرف رشوت ہی وہ ہوا ہے جو ہمارے پھیپھڑوں میں جاتی ہے، ہاں، ہم سے رشوت کی متعفن بو آتی ہے، یہ ہمارے چہروں پر ٹھپی ہے، ہمارے سروں میں بھری ہے، ہمارے تمھارے دلوں میں دفن ہے، بہر حال، اور اگر مجھ پر اعتبار نہیں، تو وہاں، اس بدمعاش گپا پیٹ سے جا کر پوچھ لو، اس کھوسٹ گنجے سے، ہتھیار بند تجوری، رازوں کا محفوظ ڈبا، وہی جو بیٹھا لیمونیڈ پی رہا ہے، کیونکہ حضور پکے مسلمان ہیں، شراب نہیں پیتے، بار بار مکّہ جاتے ہیں، ہاں بالکل، حاجی ہیں اور میں خلا باز ہوں! راکٹ میں بیٹھا ہوا ہوں، خلا میں فرار ہو رہا ہوں، اس زمین پر اب نہیں رہنا چاہتا، اس ملک میں۔ یہ سب دھوکے کی ٹٹی ہے، ہر آدمی کوئی نہ کوئی سودا پٹا رہا ہے، بہر حال، میں یہ نہیں کرنے والا۔ میں نے قانون کی تعلیم حاصل کی ہے، ایسی قوم میں جو قانون سے یکسر نابلد ہے، لیکن خالی خولی ہم سے قوانین کے احترام کا مطالبہ کرتی ہے، کیا مذاق ہے! یہاں صرف طاقت والے ہی کا احترام کیا جاتا ہے، صرف اتنا ہی ہے، باقی رہے دوسرے، تو وہ جائیں جہنم میں ۔۔۔ اور تم، محمد اوغلی، تم پرلے درجے کے چور ہو، امرد پرست ہو— زامل ۔۔۔ عطای ۔۔۔''

عازل اور زور سے چلّانے لگا تھا۔ بار میں بیٹھے ہوے سپاہیوں میں سے ایک، جسے خوب چڑھ گئی تھی، اٹھا اور العافیہ کے پاس آ کر اس کے کان میں سرگوشی کی، ''تم چھوڑو، میں اس سے نمٹتا ہوں۔ اس پر قومی امن کو خطرے میں ڈالنے کا الزام لگا دیتے ہیں ۔۔۔ امممن ۔۔۔''

العافیہ کے گرگے اس کے خفیف سے اشارے کی تعمیل کے لیے تیار تھے، اور بہر حال اس منہ پھٹ کا منہ تو بند کرنا ہی تھا۔ العافیہ نے عازل کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ دو دبنگ گٹھے بازوں نے عازل کو دبوچ لیا اور اٹھا کر باہر پھینک دیا، اور وحشیانہ طور پر اس کی دھنائی کرنے لگے۔

"پاگل ہو گیا ہے، باس کا پارہ چڑھا کر اپنا قیمہ کروا رہا ہے، ہنھ! ہر کوئی یہی سوچے گا کہ تو بھی اپنا وہی حشر کروانا چاہتا ہے جو تیرے یار کا ہوا تھا!"

❁

عازل کا چچازاد بھائی نورالدین دوست سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس کے لیے بھائی کی طرح تھا۔ عازل کی آرزو تھی کہ شاید ایک دن بہن کنزہ کی نورالدین سے شادی ہو جائے، لیکن نورالدین ایک رات، جب العافیہ کے آدمیوں نے کشتی میں بہت زیادہ آدمی لاد دیے تھے، آبنائے عبور کرتے ہوئے ڈوب گیا تھا۔ چوبیس آدمی اکتوبر کی اُس رات تلف ہو گئے جس کی بابت المیریا کی ساحلی پولیس چوکی کا دعویٰ تھا کہ اتنی متلاطم تھی کہ اس میں بچانے کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔

العافیہ نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے پیسہ لیا تھا، حالانکہ عازل کے سامنے ہی نورالدین نے اسمگلر کو بیس ہزار درہم دیے تھے۔ اس آدمی کے ضمیر پر ایک سے زیادہ موتوں کا بوجھ تھا، لیکن ضمیر نام کی کوئی چیز کب اس کے پاس رہی تھی؟ اس کے مختلف النوع دھندے خوب چمک رہے تھے۔ وہ بحیرۂ روم کے ساحل پر' القصر الصغیر' کے ایک بہت بڑے مکان میں رہتا تھا، جو ایک طرح کی زمین دوز پناہ گاہ تھی جہاں اس نے پیسے سے ٹھنسے بوروں کے انبار لگا رکھے تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کی دو بیویاں ہیں، ایک اسپینی، دوسری مراکشی، جو اسی مکان میں رہتی تھی لیکن کسی کو کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ چونکہ کیف کے دھندے کی کمائی اس کی ضروریات کے لیے کافی نہیں تھی، سو وہ ہر دوسرے ہفتے چند بوسیدہ کشتیوں میں ان بیچارے حرامیوں کو بھر دیتا جو اسپین جانے کے لیے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیتے۔ جن راتوں کو کشتیاں نکلتیں، العافیہ خود وہاں کبھی موجود نہ ہوتا: اس کے گرگوں میں کا کوئی ڈرائیور، محافظ، نقب زن، غرض ہمیشہ ایک نیا آدمی کارروائی کی نگرانی کرتا۔ العافیہ کے اپنے چغل خور اور مخبر تھے، اور سپاہی بھی۔ وہ انھیں "میرے آدمی" کہتا۔ اکثر رباط کے حکومتی کرتا دھرتا،

Scanned with CamScanner

اس خیال سے کہ طنجہ کی پولیس کو سن گن نہ ہو جائے، بڑی چوکسی سے اپنے سپاہیوں کو کشتیاں روکنے اور کشتی بانوں کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجتے۔ سو اس طرح العافیہ کے گرگوں میں سے چند کو جیل ہو گئی۔ جب تک وہ طنجہ میں محبوس رہے، العافیہ ان کی دیکھ ریکھ کرتا رہا، جیسے وہ خود اس کی اپنی اولاد ہوں، ان کے یومیہ کھانے پینے اور ان کے اہل و عیال کی کفالت کرتا رہا۔ مقامی جیل خانے میں اس کے روابط تھے، اس کے داروغہ سے صاحب سلامت تھی، بڑھ کر یہ کہ وہاں کے سنتریوں سے واقفیت تھی، جنھیں وہ اس وقت بھی بخشش دیتا رہتا جب اس کے گرگوں میں سے کوئی بھی وہاں قید نہ ہوتا۔

بدقماشی کے جملہ عنوان کا وہ چھٹا ہوا استاد تھا۔ ہر آدمی کے کردار، ضرورتوں اور کمزوریوں کا جائزہ لیتا اور ان کی شخصیت کے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہ کرتا، اور ہر خوانِ نعمت میں ایک انگلی ضرور دیے ہوتا۔ آپ کو گمان گزر سکتا تھا کہ اس نے کسی عجیب و غریب مضمون میں ڈاکٹریٹ کی سند لے رکھی ہوگی، لیکن العافیہ کو صرف گنتی پڑھنا آتا تھا۔ دوسرے تمام معاملات کے لیے اس کے وفادار اور اہل معتمد تھے جن سے وہ بَربَر زبان کی ریفی بولی میں بات کرتا جس میں چند لفظ اسپینی کے بھی گھلے ملے ہوتے۔ ہر کوئی اسے سخی داتا سمجھتا تھا: ''اپنے جذبات کا برملا اظہار کرتا ہے''؛ ''اس کا گھر آپ ہی کا گھر ہے''؛ ''خیر کا ٹھکانہ''؛ وغیرہ وغیرہ۔ کسی کو مکّہ کے سفر کی پیشکش کرتا، کسی دوسرے کو قطعۂ زمین کی، یا غیر ملکی کار کی (جو ظاہر ہے، چوری کی ہوتی)؛ اور کسی اور کو، یہ کہتے ہوئے کہ ''تمھاری بیوی کے لیے اچھی رہے گی،'' طلائی گھڑی کی۔ اپنے آدمیوں اور ان کے گھر والوں کا طبّی خرچہ برداشت کرتا، کوئی شام ایسی نہ جاتی کہ بار میں، جو اب رفتہ رفتہ اس کا ہیڈکوارٹر بن گئی تھی، ہر کسی کو شراب سے نہ نوازتا ہو۔

# 3

## عازل اور العافیہ

عازل اور العافیہ کے درمیان جنگ ایک زمانہ پہلے چھڑ گئی تھی — نورالدین کی موت سے بھی بہت پہلے۔ عازل نے ایک رات کوچ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور کشتی بان کو رقم پیشگی ادا کر دی تھی۔ لیکن عین

Scanned with CamScanner

موقعے پر سفر منسوخ کر دیا گیا اور عازل کو اپنی رقم کبھی واپس نہیں ملی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ تن تنہا اس جنات کے خلاف کچھ کرنا اس کی بساط سے باہر ہے، ایک ایسے آدمی کے خلاف جس کی دریا دلی سے فیضیاب ہونے والے ڈرتے تھے، جس کی پوجا کرتے تھے بلکہ جس کی سلامتی کے محافظ تھے۔ گاہے گاہے، خاص طور پر چند بئیر پینے کے بعد، عازل اس کی توہین کر کے اور دنیا بھر کی مغلظات سنا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ اب تک العافیہ اسے نہ سننے کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھا، لیکن اس رات عازل اس کا نام لے کر مخاطب ہوا تھا اور اسے زامل، یعنی مفعول امرد پرست، کہہ ڈالا تھا۔ انتہائی شرمناک بات! ایک اتنا طاقتور، اتنا بھلا آدمی لواطت کروانے پیٹ کے بل پڑا ہوا ہے! یہ حد سے زیادہ تھا۔ یہ گاؤدی پودنا اوقات باہر ہو گیا ہے۔ اب اسے عبرتناک سبق دینا ہی ہوگا: ''ابے او قابلِ رحم عبقری، سن۔ تو خوش قسمت ہے کہ یہاں کسی کو مردوں سے دلچسپی نہیں، ورنہ مدتوں پہلے تیری مقعد کے چیتھڑے اڑ گئے ہوتے! تو اپنے ملک پر تھوکتا ہے، اس کے بارے میں اول فول بکتا ہے، لیکن فکر نہ کر، بس دیکھے جا، پولیس تجھے تیزاب میں تحلیل کرنے کا کیسا انتظام کرتی ہے . . .''

❀

عازل نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی۔ بی اے امتیاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد اسے سرکاری وظیفہ ملا تھا، لیکن اس کے والدین فیس کا بقیہ حصہ ادا کرنے سے معذور تھے۔ وہ اس پر تکیہ کیے بیٹھا تھا کہ چچا، جو قریبی شہر العرائش میں قانون کا پیشہ کرتا تھا، اسے ملازمت دے دے گا۔ لیکن ایک پیچیدہ معاملے کے نتیجے میں چچا کے بیشتر موکلوں نے اسے چھوڑ دیا تھا اور اسے اپنا دفتر بڑھانا پڑ گیا۔ دراصل موکلوں نے اسے یوں چھوڑ دیا تھا کہ اس نے دوسروں کی روش پر کام کرنے سے انکار کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اس کی ساکھ خراب ہو گئی تھی: ''مسٹر العوالی کے پاس مت جانا۔ وہ ایماندار آدمی ہے۔ تمھارا کام نہیں بنے گا۔ وہ ہر مقدمہ ہار جاتا ہے!'' عازل سمجھ گیا کہ اس کا مستقبل کھٹائی میں پڑ گیا ہے، اور کسی قسم کے اثر و رسوخ کے بغیر اسے کبھی ملازمت نہیں ملنے والی۔ بہت سے دوسروں کی بھی یہی صورتِ حال تھی، سو وہ رباط میں پارلیمنٹ کے سامنے یونیورسٹی کے بے روزگار گریجویٹوں کے ایک دھرنے میں شامل ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

مہینے بھر بعد، جب کچھ بدل کر نہ دیا تو اس نے ملک چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا، اور بس میں سوار ہو کر واپس طنجہ آیا۔ بس میں بیٹھے بیٹھے اس نے ایک حادثے تک کا تصور کر ڈالا جو اس کی زندگی اور ناقابلِ برداشت مخمصے کا قصہ ہی پاک کر دے۔ اس نے خود کو مردہ صورت میں دیکھا، ماں اور بہن ماتم کر رہی ہیں، دوست احباب اس کی کمی محسوس کر رہے ہیں: بے روزگاری اور اس قدر لاپروا انتظام کا مارا ہوا کیسا ذہین لڑکا تھا، اچھا تعلیم یافتہ، حساس، مہربان، کیسے افسوس کی بات ہے کہ وہ اس گھسے ہوئے ٹائروں والی بس پر سوار ہوا، جسے ذیابیطس کا مریض ڈرائیور چلا رہا تھا اور موڑ کاٹتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔۔۔ بے چارہ عازل، اسے تو قرینے سے زندگی گزارنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملا، اس نے بساط بھر اس تنگنائے سے نکلنے کے لیے سب کچھ کیا، ذرا سوچو، اگر اس نے کسی طرح اسپین نکلنے کا انتظام کر لیا ہوتا تو اب تک ایک زبردست وکیل یا یونیورسٹی کا استاد بن چکا ہوتا۔۔۔

عازل نے اپنی آنکھیں مسلیں۔ بس ڈرائیور کے پاس گیا اور پوچھا کہ اسے شکر کی بیماری تو نہیں۔

"خدا بچائے! اس کا لاکھ لاکھ شکر۔ میں گھوڑے کی طرح مضبوط ہوں، اور میں نے اپنی زندگی خدا کے سپرد کی ہے۔ خیر، تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس یونہی۔ اخبار کا کہنا ہے کہ سات مراکشیوں میں سے ایک ضرور ذیابیطس کا شکار ہے۔"

"جانے دو، اخبار کے پڑھے پر یقین وقین مت کیا کرو۔۔۔"

ملک چھوڑنا — یہ جنون تھا، ایک قسم کا پاگل پن جو اسے دن رات اندر سے کھاتا جا رہا تھا: کیسے یہاں سے باہر نکلے، کیسے اس فروتنی اور تحقیر سے فرار پائے؟ اس ملک سے رخصت ہونا، اسے ترک کرنا جو اپنی اولاد سے مزید سروکار نہیں رکھنا چاہتا، ایسے خوشنما ملک سے پیٹھ پھیر لینا تاکہ ایک دن واپسی ہو، سرِ فخر سے اونچا ہو، شاید ایک مالدار آدمی: اپنی زندگی کو بچانے کے لیے نکلنا، اور وہ بھی ایسے کہ اسے بچانے میں خود اسی سے ہاتھ دھو لینے کا خطرہ ہو۔۔۔ اس نے اس سارے مسئلے پر خوب غور کیا اور یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ آخر اس کی یہ حالت کیسے ہوئی تھی۔ یہ سودا جلد ہی ایک لعنت بن گیا: اسے محسوس ہوا کہ بقا کا عزم، ایک سرنگ سے صرف اس لیے نکلنا کہ آگے دیوار سے سامنا ہو، اس پر آسیب کی

Scanned with CamScanner

طرح سوار ہو گیا ہے، اسے دق کر رہا ہے، اس پر پھٹکار برسا رہا ہے۔ دن بدن اس کی توانائی، جسمانی طاقت، اور تندرستی گھلتی جا رہی تھی۔ اس کے بعض دوستوں نے مایوسی سے نجات پانے کے لیے مذہب کا راستہ اختیار کر لیا اور جلد ہی باقاعدگی سے مسجد جانے لگے۔ لیکن اس راستے نے عازل کو کبھی نہیں لبھایا؛ اسے لڑکیوں سے اور پینے پلانے سے بہت شغف تھا۔ ایک بار کسی نے اس سے رابطہ قائم کیا تھا، ملازمت دینے اور سفر کی پیشکش کی تھی۔ ایک ڈاڑھی منڈا آدمی، جس نے مراکش کے مستقبل کے بارے میں بڑی شستہ فرانسیسی میں گفتگو کی تھی، خاص طور پر ایسے مراکش کے بارے میں جو اسلام پر لوٹ آیا ہو — راست بازی، سلامتی اور عدل و انصاف پر۔

یہ آدمی اضطراری پھڑکن کا شکار تھا، اس کی پلکیں غیر ارادی طور پر جھپکتیں اور وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے دبانے لگتا۔ عازل نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات سن رہا ہو لیکن مسکراہٹ دبا کر اسے صحرا میں مادرزاد ننگا دوڑتا ہوا تصور کرنے لگا۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ یہ شخص اسے مضحکہ خیز لگنے لگا۔ اس کے بعد عازل نے اس کی گفتگو پر توجہ دینا چھوڑ دیا۔ یہ سب اخلاقیات عازل کے لیے بیکار تھی: مذہب نے اس کی بیشتر لذتوں کو پہلے ہی حرام بنا رکھا تھا! اس نے سختی سے اس کی پیشکش کو رد کر دیا اور سمجھ گیا کہ حقیقت میں یہ شخص بہت ہی مشتبہ مقاصد کے لیے لوگ بھرتی کر رہا ہے۔ عازل چاہتا تو خود کو اس کے حوالے کر دیتا اور کچھ پیسہ بنا لیتا، لیکن اسے خوف محسوس ہوا، اسے موہوم سا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ اسے اپنا وہ پڑوسی یاد آ گیا جو ایک متشدد مذہبی جماعت میں شامل ہو گیا تھا، پھر ایسا غائب ہوا کہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب لوگ خدا کے منکر روسی کمیونسٹوں سے دو دو ہاتھ کرنے لیبیا اور وہاں سے افغانستان جا رہے تھے۔

چھ ماہ بعد اسی بھرتی کرنے والے نے دوبارہ کوشش کی۔ عازل کو کھانے پر بلایا، بس ''صرف بات کرنے کے لیے۔'' عازل اس شخص کی بابت سنجیدہ ہونے کے لیے تیار نہیں تھا، حالانکہ یہی شخص، اپنی اضطراری پھڑکن کے باوجود، بہت سی بھٹکی ہوئی روحوں کو کامیابی سے مذہب کی طرف لوٹا لا رہا تھا۔ عازل کو دلچسپی تھی تو اس کے ذرائع اور اس کی دلیلوں کی منطق سے، اور اس نے یہ کریدنے کی کوشش کی کہ اس کی تحریک کے پیچھے دراصل کون چھپا بیٹھا تھا۔ بھرتی کار پہلے سے ہی یہ بھانپ گیا تھا۔ وہ عازل کے سوالوں کا متوقع تھا، اور ان کا جواب جانے بوجھے انداز میں دیتا رہا، جیسے عازل کوئی

Scanned with CamScanner

پرانا دوست ہو اور وہ اسے کسی راز میں شریک کر رہا ہو۔

''میں نے ادب پڑھا ہے، سوربون میں تھیسس لکھ کر اس کا دفاع بھی کیا ہے۔ مراکش لوٹنے پر میں فرانسیسی ادب پڑھاتا تھا۔ اس کے بعد اسکولوں کے انسپکٹر کا کام کیا۔ ملک کے چپے چپے کا سفر کیا ہے اور وہ سب دیکھا ہے جو تم جیسے لوگوں کو دیکھنے کا موقع نہیں ملتا، اور میں نے روایتی، دیہی مراکش کی آواز سنی ہے۔ کسی نے میری برین واشنگ نہیں کی ہے، اور نہیں، میں کوئی دیوانہ نہیں: مجھے خوب معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔ ہماری سیاسی جماعتیں بری طرح ناکام رہی ہیں کیونکہ عوام ان سے جو کچھ کہہ رہے ہیں انھوں نے اسے سنا ہی نہیں سیکھا ہے۔ موقع ان کی پہنچ سے نکل چکا ہے۔ مجھے اشترا کیوں پر خاص طور پر غصہ آتا ہے۔ بس وہ سیاسی خوان سے باری باری اپنا حصہ لیتے رہے، طاقت کا کھیل کھیلتے رہے اور کوئی تبدیلی لاکر نہیں دکھائی۔ بادشاہ نے انھیں استعمال کیا، اور انھوں نے اس سے تعاون کیا۔''

وہ ذرا دیر کو رکا اور عازل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ پھر بات جاری رکھنے سے پہلے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنا زیریں لب دبایا لیکن اس بار آنکھ نہیں جھپکی۔

''بااختیار لوگوں میں سے کسی کو بھی اسلام کی پروا نہیں۔ یہ اسے استعمال کرتے ہیں، اس پر عمل نہیں۔ اور ہمارا منصوبہ ٹھیک یہی ہے کہ کچھ اور کیا جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں: عزت سے رہنا۔''

جب اس نے ناک زور سے سنکنے کے لیے توقف کیا، جیسے اپنی پھڑکن کی پردہ پوشی کر رہا ہو، تو عازل اسے گھورنے لگا اور باردگر اسے برہنہ حالت میں دیکھنے لگا، اس بار ایک مال خانے میں، جہاں ایک قوی ہیکل کالا اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ مدد کے لیے چلا رہا ہے۔ پھر لحیم شحیم کالے نے اسے جا لیا اور فلک شگاف قہقہہ مارتے ہوئے اسے ایک جھانپڑ رسید کر دیا۔

جب بھرتی کار جہاں تہاں سے جوڑ جاڑ کر اپنے اکتا دینے والے دلائل کا ورد کر رہا تھا، عازل اپنے دن سپنے میں فرار ہو گیا: وہ اب میڈرڈ کے 'پلازا مایور' کے ایک بڑے سے کیفے کی ٹیرس پر بیٹھا ہوا ہے۔ موسم سہانا ہے، لوگ باگ مسکرا رہے ہیں؛ ایک جرمن لڑکی، جو سیاحت پر نکلی ہوئی ہے، کسی جگہ کا راستہ پوچھتی ہے، اور وہ اسے ساتھ بیٹھ کر پینے کے دعوت دے رہا ہے... اچانک بھرتی کار کی آواز زیادہ بلند ہو گئی اور اسے واپس طنجہ ہنکا لائی۔

Scanned with CamScanner

''یہ برداشت سے باہر ہے کہ کوئی بیمار سرکاری ہسپتال جائے اور وہاں سے اس لیے چلتا کر دیا جائے کہ ہسپتال اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ سو جہاں سرکار نکمی ثابت ہوتی ہے، وہاں ہم مستعدی سے مداخلت کرتے ہیں۔ ہمارے تعاون میں جانبداری کا گزر نہیں۔ کچھ بھی ہو جائے، اس ملک کو بچانا ہے: مصلحت آمیز سمجھوتوں اور ناانصافیوں کی بہتات ہے، بے ایمانی اور نابرابری کی حد نہیں رہی۔ میں ہر پریشانی دور کرنے کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں، لیکن ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہتے، اس انتظار میں کہ حکومت اپنے رعایا کی خبر گیری کرے گی۔ مجھے فرانسیسی ثقافت سے بہت کچھ حاصل ہوا ہے، وہ ثقافت جس میں قانون کی پاسداری کی جاتی ہے، حقوق کی، عدل و انصاف اور انسانوں کے احترام کی ثقافت۔ مجھے اسلام میں بھی ایسی چیزیں نظر آئیں جن میں یہی روشن خیالی موجود ہے، مسلمانوں کے مقدس متون میں اور عربوں کے دورِ زرّیں کی ثقافت میں بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی آنکھیں کھول کر دیکھو اور اپنی زندگی کو بامعنی بناؤ۔''

اس شک سے کہ عازل کو اس کے وعظ سے شاید کم دلچسپی ہے، اس نے اپنے آخری جملے کو کئی بار دہرایا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم بھی اپنے بہت سے کامریڈوں کی طرح ہو، جن پر اس ملک سے بھاگ نکلنے کا بھوت سوار ہے۔ یہ صرف جان بچانے کا آسان سا راستہ نہیں ہے بلکہ حد سے زیادہ خطرناک بھی ہے۔ یورپ کو ہماری ضرورت نہیں۔ اسلام سے انھیں خوف آتا ہے۔ نسل پرستی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ تمھیں یہ زعم ہے کہ مہاجرت کر کے اپنا مسئلہ حل کر لو گے، لیکن ایک بار جب نکل گئے — اور یہ تو اس وقت جب تم واقعی زندہ سلامت دوسرے کنارے پہنچ جاؤ — تو پھر تمھیں اپنی ثقافت کی کمی محسوس ہو گی، اپنے مذہب کی، اور اپنے ملک کی۔ ہم مہاجرت کے خلاف ہیں، چاہے قانونی، چاہے چوری چھپے کی، کیونکہ ہمارا مسئلہ تو وہ چیزیں ہیں جنھیں ہمیں یہیں حل کرنا ہے، دوسروں پر تکیہ کیے بغیر۔ پھر کہتا ہوں، میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا ہوں کہ مذہب ہی سب چیزوں کا مداوا ہے۔ نہیں: مذہب تو صرف آدمی میں اعتماد پیدا کرتا ہے، خود اعتمادی، اور بس یہی تمھارے لیے دروازے کھول دیتی ہے۔''

اب وہ اپنی اضطراری اینٹھنوں پر قابو پا چکا تھا، اور عازل اب زیادہ توجہ کے ساتھ اس کی بات سن رہا تھا، تاہم وہ اس زندگی کے بارے میں تخمین و ظن کرنے سے باز نہ رہ سکا جو یہاں سے

Scanned with CamScanner

کہیں بہت دور اس کی ہو سکتی تھی۔ پھر اسے اپنا غائب شدہ دوست محمد لعربی [العربی] یاد آیا... اس بھرتی کار سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھنے کی کوئی تُک نہیں تھی جو غالباً کسی اسلامی تنظیم میں شامل ہو گیا تھا۔ عازل کا جی چاہا کہ شراب کا ایک جام پیے، لیکن ریستوراں میں مراکشیوں کو شراب نہیں دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں، بھرتی کار نے اس کا غلط مطلب نکالا ہوتا۔ عازل کے جی میں آئی کہ اسے بھڑکائے، کہے کہ مذہب کو سیاست میں نہیں پڑنا چاہیے، کہ آدمی کو چاہیے کہ لوگوں کو مسجدوں کے اردگرد منڈلانے پر مجبور کیے بغیر ان کی معاشی زندگی کو بہتر بنائے۔ اب بھرتی کار نے ایک پرائیویٹ اسکول میں، جہاں وہ پرنسپل تھا، قانون کے چند کورس پڑھانے کی پیشکش کی۔ اگرچہ تنخواہ واجبی سی تھی، عازل کا جی چاہا کہ قبول کر لے، لیکن جب اس شخص نے بتایا کہ وقتاً فوقتاً اسے ایسے ملکوں میں تبلیغی سفر پر بھی جانا پڑے گا جہاں مراکشیوں کو ویزے کی حاجت نہیں ہوتی تھی، تو عازل کی دلچسپی غائب ہو گئی۔ اس کا دل تو یورپ کا گرویدہ تھا، اور وہاں مہاجرت کرنے کی خواہش بڑی غلبہ آور تھی۔

جب دونوں نے خدا حافظ کہی، تو رابطہ قائم رکھنے کا وعدہ بھی کیا۔

''اگر تم کبھی تم چپکے سے اسپین میں داخل ہو جاؤ،'' بھرتی کار نے مزید کہا، ''تو مجھے بتانا۔ میں وہاں چند بھروسے کے دوستوں سے تمھارا رابطہ کرا دوں گا۔''

ایک بار پھر عازل نے اسے تصور میں ننگا دیکھا: حمام میں، ایک ترکی حمام میں، کہ بیٹھا مٹھی چپی کروا رہا ہے۔

# 4

## نورالدین

اگلی رات عازل سو نہ سکا۔ مراکش چھوڑنے کا جنون اس پر کیوں سوار تھا؟ یہ خیال آیا کہاں سے تھا، اور یہ کیوں اتنا شدید اور اٹل تھا؟ اپنے خیالات سے خائف، وہ نقلِ مکانی کرنے کی منہ زور خواہش اور

Scanned with CamScanner

بھرتی کار نے جو منصوبے سامنے رکھے تھے، جنھیں وہ پوری طرح برطرف کرنے سے معذور تھا، ان کے درمیان ڈانواڈول ہوتا رہا۔ یہ اذیت ناک ادھیڑ بن بے خوابی کی وجہ سے بڑی ڈراؤنی شدت اختیار کر گئی تھی۔ وہ اس خیال سے کہ کہیں گھر والوں کی نیند خراب نہ ہو، بڑی احتیاط سے بالکونی میں نکل آیا جہاں سے مارشان کے قبرستان کا منظر نظر آتا تھا۔ بڑی پیاری سی کیمیں روشنی اتنی تابنا کی سے چمک رہی تھی کہ سمندر سفید آئینے کی طرح لگ رہا تھا۔ عازل قبریں گننے لگا، نورالدین کی قبر کی جستجو میں۔ وہ تصور میں نہ لا سکا کہ کھارے پانی سے مسخ شدہ وہ شاندار جسم اب کیسا دکھائی دیتا ہوگا۔ یہ عازل ہی تھا جسے جا کر اپنے عم زاد اور رفیق کی لاش کی شناخت کرنی پڑی تھی۔ دوسرے ہلاک ہونے والوں کے چہرے بھی مسخ ہو گئے تھے، شاید شارک مچھلیوں نے انھیں بھنبھوڑ ڈالا تھا، لیکن نورالدین کا جسم، اگرچہ پھول ضرور گیا تھا، ان سے محفوظ رہا تھا۔ ان سب کے اردگرد گھر والے رو رہے تھے: بہت سوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کے عزیزوں نے تنگنائے عبور کرنے کا قصد کیا تھا۔ مُردوں میں دو عورتیں اور ایک بچہ بھی عازل کی توجہ میں آیا تھا، جو سب سفید چادر سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اور ٹھیک اسی لمحے گورنر مردہ خانے میں آدھمکا تھا، اپنی غمزدگی میں آپے سے باہر۔

''یہ آخری بار ہے! ارے تم، کیمرے والے، چلو، یہاں آؤ اور ان لاشوں کی تصویر اتارو! سارے مراکش کو یہ المیہ دیکھنا چاہیے! شام کے اخباروں میں اس کی شمولیت ضروری ہے اور اگر اس سے لوگوں کی بھوک مرتی ہے تو مرا کرے! بہت ہو گیا! بس بس! اس سے ہماری طبیعت بھر گئی ہے! یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ مراکش اپنی طاقت سے تہی دست ہوتا جا رہا ہے، اپنے جوانوں سے! پولیس کا داروغہ کہاں ہے؟ اسے فوراً یہاں لے کر آؤ۔ ہم ساحل پر داخلے کی پابندی لگائیں گے!''

اس منظر کی ایک تفصیل بھی عازل کو نہیں بھولی تھی، اور نہ وہ دم گھونٹنے والی بدبو جو ان مردہ جسموں سے آ رہی تھی جو ابھی چند دن پہلے تک ایک بہتر زندگی کے خواب سے سیراب ہو رہے تھے۔ اور نہ وہ نورالدین کی دودھ جیسی سفید آنکھوں کو بھولنے والا تھا، اور نہ اس کے داہنے ہاتھ کو جس میں ایک کنجی بھنچی ہوئی تھی۔ بچپن ہی سے عازل کو موت اور اس کے سارے متعلقات سے سخت ڈر لگتا تھا۔ وہ میت کو غسل کرانے والوں سے ہاتھ ملانے یا ایک ہی رکابی میں ان کے ساتھ کھانے سے اتنا زیادہ بچتا

تھا کہ انھیں میلوں دور سے پہچان لیتا تھا۔ اسے میتوں کے آس پاس جلتی ہوئی اُبھا دینے والی لوبان سے نفرت تھی۔ وہ تو کسی مرے ہوئے کا چہرہ دیکھنے سے بھی صاف انکار کر دیتا تھا۔ ایک غیر معقول خوف، ایک خبط جو اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا، اس سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ دس سال کا تھا جب دادا کے کفن دفن کے دن بھاگ کر پڑوسی کے گھر جا چھپا تھا، اسے یقین تھا کہ موت ایک چھوت ہے اور اس کا سایہ رات میں آ کر اسے اپنے لبادے میں اٹھا لے جائے گا۔ پہلی بار جب وہ اپنا خوف بھولا تھا تو اس وقت جب نورالدین کی لاش لینے گیا تھا۔ دوست کو گھر لانے کے لیے ساری انتظامی کارروائی سے خود عہدہ برآ ہوا تھا۔ نورالدین کی موت سے ماؤف ماں باپ روئے تھے اور سانحے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سرتاپا سفید کپڑوں میں ملبوس کنزہ کو تجہیز و تکفین میں شامل نہیں ہونے دیا گیا تھا: عورتوں کو گھر پر رہنا پڑا تھا، کہ یہی رسم و رواج کا تقاضا تھا۔ وہ اپنے اندوہ کی شدت سے چلّانے لگی تھی، وہ اپنے چچیرے بھائی اور منگیتر دونوں کے لیے رو رہی تھی، اور اپنی قسمت پر بھی تڑپ رہی تھی۔ نورالدین کو اسی دن دفن کر دیا گیا تھا، کیونکہ لاش بہت زیادہ سڑ گل گئی تھی۔ عازل کی مستعدی پر ہر متنفس حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ کمرے کے سامنے طلبا، یعنی قرآن کے عالم، جمع ہوئے تھے، جہاں انھوں نے خاموشی سے قرآن کی تلاوت کی اور مل کر چند دعائیں پڑھیں۔ قبرستان جانے سے پہلے جنازہ محلے کی مسجد کے پاس ٹھہر گیا، جہاں ایک آدمی بلند آواز میں ''جنازۃ رجل'' پکارا۔ نمازِ میت کو سامنے رکھ کر پڑھی گئی، جو اپنے سفید کفن میں اچھی طرح لپٹی ہوئی تھی جس پر سبز و سیاہ کشیدہ کاری کی زیبائش تھی۔ چند منٹوں بعد عازل اور تین اور دوست نورالدین کے جنازے کو اٹھا کر قبر تک لائے۔ طلبا نے الوداعی دعائیں پڑھیں اور میت کو ایک تنگ سے گڑھے میں رکھ کر تیزی سے مٹی، سلوں اور سیمنٹ سے بھر دیا گیا۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ختم ہو گیا۔ گھر والوں نے روٹی اور خشک انجیر فقیروں اور طلبا میں تقسیم کیے۔ عازل رشتے داروں کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور لوگوں کے تعزیتی جذبات وصول کرنے لگا۔ وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ جب لوگوں نے اپنے غصے کو نظر انداز کرنے اور دانش اور صبر کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی تو عازل کو یہ سب محض لگی بندھی روایتی باتیں معلوم ہوئیں، جو ایسے موقعوں پر نمائش کے لیے کہی جاتی ہیں۔ وہ اپنے دوست کو کبھی نہیں بھولے گا! اور وہ کسی نہ کسی طور اس کا انتقام لینے سے باز نہیں رہے گا۔

Scanned with CamScanner

بالکونی پر کھڑے عازل نے ایک سگریٹ پھونکی، پھر پنجوں کے بل واپس بستر پر آ کر دوبارہ محمد لعربی کے اچانک غائب ہو جانے کے بارے میں غور و خوض کرنے لگا، وہ دوست جسے بہلا پھسلا کر اسلامیوں کی جماعت میں بھرتی کر لیا گیا تھا، حالانکہ اس کا باپ یہی کہتا رہا کہ یہ ناممکنات میں سے تھا۔ اس نے اصرار کے ساتھ کہا کہ اس کا بیٹا با ایمان نہیں تھا، کبھی رمضان میں روزے نہ رکھتا اور اکثر شراب پی کر دُھت ہو جاتا تھا، اور حقیقت میں اس کی شراب نوشی کی لت گھر والوں اور آس پڑوسیوں کے لیے مسلسل عذاب بنی ہوئی تھی۔

''بالکل،'' ایک پولیس والے نے صراحت کی تھی، ''بالکل! ان اسلامیوں کو ایسوں ہی سے تو دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسوں کا دل جیت لینے کے ان کے اپنے طریقے ہیں۔ اور ایک بار جب آدمی ان کے گروہ میں شامل ہو جائے، تو وہ پاسپورٹ اور چند ویزے اس کے حوالے کرتے ہیں، ظاہر ہے جعلی، لیکن رنگروٹ کو کہاں پتا ہوتا ہے، اور تربیت کے لیے کسی مسلمان ملک بھیج دیتے ہیں، جیسے پاکستان یا افغانستان، جہاں ایک اور، نسبتاً زیادہ سخت گیر دستہ ان کو اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔ مقصد اب کھل کر سامنے آ جاتا ہے، یہی کہ مسلمان ملکوں کو مقامی اور غیر ملکی کفار سے پاک کیا جائے۔ یہ ساری کارروائی تین سے چھ ماہ لیتی ہے، کیونکہ برین واشنگ فوراً ہی نہیں شروع ہو جاتی، یہ لوگ اپنا وقت لیتے ہیں اور، اس سے بڑھ کر یہ کہ، بڑی منجھی ہوئی ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جو ان کے بے حد منظم ماہرین بڑی ہوشیاری سے تیار کرتے ہیں۔ یہ اپنی کوششوں کو ضائع نہیں ہونے دیتے، اور یہ سب ہمیں ان لوگوں کی معرفت معلوم ہوا ہے جو اُوبھ کر، آنکھ سے پردہ اٹھنے پر ان سے بھاگ نکلے تھے، وہ لوگ جنھیں اچانک احساس ہوا کہ کیا کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ لیکن آدمی اس کے خلاف کر ہی کیا سکتا ہے؟ ہم لوگ چوکنے اور چوکس ضرور رہتے ہیں، لیکن یہ لوگ مذہب اور ایمان، کمزور دماغی، کردار کے بودے پن وغیرہ کو ہدف بنا کر انھیں استعمال کر جاتے ہیں، جبکہ ہمارا واحد توڑ یہی ہے کہ جھوٹے کاغذات کی ٹوہ میں رہیں۔ پھر یہ کہ ان کے رنگروٹ ہوائی جہاز سے سفر نہیں کرتے، بلکہ بندرگاہوں سے، بھیڑ کے وقت، رات کو، اور کبھی کبھی پولیس والے یا کسٹم کے افسر کے ہاتھ میں چپکے سے دو ایک نوٹ بھی تھما دیتے ہیں، اور بس۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے یہ سب نہیں بتانا چاہیے، لیکن

حقیقت یہی ہے: اسلامیوں کا بڑے سے بڑا مددگار کرپشن ہے، جس کے خلاف لڑنے کے وہ مدعی ہیں، کیونکہ یہ بخشیش ہی ہے جس کے طفیل یہ لوگ سرحدی پولیس کے پنجے سے پھسل کر نکل جاتے ہیں۔ بڑے میاں، تمھارا بیٹا کسی نہ کسی دن نمودار ہوگا، اور تم اسے پہچان نہیں سکو گے، کیونکہ وہ بدل گیا ہوگا، سو ہمیں بتا دینا، اس طرح تم اپنے ملک کی بڑی خدمت کر رہے ہوگے . . . ''

محمد لعربی ایک بے چین نوجوان تھا، سرکش اور، اس سے بڑھ کر، تنگ آیا ہوا۔ جب طنجہ کی کچی آبادی کے محلے بنی مکادہ میں ہلڑ بازی ہو رہی تھی، جسے منشیات کے خلاف مہم کے دوران پولیس والوں نے اپنا ہدف بنایا تھا، تو اسے گرفتار کر لیا گیا تھا اور چند دنوں حوالات میں رہنا پڑا تھا۔ وہ ایک کم آمیز گم صم سا ہائی اسکول کا طالب علم تھا، لیکن بعض اوقات، ملک کی افتاد سے طیش میں آ کر، اربابِ اختیار اور ان کی مخالفین دونوں ہی کو صلواتیں سنا ڈالتا اور انھیں نکما کہتا۔ عازل کو یقین تھا کہ وہ کسی اسلامی جماعت میں شامل ہو گیا ہے اور اب کسی طرح کی ''لبریشن آرمی'' میں ہے۔ اگرچہ عازل اکثر اسے گرم مزاج کہتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ محمد لعربی کو پسند کرتا تھا اور اس پر متاسف تھا کہ اس کے غائب ہو جانے سے پہلے اس کے ساتھ کچھ اور وقت نہیں گزار سکا تھا۔

عازل اپنی کفالت کے لیے اپنی بڑی بہن کا رہین تھا جو ایک کلینک میں نرس کا کام کرتی تھی اور چونکہ کلینک تنخواہ کم دیتا تھا، اس لیے پرائیویٹ مریضوں کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی۔ اس کا باس، بہت مین میکھ نکالنے والا ایک پستہ قد سرجن تھا؛ پیسے کے معاملے میں کنجوس مکھی چوس لوگ ہمیشہ یہی طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، خواہ یہ ٹماٹر کے بھاؤ کا معاملہ ہو یا اسکینر کی قیمت کا۔ وہ کنزہ کو کم سے کم اجرت دیتا تھا۔ اس سے کہتا، ''تم ابھی کام سیکھ رہی ہو۔'' وہ خود ایک دن میں اتنا کما لیتا تھا جو اس کے یہاں کام کرنے والے سال بھر میں کماتے تھے، لیکن یہ بات اس کے پنج وقتہ نماز پڑھنے، اور ہر دوسرے سال حج کرنے میں حارج نہیں ہوتی تھی۔ ہر آپریشن سے پہلے وہ مختتانے کی پیشگی ادائیگی کا مطالبہ کرتا، اور وہ بھی نقد۔ وہ اپنی لالچ کے لیے بھی اتنا ہی مشہور تھا جتنا اپنی مہارت کے لیے۔ لوگ یہاں تک کہتے تھے کہ پیسے کی چاہت میں اس نے اپنے بہترین دوست کی مخبری کی تھی۔ اس کے باوجود وہ چین کی نیند سوتا تھا، اور آسودگی سے سرشار تھا۔ کنزہ کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ اپنی دوست

Scanned with CamScanner

سمیرہ کی ڈانواڈول زندگی کے مقابلے میں وہ اپنی سخت مشقت طلب ملازمت کو ترجیح دیتی تھی۔ سمیرہ اس کی ہمکار رہ چکی تھی اور بعد میں ایک حلقے میں، جسے دراصل عصمت فروشی کا روبار کہا جا سکتا ہے، ''میزبان'' کے طور پر شامل ہوگئی تھی۔ وہ ناشناسا مردوں کے ساتھ باہر ایسی محفلوں میں جاتی جہاں بڑے بڑے خطرات مول لینے پڑتے۔ شروع میں ہر چیز بے حد شاندار لگی، چمچماتی ہوئی اور سہل۔ لوگ اس سے اپنے ساتھ رقص کرنے کے لیے کہتے، لیکن ساتھ سونے کے لیے کبھی نہیں — اور یہ اس کے لیے بہت مناسب تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سب ڈھیر ہوگیا۔ وہ کتنی بار بھاگی بھاگی کنزہ کے پاس نہیں آئی تھی، دہشت زدہ، سخت زدوکوب کا شکار، اور جبراً عصمت دریدہ!

عازل نے کام کی تلاش سے ہاتھ کھینچ لیا تھا، کم از کم عادی انداز میں اپنے کوائف پر مشتمل درخواستیں بھیجنا ترک کر دیا تھا۔ ان کوششوں میں اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ہر جگہ کام تلاش کیا تھا، سول سروس میں اور تجارتی حلقوں میں بھی، لیکن اس غارت گر دنیا میں داخل ہونے کی جسارت کی اس میں سخت کمی تھی۔ مجموعی طور پر عازل ایک اچھا آدمی تھا، مگر مضبوط آدمی نہیں۔ بیچارہ لڑکا! اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ غلط راہ پر چل رہا ہے۔ کسی نے اسے خبردار نہیں کیا تھا: جہنم کھڑا کرنے کے بعد تخم حرام خود جنت کی سیر کرتے ہیں! اس کا جنون ہر جگہ اس کا پیچھا کرتا رہا: یہاں سے رخصت ہو جانے کا سودا! وہ اس کی پرورش کرتا رہا، اس سے چپکا رہا۔ اس اثنا میں وہ جیسے تیسے اپنی گزر اوقات کرتا رہا، کبھی پرانی کاریں بیچیں، کبھی ایک رہائشی جائیداد بیچنے والے کے گماشتے کے طور پر کام کیا، یہاں تک کہ فرانسیسی قونصل خانے کے سامنے کسی اور کی جگہ پانچ گھنٹے مسلسل قطار میں بھی کھڑا ہوا تھا جس کے عوض دو سو درہم ملے تھے۔ عازل بدقت تھوڑا سا کما لیتا تھا، جو بس غیر قانونی طور پر برآمدہ سگریٹ کے چند پیکٹ خریدنے کے لیے کافی ہوتا، اور ادھار پر چند برانڈ ناموں والے کپڑوں کی خرید کے لیے... باقی رہیں لڑکیاں، تو ان کا انتظام اس کا دوست الحاج، جو نورالدین کا دور کا عم زاد تھا، لڑکیوں کے پستانوں کی کھائی میں ایک عدد سو ڈالر کا نوٹ گھسیڑ کر دیا کرتا۔

Scanned with CamScanner

# 5

## الحاج

الحاج اور عازل کی عجیب جوڑی تھی۔ وہ نہ ہم عمر تھے نہ ان کی دلچسپیاں ایک جیسی تھیں۔ اس نوجوان کی رام کہانی سے متاثر ہو کر الحاج اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ الحاج جسمانی طور پر اتنا ہی کراہت انگیز تھا جتنا عازل پرکشش۔ عازل کے لڑکیوں سے تعلقات کبھی کبھار کے اور صاف سیدھے تھے: مقصد جنسی اختلاط تھا، اس کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ اس کے نزدیک عشق پالنا ایک تعیش تھا، خاص طور پر اس لیے کہ طنجہ میں لڑکی کو لے کر جایا بھی جائے تو کہاں، حتیٰ کہ کہیں جا کر شراب وراب بھی نہیں پی جا سکتی تھی۔ اس کے لیے کار ہونی چاہیے، پیسہ ہونا چاہیے، ملازمت ہونی چاہیے۔ ہر وہ چیز جو غیر ملکیوں کو میسر تھی اور اسے نہیں، اس شہر میں جو اسے ترغیب بھی دلاتا تھا اور برافروختہ بھی کرتا تھا۔ الحاج نے اپنی دیدہ زیب پہاڑی رہائش گاہ میں بڑے تپاک سے عازل کا خیر مقدم کیا۔ الحاج پارٹی بازی کا دلدادہ تھا۔ ریف کے بعض لوگوں کی طرح وہ بھی ایک دور میں آسانی سے ہاتھ آنے والے پیسے اور کسی لغزش کے امکان سے عاری تجارتی منصوبوں سے متمتع ہوا تھا، لیکن اپنے احباب کے برخلاف، وہ اپنی لطف اندوزی کی خاطر اس زندگی سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ شادی شدہ تھا لیکن اولاد سے محروم۔ اس کی بیوی سال کا ایک حصہ ان کے ریفی گاؤں میں گزارتی اور وہ خود اپنے وسیع و عریض مکان میں۔ ہر دو سال بعد وہ اسے حج کرانے مکہ لے جاتا۔ بیوی اس سے مطمئن تھی اور بدلے کے طور پر الحاج کو جو وہ چاہتا سو کرنے دیتی تھی۔ وہ طنجہ میں ڈنر پارٹیوں کا انتظام کرتا اور لڑکیاں بلانے کا کام عازل کے سپرد کر دیتا۔ رہائشی جائیداد کے جس ایجنٹ کے لیے اس نے چھوٹی موٹی خدمتیں انجام دی تھیں، اس نے عازل کو تفریح بازی کی متلاشی لڑکیوں کی ایک اچھی تنظیم سے متعارف کرا دیا تھا۔ یہ پیتی پلاتیں، رقص کرتیں، اور بالآخر جنسی اختلاط، ساتھ ہی ساتھ چند تحفے تحائف وصول کرتیں یا بے ٹوک کہا جائے تو نقدی۔ یہ نہ کوئی بیہودگی تھی نہ گندی بات۔ بہت سی لڑکیاں کسی نہ کسی طرح کی طالبات تھیں، دوسری کہتیں کہ سیکرٹری ہوا کرتی تھیں لیکن نوکری جاتی رہی، بعض عیش و عشرت کی متوالی نوجوان مطلقائیں

تھیں لیکن ان کے پاس وافر پیسہ نہیں تھا، پھر وہ تھیں جنھیں ان کی بڑی بہنیں دعوتوں میں ساتھ کھینچ لاتی تھیں کہ وہ بھی اس زندگی کا مزہ اٹھا سکیں، نوخیز اور سادہ لوح لڑکیاں، حسین اور دل لبھانے والی، اکثر واجبی سے گھرانوں کی، لیکن بعض اوقات کھاتے پیتے گھروں کی بھی۔ اس تنظیم کو، جس میں لڑکیوں کے مختلف زمرے تھے، خدوج نامی 'القوّادہ' چلاتی تھی، کوئی چالیس کے لگ بھگ عمر کی ایک دلاّلہ جو حماموں سے لڑکیاں بھرتی کرتی تھی یا اپنی سہیلی وردہ کی وساطت سے، جو آرائش گیسو کا کام کرتی تھی۔ سیل فون کی کامیابی کے صدقے (اور مزہ یہ کہ کریڈٹ ختم ہونے کے بعد بھی چھ ماہ تک کالیں وصول کی جا سکیں) دن یا رات کی کوئی گھڑی ہو، لڑکیاں مہیا ہوتیں۔ عازل انھیں طوائفیں نہیں گردانتا تھا، بلکہ صرف "سماجی مسائل" کہتا تھا۔ یہ الحاج کا مرغوب ترین فقرہ تھا اور وہ اس موضوع سے متعلق ایک پورا نظریہ رکھتا تھا۔

"ہمارے محبوب ملک میں عورت سے ملاقات کرنے کی صرف دو وجہیں ہو سکتی ہیں: یا تو یہ کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو، اس صورت میں اپنا قصہ پاک سمجھو، یا یہ کہ اسے اپنی داشتہ بنانا چاہتے ہو، جس کا مطلب ہے، کیا تم اس کا بار برداشت کر سکتے ہو؟ چونکہ یہ مطالبات کی بھرمار کرتی ہیں، ساز و سامان سے آراستہ اپارٹمنٹ چاہتی ہیں، ماہانہ تنخواہ، وقتاً فوقتاً تحفے تحائف، جو ظاہر ہے بالکل نارمل بات ہے، لیکن اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے جو ہم خود چاہتے ہیں، کیونکہ واقعی، ہمیں کس چیز کی تلاش ہے؟ ہم تو چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری جانیوں سے مزے لینا چاہتے ہیں اور شام کے آخر پر انھیں چند نوٹ تھما دیتے ہیں: اس میں بندھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کوئی عہد و پیمان نہیں ہوتا، تم بھی مزے لے رہے ہوتے ہو، وہ بھی مزے لے رہی ہوتی ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک ہی لڑکی سے دوبارہ مڈبھیڑ نہیں ہوتی، یہ شہوت نکالنے کا سودا ہوتا ہے۔ تبدیلی، میرے دوست، یہ خواہش کو تاابد جاندار رکھنے کی چابی ہے! سب کی سب بڑی من موہنی ہوتی ہیں، اور اس کے علاوہ، سب کی سب، سماجی مسائل ہوتی ہیں۔ اور ہم؟ ہم ان کی مدد کر رہے ہوتے ہیں! بڑی بات یہ کہ یہ واقعی آزادی یافتہ ہوتی ہیں، ان کے یہاں کوئی چیز ممنوع نہیں ہوتی، کوئی 'وہاں نہیں جاؤں گی' نہیں ہوتے۔ یہ سب کچھ کرتی ہیں، یورپین عورتوں سے زیادہ ماہر ہوتی ہیں، یقین کرو۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب گر آخر کہاں سیکھتی ہیں۔ گمان گزرتا ہے کہ ہو نہ ہو، کوئی جنسی اسکول ہوتا ہوگا جہاں فحش

Scanned with CamScanner

فلمیں دکھائی جاتی ہوں گی! نہیں، مراکشی عورتوں کا جواب نہیں، یہ حسین ہوتی ہیں، آتشِ شوق کو بھڑکاتی ہیں، صاف ستھری ہوتی ہیں، اور — یہ بے حد اہم ہے — یہ ہمیشہ حماموں میں ہوتی ہیں، اپنی ٹانگوں اور پیڑو پر روغن ملتی ہیں، آدمی کو پاگل کر دیتی ہیں، میں جب ان کے ساتھ ہوتا ہوں تو اپنی ذیابیطس و یابیطس سب بھول جاتا ہوں... ان کے ساتھ واقعی بڑا مزہ آتا ہے، کبھی بھول کر بھی پیسے ویسے کا ذکر نہیں کرتیں، یہ ان مہمانوں کی طرح ہوتی ہیں جو شام سے لطف اندوز ہونے کے لیے آئے ہوں۔ سارے تکلفات سے آزاد ہو کر پرسکون ہو جاتی ہیں اور آدمی کو یہ احساس دلاتی ہیں کہ وہ نہ صرف مہیا ہیں بلکہ خاص اسی کے لیے وہاں آئی ہیں۔ اس پر ان کی جلد اتنی نرم و گداز کہ چھو کر راحت پہنچتی ہے، اور شہوت کو تیز تر کر دیتی ہے۔ تم تصور کر سکتے ہو کہ جب جلد دار چینی، عنبر، مشک، غرض ہر ایسی خوشبو میں بسی ہوئی ہو جس کا تم نے کبھی خواب دیکھا ہو، تو آدمی پلک جھپکتے میں خود کو عرشِ معلیٰ پر پاتا ہے اور اپنی آنکھیں موند لیتا ہے، اس سے بے خوف کہ دوبارہ کبھی زمین پر گر پڑے گا۔ اسی لیے تو میں مراکشی عورتوں کا دلدادہ ہوں، وہ کم سے کم پر شروعات کرتی ہیں، پر کیا غضب کی رعنائی اور شان دکھاتی ہیں۔ بالکل، میرے دوست، ہم خوش قسمت ہیں، اور میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے اتفاق نہیں کرتے، اور مجھے غربت، استحصال، برائی، اخلاق، عورتوں کی حیثیت، عدل، مساوات، خصوصی مراعات، حتیٰ کہ مذہب کے بارے میں وعظ کرنے بیٹھ جاؤ گے۔ جو کچھ تم مجھ سے کہنے والے ہو وہ مجھے معلوم ہے، لیکن خود کو زندہ رہنے دو، اپنی جوانی کے مزے اڑاؤ...''

اُن میں کی بہت سی لڑکیاں عازل پر فریفتہ تھیں، لیکن وہ ان کی ہمت افزائی نہیں کرتا تھا اور اپنی حقیقتِ حال انھیں بے کم و کاست بتا دیتا تھا: ''میں چوبیس سال کا ہوں، کالج کا ڈپلوما ہے لیکن بے روزگار ہوں، میرے پاس نہ پیسہ ہے نہ کار۔ میں بھی سماجی مسئلہ ہوں — بس اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھا رہا ہوں، اور یہاں سے دفان ہو جانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ اس پورے ملک کو خیر باد کہنا چاہتا ہوں، سب کچھ پیچھے چھوڑ جانا چاہتا ہوں، سوائے چند یادوں اور تصویری پوسٹ کارڈز کے، سو مجھے محبت کرنے کے لیے نہیں تخلیق کیا گیا ہے، اور تم اس سے بہتر کی مستحق ہو، عیش و آسائش، حسن و خوبصورتی، شاعری کی اہل ہو... یہ جو ہمارے اور یورپ کے درمیان آٹھ نو میل حائل ہیں، تو میں انھیں پہلے بھی 'بھسم' کرنے کی کوشش کر چکا ہوں، لیکن میرے ساتھ دھوکے بازی کی گئی۔ ایک

Scanned with CamScanner

لحاظ سے میں اپنے چچازاد بھائی نورالدین سے قدرے خوش قسمت ہوں، جوالمیریا سے چند ہاتھ پہلے ڈوب گیا تھا، کیا تم تصور کرسکتی ہو؟''

لڑکیاں سنتیں، بعضی تو رونے بھی لگتیں۔ کبھی ایسے گھرانوں کی تھیں جہاں ان کے عزیزوں نے بھی اسی طرح ملک سے چلے جانے کی کوشش کی تھی۔ صرف سہام نے، جو اُن میں سب سے بڑی تھی، اقرار کیا کہ اس نے بھی، دوسروں کی طرح، یہ مسافت طے کرنے کی کوشش کی تھی، مگر ہوا یہ کہ اسپینی سنتری بھیس بدلے صبح سویرے ساحل پر ان کی گھات لگائے بیٹھے تھے، جیسے جنگ کے زمانے میں ہوں۔ وہ پکڑلی گئی، اس سے سوال جواب کیے گئے تھے، پھر واپس طنجہ بھیج دی گئی تھی، اس پر مغربی[4] پولیس کے ہاتھوں ٹھکائی نفعے میں۔ تب سے اس نے اور طریقے ڈھونڈ نکالے ہیں، لیکن اب بھی یہ امید باقی ہے کہ یہاں سے رخصت ہو اور جتنی دور ممکن ہو چلی جائے۔ ان لڑکیوں کے بارے میں جو باتیں کہی جاتی ہیں جنھوں نے بہتر زندگی کی آرزو میں مہاجرت کی تھی، انھیں سن کر اسے سخت تنفر محسوس ہوتا ہے۔

''اگر کوئی مرد تنگنائے عبور کرتا ہے، تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کام ڈھونڈ نکالے گا، لیکن جب کوئی عورت، خاص طور پر حسین عورت، یہی کرتی ہے تو اسے فوراً کسبی خیال کیا جاتا ہے! خلیجی ریاستوں میں ایسے مشہور نیٹ ورک موجود ہیں، اور اگر کوئی لیبیا تک پہنچ جائے، جس کے لیے ویزا کی حاجت نہیں ہوتی، تو وہاں سے دبئی یا ابوظبی پہنچنے کا پورا انتظام ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان توندیل اجڈوں کی نوچ کھسوٹ برداشت کرنی پڑتی ہے؛ بعض لڑکیاں یہ پسند کرتی ہیں، یا چلیں یہ کہیں کہ وہ اس کے بدلے جس قدر بھی اینٹھ سکیں۔ میرے ساتھ ایسا نہیں۔ اگر میں کبھی مہاجرت کرسکی تو یہ میرے والدین کی دیکھ بھال کی خاطر ہوگا۔ میلان میں میری بہن دو گھروں میں کام کرتی ہے، جہاں والدین کو خود ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد نے اکیلا ڈال رکھا ہے، سو وہ مراکش، تیونس، الجزائر سے آنے والی مغربی عورتوں سے آس لگاتے ہیں، جو ان کا کھانا پکاتی ہیں، ہسپتال لے جاتی ہیں، چہل قدمی میں رفاقت کرتی ہیں، کتابیں وغیرہ پڑھ کر سناتی ہیں، الغرض، ان کی حاجات پوری کرتی ہیں۔ اچھا کام ہے۔ میں بھی ایسا ہی کام کرنے کا خواب دیکھتی ہوں۔ میری بہن تدبیر کررہی ہے کہ

---

4۔ مغرب: اسلامی دنیا کا مغربی علاقہ جو افریقہ کے شمال مغرب میں واقع ہے اور جہاں عربی بولی جاتی ہے۔ اس میں الجزائر، مراکش، تونس وغیرہ ممالک شامل ہیں۔

Scanned with CamScanner

مجھے وہاں کا ویزا مل جائے۔''

جب الحاج نے موسیقی بجانی شروع کی تو سہام اور دوسری لڑکیاں رقص کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ انھیں دیکھ کر عازل کا دل جذبات سے بھر گیا۔ اس کا جی چاہا کہ انھیں باری باری اپنی آغوش میں بھر کر خوب قریب سے بھینچے۔ وہ مسرور تھا، لیکن ساتھ ہی اسے ان جذبات کی نازک اندامی کا بھی احساس تھا۔ اس شام اس نے سہام کے ساتھ مباشرت کی۔

''اگر کبھی تم اس ملک سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے چلو گے؟'' سہام نے بعد میں پوچھا، اور پھر خود ہی اعتراف کیا کہ وہ کسی فرانسیسی یا اسپینی مرد سے شادی کرنے کی آرزومند ہے۔

''اور میں بھی،'' عازل نے جواب میں کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور اس کی تصحیح کی: ''یعنی کسی فرانسیسی عورت یا اسپینی خاتون سے!''

عازل نے لمحہ بھر سوچا۔ پھر گمبھیرتا سے کہا، ''کیا فرق پڑتا ہے، اگر اس سے میرا خواب پورا ہوتا ہو...''

سہام پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ عازل نے اپنی بانہیں اس کے گرد ڈال دیں، ہاتھ کی پشت سے اس کے آنسو پونچھے اور زور سے بھینچ لیا۔

''اس ملک میں مرد عورت سے کبھی اپنی محبت کا اعتراف نہیں کرتا؛ ظاہر ہے، اس کا تعلق جنسی حیا سے ہے۔ لیکن میں تم سے کہہ رہا ہوں!''

''مجھے چاہتے ہو؟ تو دوبارہ کہو۔''

''یہ آسان نہیں۔''

''تو پھر مجھے چاہنے کا کیا مطلب ہے؟''

''یہی کہ تمھاری قربت کا دیوانہ ہوں۔ تم سے جفتی کرنے سے عشق ہے...''

''ایسی لڑکی کے ساتھ پوری زندگی گزار دو گے جو پہلی ملاقات میں ہی تمھارے ساتھ بستر میں آ گئی ہو، ایک لڑکی جو باکرہ نہیں رہی!''

''یقین کرو، میں یہاں کے تمام دوسروں جیسا نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے تو بکارت بہت بڑی علت معلوم ہوتی ہے۔ میں کسی لڑکی کی بکارت نہیں لوٹنا چاہتا۔ اس خیال ہی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول

Scanned with CamScanner

جاتے ہیں، وہ سب خون وون...''

''تو مجھ سے کہو، مجھے تم سے محبت ہے۔''

''پھر کبھی، جب تم اس کی توقع نہیں کر رہی ہوگی۔''

سہام پیٹ کے بل لیٹ گئی اور عازل کے عضو کو اپنے ہاتھ سے سہلانے لگی۔

''اب چونکہ تم مجھے چاہتے ہو لیکن اعتراف نہیں کر رہے، سو اب میں جو کچھ سوچتی ہوں تم سے کہتی ہوں!''

بس پھر کیا تھا 'عضو' کے جتنے نام اس نے شیخ النفزاوی کی الروض العاطر میں پڑھے تھے، ایک کے بعد ایک دہرانے شروع کر دیے۔ اور اس کے بعد 'فرج' کے سب نام جو وہاں استعمال ہوئے تھے، ان کے مصوّتوں کے تلفظ پر زور دیتے ہوئے، اور اس لسانی خزینے سے مزے لے لے کر۔ پھر جب محسوس ہوا کہ عازل کا عضو خوب تن گیا ہے تو اس نے کہا کہ اس کے پیچھے سے اندر آئے۔

اس کا یہ حکم، اگر اسے عربی میں ادا کیا جائے، تو اس میں فحاشی کا شائبہ نظر آئے گا، کوئی عنصر جو بیک وقت شہوت انگیز بھی تھا اور نا قابلِ برداشت بھی۔ عازل کی ساری استادگی جاتی رہی۔

''تم مجھے ستانے کا تہیہ کیے بیٹھی ہو! میں تمھارے اندر داخل نہیں ہوں گا، نہ آگے سے، نہ پیچھے سے۔''

''تمھاری مرضی — لیکن مجھے کم از کم ایسا لباس تو دلوا دو جس کے آر پار دیکھا جا سکے۔ گرمیوں میں پہنوں گی جب ہوا تیز چل رہی ہو: بغیر پینٹیز کے۔ اس طرح لوگوں کو میرا پیٹ نظر آئے گا، میرا دوشاخہ، میرے کولھے، اور سارے مرد لہلوٹ ہو کر میرے سامنے آ پڑیں گے!''

دونوں نے ہنستے ہوئے اپنے کپڑے پہنے۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے عازل نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا: ''تم نے پیچھے سے داخل ہونے کے لیے کیوں کہا؟''

''اپنی بکارت سے چمٹی ہوئی لڑکیاں ایسا ہی کرتی ہیں۔ کیونکہ اس میں کوئی خطرہ نہیں۔ کچھ مدت تک میں بھی یہی کرتی رہی اور شروع میں یہ مجھے اچھا نہیں لگا، بڑی تکلیف ہوتی تھی، لیکن عجیب بات ہے کہ بعد میں مجھے مزہ آنے لگا۔ اس کے بعد گاہے گاہے دونوں طریقوں سے مزے لیتی ہوں، لیکن لگتا ہے تمھیں یہ بات بہت زیادہ پسند نہیں...''

Scanned with CamScanner

’’نہیں۔ شروع جوانی میں دو چار بار لونڈوں کے ساتھ جفتی کی تھی، لڑکیوں کے ساتھ اس طرح کبھی نہیں کیا۔ مجھے زیادہ پسند نہیں۔ ابھی ابھی جو ہوا اس پر مجھے افسوس ہے۔‘‘

الحاج دونوں بغلوں میں ایک ایک لڑکی دبائے کمرۂ نشست میں ڈھیر ہو چکا تھا اور اب خراٹے لینے لگا تھا۔ نیم برہنہ لڑکیاں ہونٹ پھاڑے کانوں تک مسکرا رہی تھیں۔ عازل اسے جگانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے لڑکیوں کو، جن میں سے ہر ایک کو سو ڈالر کا نوٹ ملا تھا، الحاج کی کار میں ان کے گھر پہنچانے کی پیشکش کی۔

اس سے نمٹ کر عازل بغیر کچھ کہے شہر بھر میں کار میں گھومتا رہا اور سہام اس کا بازو پکڑے بیٹھی رہی۔ اس کے جی میں آئی کہ کوئی جنونی اور من پسند حرکت کرے، لیکن عازل کچھ مغموم سا نظر آ رہا تھا، سو آخر میں وہ گھر چلی گئی۔ صبح کوئی پانچ بجے کے لگ بھگ عازل نے خود کو ’شاہراہِ پاستور‘ کی سیر گاہ میں یک و تنہا پایا، جہاں سے تنگنائے کے پار بالکل سامنے طریفہ کی جھلملاتی روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ بندرگاہ سے لگی ہوئی سڑک پر ہوتا ہوا تھیٹر سیروانتس کے کھنڈرات کے پاس سے گزرا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسپینی شہریت لیتے ہی وہ واپس آ کر اس عمارت کو بحال کروائے گا۔ بندرگاہ کے داخلے پر ایک پولیس کے سپاہی نے، جو بڑے خراب موڈ میں تھا، اسے للکارا:

’’او، تم! کدھر جا رہے ہو؟‘‘

’’کشتیوں کے رخصت ہونے کا نظارہ کرنے!‘‘

’’چلو، باہر نکلو! ہماری جان عذاب میں ڈالنے کو اسپینی اور یہ ہر وقت موقعے کی گھات میں دبکے بیٹھے آس پاس کے افریقی کیا کم ہیں جو اب تم بھی آ دھمکے ہو...‘‘

’’کیوں گھبراتے ہو؟ میں تنگنائے کو بھسم کرنے نہیں آیا، صرف ٹرکوں پر سامان لدنے کا نظارہ کرنے آیا ہوں۔ کم از کم ان مال بردار کھوکھوں پر رشک کرنے کا حق تو مجھے حاصل ہی ہے! میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ان جیسا ایک کھوکھا ہوتا — ان کے اندر نہیں، ورنہ دم گھٹ جاتا — بس ایک کھوکھا، جو یورپ کے کسی مال گودام کے حوالے کیا جاتا، کسی آسودہ حال اور آزاد ملک میں، ہاں، ایک سادہ، سستا سا چیڑ کا کھوکھا، ایک بے نام کھوکھا جس پر میں نے بڑے بڑے سرخ حرفوں میں لکھنا چاہا ہوتا: Fragile اور This Side Up۔‘‘

''پاگل!''

''بالکل! یہ لو، سگریٹ پیو۔''

پولیس والے نے بلاتردد سگریٹ لے لی اور بولا کہ بس اب وہ اسے اپنے حال پر چھوڑ کر چلتا بنے۔

''ٹھیک ٹھیک بتاؤ، یہ ہمارے درمیان راز رہے گا، کیا تمھارا دل بھی ایسا ہی کھوکھا ہونے کو نہیں چاہتا؟''

''تیری ماں کی۔۔۔!''

''گرم کیوں ہوتے ہو؟ میں تو صرف مذاق کر رہا ہوں۔''

''جاؤ، جہاں جی چاہے، اور اگر بات بن جائے، تو آ کر مجھے بھی لے جانا۔ میں بھی بیزار ہو گیا ہوں۔ لیکن یہ کھوکھے دوکھے کا ہذیان بند کرو۔ جانتے ہو میری بیوی مجھے کیا کہتی ہے؟ 'الصندوق الخاوی،' خالی کھوکھا! صرف اس لیے کہ میں اتنا نہیں کما پاتا کہ اس کی ہر خواہش پوری کر سکوں۔ جانتے ہو مجھے کیا تنخواہ ملتی ہے؟ دو ہزار درہم۔ آٹھ سو کرائے کے دینے پڑتے ہیں، اور بقیہ پر ہماری گزراوقات ہوتی ہے، گزراوقات کیا ہوتی ہے، بس زندہ ہیں۔ سو تم میرا پیچھا چھوڑو اور اپنا راستہ ناپو!''

عازل آہستہ آہستہ چلنے لگا، دیوہیکل ٹرکوں کے گھڑگھڑاتے انجنوں سے خاص قسم کا مزہ لیتے ہوئے۔ وہ ان کے قریب آیا، ان سے نکلتی ہوئی ڈیزل کی بو یوں سونگھنے لگا جیسے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ سونگھ رہا ہو۔ ایک پہیے پر ہاتھ پھراتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ اسے کتنی دور لے جا سکتا ہوگا۔ مال لادتے ہوئے دو آدمیوں سے پوچھا کہ کیا لے جا رہے ہیں۔ ملبوسات، صرف ڈزائنروں والے: 'باس،' 'کلائن،' 'زارا،' اٹلی، اسپین کے بنے ہوئے ـــ مراکش کے سوا ہر جگہ کے!

اس نے خود کو وہ پتلا تصور کیا جس پر لباس کی نمائش کی جاتی ہے، ایسا ہی کوئی لباس پہنے ہوئے، انھی میں سے ایک کھوکھے کے اندر، پیرس یا میڈرڈ کی کسی دکان کی آرائشی کھڑکی کی سمت بھیجا جاتا ہوا۔ اس نے خود کو موم سے بنایا ہوا تصور کیا، مجسمے کے بھیس میں سرحد پار کرتا ہوا، ایک سانس لیتے ہوئے انسان کے بجائے ایک بے جان شے کی طرح۔ اس خیال پر اسے ہنسی آ گئی۔ خوف بھی آیا۔

Scanned with CamScanner

وہ آس پاس دیکھتا رہا، ٹرک کے نیچے جھانک کر دیکھا، اور اسے اس نوخیز لڑکے کا خیال آ گیا جو ایسی ہی جگہ دبک گیا تھا اور اسپین کی سرحد میں داخل ہو کر بھاگ گیا تھا، لیکن برا ہوا کہ چند شکاریوں کے ہاتھوں پکڑا گیا جنھوں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ یورپی ریڈیو اور ٹیلیوژن اسٹیشنوں نے اس کی واردات اس جنون کی مثال کے طور پر نشر کی تھی جو بعضے مراکشی نوجوانوں پر آ سوار ہوتا ہے۔ مغربی قونصل خانے کو اس بدقسمت مہم جو کو تحویل میں لینا پڑا تھا اور بعد میں اسے واپس گھر بھیج دیا گیا تھا، لیکن طنجہ پہنچتے ہی لڑکے نے دوبارہ یہی عمل دہرانے کی قسم کھائی تھی۔

دوسرے ٹرکوں پر زیادہ وزنی مال لادا جا رہا تھا۔ عازل کشتیوں کے پاس آیا جو عنقریب کوچ کرنے والی تھیں۔ ہر شے خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سپاہی ناشتہ کر رہے تھے؛ ان میں سے ایک اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ حال ہی میں اسپین نے اپنے ساحلوں کے سہارے سہارے نگہداشت کا برقی نظام نصب کیا ہے جس میں انفراریڈ اور الٹرا ساؤنڈ، اور الٹرا سب کچھ کے علاوہ آٹومیٹک اسلحہ بھی شامل ہے۔۔۔ اب اپنا ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے ہی غیر قانونی اجنبیوں کا سراغ لگ جائے گا! ان سارے لوازمات کے ذریعے اسپینی سپاہی اب اس قابل ہو گئے ہیں کہ مراکشیوں کے جبرالٹر کے تنگنائے کو عبور کرنے کا ادنیٰ سا ارادہ کرتے ہی اس کی پیش بینی کر لیں: محض اس قسم کا خیال آتے ہی اسپینیوں کو متعلقہ آدمی کی بابت تفصیلی معلومات فراہم ہو جائیں گی: اس کا نام، اس کا ماضی، غرض وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان لیں گے۔ ترقی اسے کہتے ہیں! اب ان مراکشیوں کو اپنی کھال میں رہنا ہوگا! لد گئے اسپین پہنچنے کے خواب، قانون اور ان تمام تکنیکی ایجادات کی بدولت۔ ذرا سا شبہ ہوتے ہی ساحلی پولیس چوکی کی روشنی چمک اٹھے گی اور برقی آلات مہاجرت کے متمنی کو تاڑ لیں گے اور اسے اپنا گھر چھوڑنے سے پہلے ہی لوٹا دیا جائے گا۔ مال سے لدے ٹرکوں کی چھان بین کی اب ضرورت نہیں ہوگی۔

کسی بچے کی طرح جو پہلی بار سمندر دیکھ رہا ہو، عازل جہازوں کی جسامت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اسے انجنوں کی آواز اور بحری عملے کی چیخ پکار سے عشق تھا۔ اس نے خود کو عرشے پر کپتان یا کمانڈر کی سفید وردی میں کھڑے ہوئے تصور کیا، وہ آنکھیں بند کر کے ان لمحات کا لطف اٹھا رہا ہے، اور بڑے دوٹوک حکم صادر کر رہا ہے۔ یہ صبح کے کوئی سات بجے کا عمل ہوگا۔ ایک کچیم شحیم دخانی جہاز گودی پر

Scanned with CamScanner

لگنے کو تھا، اور پر سکون پانی میں بہتے ہوئے اس بڑے سے تودے کے منظر نے اسے سحر زدہ کر دیا۔ جب اس نے ایک مسافر عورت کی طرف ہاتھ لہرایا جو حفاظتی جنگلے پر جھکی کھڑی تھی تو عورت نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا، لیکن عازل نے کوئی پروا نہ کی — تو کیا ہوا، بلا سے نہ کرے! اس لمحے، ٹھیک اس لمحے اگر اسے کوئی خواہش تھی تو یہ کہ وہ جہاز کے کسی کیبن میں ہو، جہاں چھپ جائے، جہاز کے دوبارہ روانہ ہونے کا انتظار کرے، تاکہ عرشے پر آ کر ایک آدھ سگریٹ پھونکے۔ وہاں وہ کسی جرمن سیاح سے گپیں مارے گا جو اپنی بیوی کے ساتھ شادی کی گولڈن جوبلی منانے کے لیے بحری سیر و سفر پر نکلا ہوا ہوگا۔ سمندری متلی محسوس کر کے عازل کوئی دوا پیے گا اور صاف ستھری چادر پر جا کر لیٹ جائے گا اور موجوں کی آواز سنے گا جو اسے کہیں بہت دور لے جا رہی ہوں گی — طنجہ اور افریقہ سے، بہت دور۔

کسی فلم کے خوابی منظر کی طرح مختلف تصورات عازل کے ذہن میں جمگھٹا لگانے لگے۔ اس نے خود کو سرتاپا سفید لباس پہنے دیکھا، اولگا کی رفاقت میں، جو آسٹریا کی اوپیرا سنگر تھی اور اپنے بھائی سے ملنے آئی تھی جو پہاڑوں میں گرمیاں گزارنے آیا ہوا تھا۔ بھائی کے سارے دوست ہم جنس پرست تھے، تاہم اسی کے گھر پر اولگا کی عازل سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے عازل کو دور سے تاڑ لیا تھا، اس کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ یہ عورتوں کا متوالا ہے — اور اس کی حس نے غلطی نہیں کی تھی۔ لیکن وہ موسیو دال کے گھر پر کیا کر رہا تھا؟ چونکہ مددگار کم پڑ گئے تھے، ہیڈ شیف نے اسے ہاتھ بٹانے بلایا تھا، گو حقیقت میں عازل مہمانوں کی خدمت نہیں، ان کا استقبال کر رہا تھا، ان کو ان کی نشستوں تک پہنچا رہا تھا۔ اولگا اس کی بانہہ پکڑ کر باغ کے دور افتادہ سرے پر لے آئی تھی۔ وہ بہت دیر تک خاموشی سے بوس و کنار کرتے رہے تھے۔ وہ بہت بے جھجک تھی، جو عازل کو گراں گزرتا تھا، لیکن وہ راضی برضا اس کا ساتھ دیتا رہا۔ پھر کسی نے اسے طلب کیا تھا۔ اس طرح وہ آسٹریائی حسینہ کے چنگل سے خلاصی پا کر شیف سے آملا۔

عازل نے سر اٹھا کر دخانی جہاز کو آہستہ آہستہ گودی کے کنارے سے قریب آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے جہاز پر چڑھنے اترنے کا کاٹھ کا تختہ لگانے میں بندرگاہ کے ملازمین کی مدد کی۔ جہاز سے باہر آتے ہوئے مسافر ہنس رہے تھے۔ عازل چاہتا تھا کہ جہاز پر چڑھے، اور وہاں کہیں کھسک جائے، اور جہاز ہی پر رہ جائے۔ لیکن یہ بڑا خطرناک ہوتا۔ اس نے دیکھا کہ جب ایک خاکستری رنگ کے بلّے نے سنتریوں کی نظر سے بچ کر جہاز پر جانے کی کوشش کی تو انھوں نے اسے لات مار کر

Scanned with CamScanner

بھگا دیا تھا۔ لیکن بلا مسلسل کوشش کرتا رہا۔ پولیس اور کسٹم کے افسران بلّے سے خوب واقف تھے، اور اس کی مراکش سے بھاگ نکلنے کی منہ زور خواہش پر تبصرے کیا کرتے تھے۔ بلّیاں تک بیزار ہو گئی تھیں: وہ بلا بھی زندگی سے کسی اور چیز کا خواہشمند تھا، اسے بھی نرمی اور گدازی کی ضرورت تھی، نازبرداری کی، ایسے گھر والوں کی جو اس سے لاڈ پیار کریں۔ بلا چلا جانا چاہتا تھا کیونکہ اسے وجدانی طور پر معلوم تھا کہ وہاں، دوسری طرف زندگی بدرجہا بہتر ہے، اور تمام دوسروں کی طرح اس کے بھی جنون تھے، کہ ہر روز ہٹ دھرمی سے وہاں پہنچ جاتا تھا کہ اپنی پوری کوشش کر کے کسی طرح یورپ جانے والے کسی جہاز پر چھلانگ لگا کر سوار ہو جائے۔ شاید وہ عیسائی بلا ہو جو اسپینیوں یا انگریزوں کی ملکیت رہا ہو، کیونکہ ان سے بڑھ کر کوئی اور جانوروں کا دفاع کرتا تھا نہ ان سے پیار۔ اور یہاں حال یہ ہے کہ کتے بلیوں کے ساتھ گھس بیٹھیوں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ہم انھیں بھگا دیتے ہیں، زدوکوب کرتے ہیں، تو پھر تعجب کیسا کہ یہ خاکستری بلا بھی یہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا ہے! ایک بار بلّے نے چھلانگ لگائی، نشانہ خطا گیا اور وہ پانی میں گر پڑا۔ ایک مچھیرے نے رحم کھا کر اسے بچا لیا۔

عازل نے اپنے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے وہاں سے چل پڑا۔ جب اس کی بلّے سے مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے اسے یوں سلام کیا جیسے وہ انسان ہو۔ ''اچھا، تو تم بھی کوچ کرنا چاہتے ہو، تمھیں بھی رخصت کا چھوت لگ گیا ہے، ہے نا؟ یہاں اپنے گھر جیسا نہیں لگتا، یہاں تمھارے ساتھ نازیبا سلوک کیا جاتا ہے، لاتیں ماری جاتی ہیں؟ تم کسی بورژوا گھرانے میں بہتر، زیادہ آرام دہ زندگی کا خواب دیکھتے ہو؟ . . . سنو، آس نہ ٹوٹنے دینا، کسی نہ کسی دن وہاں پہنچ ہی جاؤ گے۔''

بلّے نے بڑی توجہ سے سنا، میاؤں کی، اور غائب ہو گیا۔

بندرگاہ سے نکل کر عازل ایک سپاہی کے پاس ٹھہر گیا اور اسے اپنا تقریباً بھرا ہوا سگریٹوں کا پیکٹ دے دیا۔

''لو، یہ امریکی سگریٹ ہیں، بلیک مارکیٹ کے۔ پیو — اور نکوٹین کا زوردار دم لگاؤ جو ایک دن تمھارے پھیپھڑوں میں گھر کر لے گی۔ اچھا یار، پھر کبھی ملاقات ہو گی!''

وہ صیاغین اور گرانڈ سوکو کے راستے کار چلاتا ہوا شہر میں دوبارہ داخل ہوا۔ سڑکیں پراسرار خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ حسبِ معمول، ہر طرف غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے سوویں بار

Scanned with CamScanner

حیرت سے سوچا کہ یہ کیا بات ہے کہ مراکشی گھر میں تو حد درجہ صاف ستھرے رہتے ہیں لیکن گھر کے باہر اتنے ہی گندے، اور یاد کیا کہ ہائی اسکول 'الخطیب' میں اس کے تاریخ کے استاد نے اسے کیا تعلیم دی تھی، یہی کہ مراکش کا المیہ دیہی علاقوں سے شہروں میں لوگوں کی جوق در جوق مہاجرت ہے۔ شہروں میں سیلاب کی طرح بھر جانے والے دیہاتی اپنا دہقانی طرز زندگی اپنائے ہوئے ہیں، اور اپنا سارا کوڑا کرکٹ گھر کے سامنے ہی ڈال دیتے ہیں — مختصر یہ کہ اپنا انداز رتی بھر بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ اور یہ سب کس کا کیا دھرا ہے؟ آسمان کا۔ یہ خشک سالی ہے جو ہزاروں خاندانوں کو اپنی زمینیں چھوڑ کر شہر آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اُس صبح آوارہ بلیاں معمول سے کچھ زیادہ ہی تھیں۔ وہ چھین جھپٹ نہیں رہی تھیں، بلکہ ضیافت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ عازل کو ایک بھکاری نظر آیا جو کوڑے کرکٹ کا ڈبا کھدیڑ رہا تھا، اور اسے ندامت محسوس ہوئی۔ بھکاری بھاگ لیا۔

'گرانڈ سوکو' میں عازل ایک لڑکھڑاتے اسٹول پر آ بیٹھا اور فول کی پھلیوں کے ہریسے کا آڈر دیا۔ ''مجھے یہ پکوان بہت پسند ہے،'' اسے خیال آیا۔ ''یہیں کھا لینا چاہیے ورنہ خدا معلوم وہاں ملے نہ ملے۔'' وہ اتنا ہی خوش و خرم تھا جتنی بلیاں، اگرچہ کوڑے کے ڈبوں میں سر ڈالے ہوئے اس مخلوق کے منظر سے اسے متلی ہونے لگی۔

•

# 6
# میگیل

زخم خوردہ اور فٹ پاتھ پر پھینک دیے جانے کے باوجود عازل ابھی تک ہوش میں تھا۔ وہ دو آدمی جو اس کے اوپر کھڑے تھے، بس اس کا کام تمام کرنے ہی والے تھے۔ اس کے پیٹ اور پسلیوں میں سخت درد ہو رہا تھا، لیکن کہیں اپنی گہرائیوں میں وہ خود پر فخر کر رہا تھا: کم از کم اس میں ایک عفریت پر حملہ کرنے کی جرأت تو تھی، جو شاید شہر کا سب سے زیادہ طاقتور آدمی تھا۔ آج تک کسی کی یہ ہمت نہیں

Scanned with CamScanner

ہوئی تھی کہ اس کی حکم عدولی کرے اور منہ پر کہہ دے کہ سارے لوگ اسے کیا سمجھتے ہیں۔ عازل کو ایک طرح کی مسرت اور بشاشت محسوس ہو رہی تھی جس نے اسے اپنے زخموں اور چوٹوں کے باوجود توانائی بخشی۔ اسے یہ یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ رات اسی کی ہے، اور ٹھیک اس لمحے میں اسے وجدانی طور پر محسوس ہوا کہ اس کی زندگی ضرور بدلے گی۔

ٹھیک اس وقت جب عازل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور واپس پاؤں سے دبا کر اسے دوبارہ زمین پر ڈال دیا گیا تھا، میگیل لوپیز کی کار قریب آ کر رکی۔ دونوں آدمی جو اس پر حملہ آور ہوئے تھے، بھاگ کھڑے ہوئے۔ میگیل اور اس کا ڈرائیور عازل کو اٹھا کر کار میں لائے۔ پھر وہ جبل قدیم کی طرف ہو لیے، جہاں میگیل کی بڑی عالیشان کوٹھی تھی۔ یہاں سے پرانا شہر اور سمندر کا ایک ٹکڑا نظر آتا تھا۔

وہ خاصا طرحدار آدمی تھا اور لباس میں بڑے نفیس ذوق کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اسے پھول اتنے پسند تھے کہ ہر صبح کوئی گھنٹہ بھر گھر میں مختلف گلدانوں کو آراستہ کرنے میں صرف کرتا اور اس دن کے تازہ چنے ہوئے پھولوں اور ان کے رنگوں کے امتزاج سے اپنے موڈ اور مزاج کا اظہار کرتا تھا۔ وہ گرمیاں طنجہ میں گزارتا اور سال کا بقیہ حصہ بارسلونا میں یا ساری دنیا میں اپنی آرٹ گیلری کی نمائشوں کا انتظام کرنے گھومتا پھرتا۔ سخی آدمی تھا اور مراکش سے اسے خاص رغبت تھی کیونکہ اسے یہاں کی زندگی کی خوبی اور بے انتہا بوقلمونی پسند تھی۔ یہ اس کے لیے بالکل فطری بات تھی کہ ایک بچھڑے ہوئے آدمی کی مدد کرے، اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ بار میں بیٹھے ہوئے گاہک وہیں کے وہیں کیوں بیٹھے رہے اور کیوں ان غنڈوں کو اپنا کام جاری رکھنے دیا۔

میگیل بادشاہ کے عم زادوں میں سے ایک کا مقرب تھا اور آزادی سے محل میں آ جا سکتا تھا۔ اس نے میگیل کو بھی ان ممتاز لوگوں کی فہرست میں شامل کرا دیا تھا جو پروٹوکول کی رو سے کسی پوچھ تاچھ کے بغیر وہاں آ سکتے تھے۔ میگیل کو اس بات سے بڑا اہتزاز محسوس ہوتا تھا کہ وہ سال میں دو تین بار شاہ حسن دوم کے دربار میں حاضر ہوتا ہے، اسے مراکش کا دوست سمجھا جاتا ہے، ایک فنکار جس سے ملک کی بھلائی اور — اہم ترین یہ کہ — نکتہ چینی کے خلاف اس کی مدافعت کی توقع کی جاتی ہے۔

فی نفسہٖ میگیل ایک دنیا پرست آدمی تھا۔ اسے دعوتیں پسند تھیں جہاں وہ مشاہیر سے مل جل سکتا

Scanned with CamScanner

تھا۔ یہ باتیں اسے خوش کرتی تھیں اور، ایک طرح سے، اسے خود پر فخر بھی دلاتی تھیں۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے تھے، اور پھر سبک دلانہ خوش باشی اختیار کی تھی۔ مخملیں معاشرے کے معاملات اسے وہ ساری بہجت وشادمانی مہیا کر دیتے تھے جو اپنی غلطیوں، ناکامیوں اور دردِ دل کو بھول جانے کے لیے ضروری تھے۔

تو پھر میگیل نے یہ کیوں چاہا کہ عازل کو اس کی دنیا سے جدا کر کے اسپین اپنے گھر اٹھا لائے؟ شروع میں وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اندازہ تو اسے عازل کو چند مرتبہ دیکھنے کے بعد ہی ہوا کہ ایک وقتی یا بلکہ دیرپا، سنجیدہ عاشقانہ تعلق ممکن تھا۔ جب کبھی میگیل نے کسی آدمی کو زبردستی اپنے سے وابستہ کیا تھا، اسے بعد میں ہمیشہ پچھتانا پڑا تھا، لیکن خود کو اکیلا اور قابلِ افسوس سمجھنے میں اسے ایک عجیب کجروی لذت محسوس ہوتی۔ اسے مراکشی مَردوں کا انگھڑپن مرغوب تھا، جس سے مراد ان کا جنسی ابہام تھا۔ اسے ان کی جلد کی زیتونی تابش سے عشق تھا۔ اور اسے یہ بھی پسند تھا کہ وہ ہمہ وقت مہیا ہوتے ہیں، جس سے اس نابرابری کی نشاندہی ہوتی تھی جس میں ان کے تعلق کی بنا پڑی ہوتی، کیونکہ رات کو جو عاشق تھا وہی دن کو خدمت گذار بھی تھا، دن کو سودا سلف لانے کے لیے معمولی سے کپڑے پہنے، اور شام کو شہوت کو بھڑکانے والے بڑے دیدہ زیب لباس میں۔ اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے دربان نے جس میں ایک امریکی ادیب اور اس کی بیوی مقیم تھے، کیا خوب کہا تھا:

''یہ اس قسم کے لوگ ہیں جو ہر چیز چاہتے ہیں۔ عامی مرد و عورت، نوجوان، تندرست، اگر مضافات کے ہوں تو اور بھی اچھا، بالکل اَن پڑھ، جو سارا دن ان کی خدمت کریں، پھر رات کو ان کا بستر گرمائیں۔ ہاں، پوری پوری خدمت۔ اور دو جفتیوں کے درمیان، امریکی ادیب کے تخلیقی کام میں مدد پہنچانے کے لیے، کیف کی خوب کس کے بھری ہوئی چلم! وہ ان میں سے ایک سے کہتا ہے، مجھے اپنی زندگی کا قصہ سناؤ، میں اس پر ناول لکھوں گا، سرورق پر تمھارا نام بھی چھپے گا، تم پڑھ نہیں سکو گے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میری ہی طرح تم بھی ادیب ہو، بس اَن پڑھ ادیب، یعنی ایگزوٹک (exotic)، میرا مطلب ہے عجیب و غریب، میرے دوست! سو وہ ان سے یہ سب کہتا تو ہے، لیکن بھولے سے بھی دام دمڑی کا ذکر نہیں کرتا، کیونکہ ہم ایک ادیب کے خدمت گذار جو ہوئے، ظاہر ہے! ہم پیسے کیسے قبول کر سکتے ہیں، ایسا کہاں ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، خادم پیسے قبول کرنے پر مجبور نہیں، لیکن

میں جانتا ہوں کہ غربت —— ہماری عزیز —— ہم سے وہ سب کرواتی ہے جو ہم نہیں کرنا چاہتے۔ لشتم پشتم سہی، آدمی کو گزارہ تو بہر حال کرنا ہی ہے، یہی زندگی کا چلن ہے۔ باقی رہا میں، میں سب کچھ دیکھتا ہوں، لیکن سب کچھ کہتا نہیں! ہم سب الٹے لٹکے ہوئے ہیں، بالکل جیسے قصائی کی دکان پر: تم نے کبھی کسی بھیڑ کو اپنے برابر والی بھیڑ کے ٹموں سے لٹکے ہوئے دیکھا ہے؟ نہیں؟ بس یوں سمجھ لو جو مراکشی ان عیسائیوں کے ساتھ رہتے ہیں ان کا یہی حال ہے!''

اگلی صبح میگیل نے اس کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جس میں عازل کو سلایا گیا تھا۔ وہ اپنے مہمان کا نام جاننا چاہتا تھا؛ اس نے کیا کیا تھا، اب کس حال میں تھا، اور وہ اس بار میں کیوں گیا تھا؟ جب اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو میگیل دوبارہ دستک دے کر دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ عازل پیٹھ کے بل سویا ہوا تھا، اور کمبل سے جسم کا کچھ حصہ ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے آزاد تاثر اور زخم خوردہ جسم کے حسن و جمال کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ میگیل نے اسے سوتے رہنے دیا اور پنجوں کے بل کمرے کے باہر آ گیا۔ وہ کچھ مضطرب ہو گیا تھا۔ اس نے پینے کے لیے کچھ اور قہوہ انڈیلا، جو وہ اپنے عارضۂ قلب کے باعث شاذ و نادر ہی کرتا تھا۔ خود کو پرسکون کرنے کے لیے وہ ایک کمرے سے دوسرے میں چکراتا پھرا اور پھر باہر ٹیرس پر نکل آیا۔ اسے بڑا شدید احساس ہو رہا تھا کہ یہ نوجوان اس کی زندگی کو تہ و بالا کر ڈالے گا۔ اگرچہ وہ اس کی وضاحت کرنے سے قاصر تھا تاہم اسے وجدانی طور پر اس کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو بھی ہوا ہے اس کی بابت کسی سے اپنے جذبات کا ذکر کرے، لیکن میگیل نے مجبوراً اپنے ہیجان کو ٹھنڈا کرنے اور دوپہر۔ کے کھانے تک انتظار کرنے پر صبر کیا۔

یہ صورت حال ان یادوں کو واپس لے آئی تھی جنھیں دبا دینے کی کوشش وہ ایک مدت سے کر رہا تھا، اس وقت کی یادیں جب وہ اپنے والدین کے گھر سے بھاگ کر بارسلونا کی باروں میں کسی کو پھانسنے کے لیے جا پہنچتا تھا، کسی معاشقے کی آرزو میں جو اس کی اداسی اور تنہائی کا مداوا بن سکے۔ اس کی کیتھولک ماں اور اشتراکی باپ کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ بیٹا کجرووں کی صحبت میں وقت گزار رہا ہے۔ انھوں نے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، بمشکل کبھی اس سے بات چیت کرتے۔ ایک بار دو بدمستوں کے جھگڑے میں بیچ بچاؤ کراتے ہوئے خود اس کی اچھی خاصی ٹھکائی ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے

Scanned with CamScanner

اپنی اس حالت میں، کہ ایک آنکھ بری طرح سوجی ہوئی ہے، وہ گھر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے ماں باپ نے سوال جواب کر کے اس کا بھرکس نکال دیا ہوتا، اور ہو سکتا تھا کہ وہ پولیس سے ان لوگوں کی تفتیش کرنے کے لیے بھی کہتے جن سے ان کا بیٹا مل جل رہا تھا۔ جب میگیل پیشانی سے رستے ہوئے خون کو پونچھتے ہوئے زمین سے کھڑا ہو رہا تھا، ایک ہاتھ نے آگے بڑھ کر اسے ایک سفید رومال پیش کیا تھا، اور چند لمحوں تک اسے سوائے اس سفید کپڑے کے، جس سے بھینی بھینی سی خوشبو آ رہی تھی، کچھ اور نظر نہیں آیا تھا۔ نرم و نازک، لمبی لمبی انگلیوں والا وہ ہاتھ، جس پر جھائیاں پڑی ہوئی تھیں، ایک ادھیڑ عمر کے دراز قامت آدمی کا تھا جو سرمئی سوٹ اور فیلٹ ہیٹ پہنے ہوئے تھا اور سگار کے کش لگا رہا تھا۔ وہ آدمی مستحکم قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیا تھا، لیکن اس کی حرکات میں تصنع کا شائبہ سا دیکھ کر میگیل بغیر کچھ کہے سنے اس کے پیچھے ہو لیا تھا۔ میگیل کے لیے یہ ایک پیچیدہ اور دکھ بھرے عشق اور جنسی اختلاط کے قصے کی ابتدا تھی۔ وہ ماں باپ کا گھر ضرور چھوڑ آیا تھا لیکن اپنے صاحبِ ثروت و بااثر محسن کے فضل و کرم کا اسیر، بلکہ اس کا غلام بن گیا تھا۔

ہاتھ کی جنبش سے اس قصۂ پارینہ کو جھٹکتے ہوئے میگیل نے خود کو یقین دلایا کہ کمرے میں محوِ خواب نوجوان سے اسے اس قسم کا کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب عازل نمودار ہوا، خود کو وہاں پانے پر کچھ ہراساں اور نادم، اور اتنی دیر تک سوتے رہنے پر معذرت چاہی۔

''بیٹھو، تمھیں بھوک لگ رہی ہوگی۔''

''نہیں۔ بس اسپرین اور ایک گلاس پانی چاہیے۔''

''تمھارا کیا نام ہے؟''

''عزّالعرب، لیکن میرے دوست احباب مجھے عازل کہتے ہیں۔ یہ زیادہ آسان ہے۔''

''تمھارے نام کا کیا مطلب ہے؟''

''فخرِ عرب، عربوں کی عظمت! اس کا مطلب ہے کہ میں سب سے اعلیٰ ہوں، وہ جو بیش بہا، محبوب اور بھلا ہو . . .''

''ان تمام خوبیوں کا متحمل ہونا دشوار ہوگا، نہیں؟''

''میرے والد ناصر کے حامی اور عالمِ عرب میں دلچسپی لینے والے قوم پرست تھے۔ بدقسمتی

سے آج دنیائے عرب جس حال میں ہے اس پر صرف ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور، سرِ راہے، میں بھی اسی حال میں ہوں۔ اسی مناسبت سے، کل رات آپ نے میری خاطر جو کیا اس کے لیے ممنون ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ لو، کچھ کھاؤ۔''

عازل کو کچھ اور راحت محسوس ہوئی اور اس نے میگیل سے اس کے کام دھندے کے بارے میں پوچھا، اس کے سفروں کے بارے میں، اور یہ کہ وہ یہاں طنجہ میں کیا کر رہا ہے۔ دراصل وہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ کیا اس کا محسن اسپین کا ویزا دلوانے میں اس کی مدد کر سکتا ہے، لیکن اس کا ذکر نہیں کیا اور، ایک موقعے پر، اپنے میزبان کی مختصر غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے چپ چاپ کھسک لیا۔

اس پر میگیل کو خاصی کوفت ہوئی۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا وہ اس لڑکے سے واقف ہے، لیکن خالد نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''جاؤ، اسے ڈھونڈ کر واپس لے آؤ۔ اچھی طرح پیش آنا، کسی قسم کی زبردستی مت کرنا۔''

''سمجھ گیا، موسیو۔''

خالد کو برا لگا لیکن اس نے یہ بات اپنے مالک پر ظاہر نہیں ہونے دی، جو اب یوں پیش آ رہا تھا جیسے بالکل بھول گیا ہو کہ کبھی ان دونوں کے درمیان بڑا قریبی اور گرم خیز تعلق رہا تھا۔ کبھی کبھی میگیل چیزوں کو فراموش کر دینے کی حیرت انگیز صلاحیت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اپنی دل شکنی کو پی جانے پر مجبور ہو کر، اور جو کچھ بھی مل سکے اس پر اکتفا کرنے کی خاطر، خالد نے شادی کر لی تھی تا کہ یہ کہانی ختم ہو اور اسے قہوہ خانے میں اس کے رفیقوں کی افواہوں اور استہزا سے نجات ملے۔

بہر حال، یہ پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا تھا کہ میگیل نے اس سے کسی مدہوش نوجوان کو، جس کی مدد کرنا چاہتا ہو، واپس لانے کے لیے کہا تھا، اور عازل کو خبردار کرنے کو اس کا دل نہیں چاہا۔ اس نے عازل کو دیکھا ہی تھا کہ باروں میں اپنے قماش کے لوگوں کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔

اگلے دن عازل، خالد کی رفاقت میں، دوبارہ وِلا میں نمودار ہوا، ساتھ میں اس کی دوست سہام تھی۔ میگیل نے کوئی تبصرہ کیے بغیر دونوں کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ عازل نے سہام کا تعارف اپنی منگیتر کے طور پر کرایا، اور وہ بھی اس کھیل میں اس کا ساتھ دینے لگی۔ عازل جلد ہی گفتگو کو اس موضوع پر لے آیا جو اس پر بھوت کی طرح سوار تھا: ملک سے رخصت ہو۔ کہیں اور حیاتِ نو

Scanned with CamScanner

پائے۔ جس طرح بھی ممکن ہو یہاں سے کوچ کرے۔ اپنے پر پھیلائے، آزادی حاصل کر لینے پر چلاتا ہوا ریت پر دوڑ لگائے۔ کوئی کام کرے، کچھ تخلیق کرے، نتائج پیدا کرے، تصور کرے، اپنی زندگی کا کچھ بنائے۔

میگیل کو قائل کرنے کی عازل کو کوئی ضرورت نہیں تھی، جو بیٹھا سنتا رہا، اور ان تمام باتوں پر غور کرتا رہا جو لشتم پشتم اس کے دماغ سے گزر رہی تھیں۔ وہ تمام سوالات جو اس کے ذہن میں لڑھکتے پھر رہے تھے: کیا وہ عازل کی مدد کرنا چاہتا تھا یا اسے اپنے لیے محفوظ کر لینا؟ کیا تدبیر ہو کہ دونوں باتیں ایک ساتھ ہو جائیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ میگیل میں وہ توانائی باقی نہیں رہی تھی جو ماضی میں ہوا کرتی تھی، لیکن ایک بات کم از کم یقینی تھی: وہ اس لڑکے کو اپنا عاشق ضرور بنائے گا۔ ٹھیک ہے کہ میگیل کی رجھانے پر جانے کی صلاحیت ماند پڑ گئی تھی، لیکن وہ محبت کی جگہ رفاقت اور دوستی کا رشتہ قائم کرے گا۔ مگر عازل سے جنسی تعلق کا خیال آتے ہی اسے ایک سرخوشی سی محسوس ہوئی اور وہ اسے سرور کے ساتھ اپنے سامنے باتیں کرتے، حرکت کرتے، چلتے ہوئے، حتیٰ کہ اپنی منگیتر کی نمائش کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ یہ سوال کرنے کی جرأت سہام نے ہی کی:

"کیا آپ ویزا دلانے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں؟"

درخواست کی گستاخی پر برہم ہو کر عازل نے میگیل سے معذرت چاہی اور اضافہ کیا، "آپ جانتے ہی ہیں، ان دنوں زیادہ سے زیادہ نوجوان صرف مہاجرت کرنے کا خواب ہی دیکھ رہے ہیں، بس کسی طرح اس ملک سے نکل جانے کا۔"

"میں جانتا ہوں، اور یہ افسوسناک ہے،" میگیل نے جواب دیا۔ "مجھ سے مدد چاہنے والے تم پہلے شخص نہیں ہو۔ جب ملک ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ اس کے بہترین لوگ مہاجرت کرنے پر مجبور ہو جائیں تو یہ بڑی المناک بات ہے۔ میں یہ کوئی فیصلہ نہیں دے رہا ہوں، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اگرچہ میں خوب سمجھتا ہوں، میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ تمھاری سی عمر میں میں بھی یہی خواب دیکھتا تھا، گو میرے حالات مختلف تھے۔ اسپین میں رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔ فرانکو کسی طرح مر کر نہیں دیتا تھا، اور اس کی مذہبی اور فوجی حکومت نے سارے ملک میں فساد مچا رکھا تھا۔ بس اسے حیرت انگیز خوش قسمتی کہہ لو کہ مجھے فنونِ لطیفہ کے کالج میں داخلہ مل گیا اور میں بارسلونا چھوڑ کر نیو یارک چلا

آیا۔ اس طرح جان بچی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اندھیرے سے روشنی اور توانائی میں داخل ہو رہا ہوں۔ اس تنگ، ریاکارانہ وجود میں میرا دم گھٹا جا رہا تھا جہاں ہر چیز سے بوسیدگی کی باس آتی تھی، جیسے گرد ہر چیز، کپڑوں، بالوں، اور خاص طور پر روح سے غیر مرئی طور پر چمٹی ہوئی ہو۔ سارے اسپین سے پھپھوندی کی بو آ رہی تھی۔ لوگوں کا دم گھٹا جاتا تھا۔ صرف ساکر کے کھیلوں اور بل فائٹنگ کے موقعوں پر ملک میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔''

عازل جواب دیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی کے عالم میں لونگ روم میں چکر لگانے لگا۔

''چلو اٹھو،'' اس نے سہام سے کہا۔ ''ہم نے ان صاحب کا کافی وقت لے لیا ہے۔''

''مجھے میگیل کہہ کر پکارو۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میگیل۔ جلد پھر ملاقات ہو گی۔''

اس شام عازل اپنے دوستوں سے 'کیفے حافہ' میں ملا جو وہاں بیٹھے پتے کھیل رہے تھے۔ طریفہ کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں؛ انھیں دیکھنے کی تاب نہ پا کر اس نے عبدالملک سے جگہ بدل لینے کے لیے کہا، اور سمندر کے رخ پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔

''کیوں، اب ارضِ ممنوعہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہتے؟'' عبدالملک نے پوچھا۔

''افق کی طرف گھورنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اتنا قریب، لیکن پھر بھی اتنا دور . . .''

''توتیا یاد ہے؟''

''کیوں؟''

''بس اس لیے کہ وہ ہم پر آسیب کی طرح سوار تھی اور ہم اس کے ہاتھوں میں لگدی کی طرح تھے۔''

''نہیں۔ ہم اس بری طرح کیف کے نشے میں دھت ہوتے تھے کہ تصور میں اسے ایجاد کر رکھا تھا۔ توتیا کا کبھی وجود نہیں تھا۔''

''کسی نے تمھیں اسپینی کے گھر پر دیکھا تھا۔ ہوشیار رہنا، وہ مراکشی لونڈوں پر فریفتہ ہے،'' سعید نے کہا۔

''کیسی عجیب بات ہے، اس شہر میں کوئی چیز بھی کسی سے چھپی نہیں رہتی۔ اور کچھ نہیں تو اسی لیے میرا یہاں سے چلے جانے کو جی چاہتا ہے۔''

''تمھارے خیال میں وہاں پر سکون زندگی ملے گی؟'' احمد نے پوچھا۔

''کم از کم تم جیسے نکھٹوؤں کے چہرے تو نہیں دیکھنے پڑیں گے!''

''اگر تم اسپینی کو جھانسا دینے میں کامیاب ہو جاؤ، تو ہماری مدد کرو گے نا؟'' عبدالملک نے پوچھا۔

''میں کسی کو جھانسا نہیں دینا چاہتا۔''

''ارے جانے دو! تم اس کے ساتھ سوتے ہو— تمھارا کام فِٹ ہو گیا ہے!''

''میں تو کسی مرد کا چھونا تک برداشت نہیں کر سکتا۔''

''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا، میاں، تمھیں صرف اپنے ویزا کی فکر ہے۔''

''اچھا تو تم مرد کے ساتھ سو سکتے ہو، عورت کی طرح اسے چمٹا سہلا سکتے ہو اور چوما چاٹی کر سکتے ہو؟ اِستادہ ہو سکتے ہو اور انزال وغیرہ سب کچھ کر سکتے ہو؟''

''مجھے مردوں میں دلچسپی نہیں، لیکن جب مجبوری آ پڑے، تو ظاہر ہے آدمی مجبور ہوتا ہے: ایسے میں آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اپنی معشوقہ کا تصور کرتا ہے، یہ تخیل کا معاملہ ہے، اور پھر سوچتا ہے کہ اس سے کیا حاصل ہونے والا ہے، یہ بس عملی بات ہے، نہ کم نہ زیادہ۔''

''لیکن یہ تو تنگی ہوئی!''

''جو چاہو کہہ لو۔ میں ایسے بہت سوں کو جانتا ہوں جو گرمیوں میں یہی کرتے ہیں، اور بہت سے تو یہاں تک کہ اپنے زائل کے سامان میں چھپ چھپا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ ملک کے باہر قدم دھرتے ہی کسی عورت کے ساتھ فرار ہو جاتے ہیں، شادی کر کے وہاں کے شہری بن جاتے ہیں، وہی جس سے تم خوب واقف ہو: قرمزی رنگ کا حسین پاسپورٹ۔ بعد میں جب یہاں واپس آتے ہیں تو فتحمندی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے، دماغ دیکھو تو آسمان پر۔ بعض دوسرے جھریوں زدہ، ٹنوں میک اَپ چڑھائے یورپی یا امریکی بڈھیوں کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں جو تن تنہا، لیکن روپے پیسے سے لدی پھندی ہوتی ہیں... میں ایک ایسے آدمی سے واقف تھا، بلکہ یوں کہو یہ اس کا طرۂ امتیاز تھا۔

وہ 'کافے ڈپاری' (Café de Paris) میں اپنے شکار کی گھات لگانے جا بیٹھتا تھا۔ پتا ہے، بالآخر ایک کینیڈین سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گیا، جس نے اسے کینیڈا کی شہریت دلوادی، اور رُوکن کے طور پر اسے اپنی کل جائیداد کا وارث بھی بنا دیا؟ جب وہ طنجہ لوٹا تو اتنا مالدار تھا کہ پہچانا بھی نہیں جاتا تھا۔ بال دیکھو تو خضاب لگا ہوا ہے، لباس دیکھو تو ڈزائنروں کا بنایا ہوا، اور ہم سے بات کرتا تو مبتدیوں کی انگریزی میں۔ اپنے خیال میں ہم پر رعب جما رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس پر افسوس کرتے تھے۔ ایک دن ایک ٹرک نے اس کی بڑی خوشنما اور بالکل نئی مرسیڈیز کا بھرتا نکال دیا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ مر گیا!"

"تمھارا مطلب ہے کہ خدا نے اسے اپنے پاس بلالیا کیونکہ وہ راہ سے بھٹک گیا تھا؟"

"خدا کو اس میں نہ گھسیٹو۔ وہ مرا تو اس ملک کی سڑکوں کی وجہ سے جو دن رات لوگوں کا کام تمام کرتی رہتی ہیں، بس۔"

عازل نے اپنے پتے ڈال دیے، کیف کی چلم سلگائی، اور چند کش لگانے کے بعد عبدالملک کی طرف بڑھادی۔ اس کے دوست نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی۔ یہ سب وہ پہلے سے جانتا تھا۔ اچھا خاصا وقت ہو رہا تھا لیکن عازل کا جی ابھی گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ وِسکی اُگوگو میں ذرا کی ذرا ٹھہر گیا۔ وہاں نہ العافیہ نظر آیا نہ اس کے گرگے۔ بار میں چند پولیس کے سپاہی ضرور بیٹھے تھے۔ بیرا روبیو اس کی طرف جھک کر بولا:

"معاملات تیزی سے پلٹا کھا رہے ہیں۔ لگتا ہے وزیرِ داخلہ کو حکم ملا ہے کہ ملک کی صفائی کرے۔ بہت سوں کو پکڑ لیا گیا ہے۔ سنا ہے العافیہ اسپین یا جبرالٹر سٹک لیا ہے۔"

عازل نے یکے بعد دیگرے بقیہ گاہکوں پر نظر ڈالی اور محسوس ہوا کہ جلد ہی کچھ ضرور ہونے والا ہے۔ فضا میں خاموشی اور اضطراب کے آثار تھے۔ جگہ خاصی اجنبی سی لگ رہی تھی، پہلے سے بالکل بدلی ہوئی۔ بار پر نظر رکھی جا رہی تھی۔ عازل وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن حرکت نہ کر پایا۔

اس نے روبیو کو بلایا۔

Scanned with CamScanner

''آخر ہو کیا رہا ہے؟''

''بتایا تو، سیاسی بے چینی ہے: ریڈیو پر صفائی کرنے کی بات ہو رہی تھی۔''

''تمھارا مطلب ہے غلاظت ہٹانے کی؟''

''ہاں، ایسا ہی کچھ سمجھ لو۔ پہلے سب کو پکڑتے ہیں، بعد میں چھنٹائی کرتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ معاملہ اس آدمی کے قصے سے ملتا جلتا ہے جو سڑکوں پر بھاگا جا رہا ہے اور سب سے کہہ رہا ہے کہ وہ بھی بھاگیں، اور جب ایک آدمی پوچھتا ہے کہ کیوں، تو بھگوڑا کہتا ہے کیونکہ ہم خطرے میں ہیں: ایک جنونی بہت بڑی قینچی لیے گھوم رہا ہے اور ہر آدمی کے دو سے زائد خصیے کاٹتا پھر رہا ہے۔ سو دوسرا آدمی کہتا ہے کہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں، عین فطرت کے مطابق میرے دو ہی خصیے ہیں۔ اس پر پہلے والا کہتا ہے: وہ تو ٹھیک ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ کاٹتا پہلے ہے اور گنتا بعد میں ہے!''

''اس سنگین صورتِ حال میں بھی تمھیں مخول بازی سوجھ رہی ہے!''

''بھئی آدمی کو ہنستا ہنسانا چاہیے، دن میں کم از کم ایک بار۔ اچھا، ٹھیک ہے۔ چلو دوبارہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حلّوف قانون سے بھاگ نکلا ہے، حمادہ اور دیب حوالات کی ہوا کھا رہے ہیں، اور ان کے ساتھ بہت سے دوسرے لڑکے بھی جن بیچاروں نے کچھ نہیں کیا، لیکن ظاہر ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں تمھیں دوستانہ مشورہ دے رہا ہوں: یہاں سے اٹھو، گھر جاؤ، اور کچھ دن وہیں پڑے رہو، کیونکہ حالات پر سکون نظر نہیں آ رہے۔ یہاں مراکش میں اکثر یہی ہوتا رہتا ہے: برسوں تمھیں آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور پھر ایک دن دبوچ لینے کا فیصلہ کر ڈالتے ہیں، تاکہ تمھیں عبرت کی مثال بنائیں، سو تم یہ پکا کرو کہ تمھیں وہ مثال نہیں بننا ہے! تمھیں متوسط طبقے کے ان لڑکوں کا قصہ یاد ہے جنھیں بادشاہ نے منشیات استعمال کرنے کی پاداش میں دھر لیا تھا؟ نہیں، کیسے یاد ہوگا، تم اس وقت بہت چھوٹے تھے: اس نے بورژوا طبقے کے لڑکوں پر صرف اس لیے ہاتھ ڈالا تھا کہ وہ ڈال سکتا تھا، یہ دکھانا مقصود تھا کہ کوئی بھی محفوظ نہیں، ساتھ ساتھ منشیات کا دھندا کرنے والوں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا تھا۔''

ٹھیک جب عازل وہاں سے اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا، خفیہ پولیس کے سپاہی بار میں آ ٹپکے۔

''شناختی کارڈ، اپنے شناختی کارڈ نکالو — فٹافٹ!''

عازل کا کارڈ اس وقت ساتھ نہیں تھا۔ وہ فی الفور خود کو مجرم سا محسوس کرنے لگا۔

Scanned with CamScanner

''جن کے پاس نہیں ہے وہ وین میں داخل ہوں۔ چلو، جلدی کرو! پوری رات کا کام ابھی سامنے پڑا ہے۔ رباط سے حکم آیا ہے۔''

عازل فرمانبرداری سے جا کر پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے جیسے دوسرے بدقسمتوں کے ساتھ انتظار کرنے لگا: دو کوچہ گرد، ایک طوائف، پانچ نوجوان، جن میں سے دو کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ عازل کو یاد آیا کہ عبدالملک نے اسے تھوڑی سی کیف دی تھی، لیکن ٹھیک اسی وقت ایک سپاہی آیا اور چلّا کر اس سے بولا، ''خبردار جو حرکت کی، کتّے کی اولاد!''

سپاہی نے عازل کی تلاشی لے کر کیف برآمد کر لی۔ زیادہ نہیں تھی، لیکن اس کو حراست میں لینے کے جواز کے لیے کافی تھی اور ایک طول طویل جرح کے لیے جس سے پولیس کو اس کی اجازت مل جاتی تھی کہ اپنی چھان بین کو وسعت دے کر منشیات کا دھندا کرنے والوں سے آگے ان لڑکوں تک لے آئیں جو حکومت کے خلاف تھے، جن کے پاس کالج کی اسنادتھیں لیکن بے روزگار تھے۔ سب کچھ خلط ملط ہو رہا تھا۔ یہ ایک طویل، ظالمانہ، اور کٹھن رات ثابت ہوئی۔ عازل اپنی زندگی کا حال بتاتے بتاتے نڈھال ہو گیا: کہ وہ منشیات تو کیا، کسی چیز کا بھی دھندا نہیں کرتا تھا، کہ اس کا العافیہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، کہ وہ تو اس کی توہین کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ لیکن عبث: پولیس کو منشیات تقسیم کرنے والوں کو ڈھونڈ نکالنے کا حکم ملا تھا، اور عازل مثالی قربانی کا بکرا تھا۔ اگلی صبح سوال جواب کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا، اب اس میں دوسرے سپاہی بھی آ شامل ہوئے، جنھیں خاص طور پر رباط سے بھیجا گیا تھا۔ فضا بالکل بدل گئی تھی۔

''کس کے لیے کام کرتے ہو؟ کس نے کام پر رکھا ہے؟ تمھارا باس کون ہے؟''

عازل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے اس زور کا جھانپڑ مارا گیا کہ دماغ جھنجھنا اٹھا، پھر مضبوط ہاتھوں نے اسے دھکیل کر واپس کرسی پر ڈال دیا اور پیٹ میں گھونسا مارا۔

''حرامزادے، میں تیری مشکل آسان کیے دیتا ہوں،'' سپاہی نے کہا۔ ''بتا تیرا باس العافیہ، حلّوف اور دیب میں سے کون ہے؟ تو کس آدمی کو منشیات فراہم کرتا ہے؟ وہی مال جو راتوں کو یورپ بھیجا جاتا ہے؟ کر اعتراف! ان تینوں میں سے کون تیرا باس ہے؟''

زدوکوب پھر شروع ہو گئی، اس بار اور بھی درندگی سے۔

Scanned with CamScanner

''یہ بات گرہ میں رکھ لو، میاں لال بجھکو گریجویٹ صاحب: ہمارے بادشاہ نے — خدا انھیں سلامت رکھے اور ان کی عمر دراز کرے — تتہ ... تتنظ ... الغرض مغرب کے شمال سے ان تمام رنڈیوں کی اولاد کو صاف کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو ہمارے وطنِ عزیز کے نامِ نامی کو بٹا لگاتے ہیں۔ ہمارے بلند مرتبت ملک پر منشیات کے لین دین سے اپنی جیبیں بھرنے والے ان مجرّب خنزیروں کی وجہ سے عالمی صحافت میں جو کیچڑ اچھالی جارہی ہے اس سے عالی جاہ تنگ آگئے ہیں۔ بس اب اسے ختم سمجھو، عدم مداخلت کے دن لد گئے۔ سو تمھیں پولیس اور جلالت الملک — خدا انھیں سلامت رکھے اور ان کی عمر دراز کرے — کی مدد کرنی ہوگی اور اس غلاظت کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو بتانا ہوگا، یہ لوگ کہاں چھپے ہیں اور تم کس کے لیے کام کرتے ہو!''

سپاہی امریکی فلموں کے اداکاروں کی نقالی کر رہے تھے، چیونگ گم کی جگالی بھی کرتے جا رہے تھے، ساتھ ساتھ اس کی مزاج پرسی بھی، اور تصور کر رہے تھے کہ بڑی مردانگی دکھا رہے ہیں۔

تکلیف سے دوہرائے ہوئے عازل کو اچانک ایک خیال آیا۔

''میں موسیو میگیل کے لیے کام کرتا ہوں۔''

''یہ کوئی مراکشی نام نہیں ہے!''

''نہیں، وہ اسپین کا ہے، اس کا نام میگیل رومیرو لوپیز ہے۔''

''ہمیں اوروں سے سروکار نہیں۔ بس ہمیں تو منشیات کے کاروبار میں ملوث مراکشی چاہیے، کوئی بھی مراکشی۔ یہ تمھارا میگیل، یہ کیا کام کرتا ہے؟''

''اس کا منشیات وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ آرٹ کی چیزوں کی تجارت کرتا ہے، اسپین میں اس کی آرٹ گیلری ہے۔ جبل قدیم میں رہتا ہے، اور میں وہاں اس کے معاون، سمجھو سیکرٹری کے طور پر کام کرتا ہوں۔''

پسلیوں پر چند مکے اور پڑے اور عازل کرسی سے گر گیا۔ سپاہیوں میں سے ایک نے کہیں ٹیلیفون کیا اور خفیہ اشاراتی زبان میں بات کی۔ جب عازل نے میگیل کا نام چند بار سنا تو اندازہ ہو گیا کہ پولیس والے اس کے بیان کی چھان بین کر رہے ہیں۔ پھر رباط سے آنے والے دو سپاہیوں نے اس سے دوبارہ دھینگا مشتی کی اور جی بھر کے اس کی ماں بہن کی۔ وہ اس بات پر طیش میں تھے کہ ابھی

Scanned with CamScanner

ابھی پتا چلا تھا کہ بالآخر عازل منشیات کی ہیر پھیر میں ملوث نہیں ہے، سو اب یہ مصیبت آ پڑی تھی کہ فجر سے پہلے پہلے انھیں کم از کم ایک بندہ ضرور ڈھونڈ نکالنا تھا۔ عازل کو فرش پر پڑا چھوڑ کر وہ باہر سگریٹ پینے چلے گئے۔ بس اب دو مقامی سپاہیوں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔

"بڑے رس بھرے لونڈے نظر آتے ہو۔ یہ بتاؤ، زامل، وہ مارتا ہے یا تم مارتے ہو؟ جانے کب سے یہ جاننے کی خواہش ہے کہ ان کجروؤں میں کون فاعل ہوتا ہے اور کون مفعول۔ بہر حال، ہم اپنی مقعدوں پر آنچ نہیں آنے دیتے، جفتی خود ہم کرتے ہیں اور تمھیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ تم جیسے لونڈوں کے ساتھ کیا کارروائی کی جاتی ہے۔"

انھوں نے دروازے کو کنڈی چڑھائی اور باری باری عازل کو زدوکوب کرنے لگے۔ پھر ایک نے اسے فرش پر دبائے رکھا اور دوسرا اپنی پتلون اتارنے لگا۔ پھر اس نے عازل کا زیر جامہ کھسوٹ کر الگ کیا، اس کی ٹانگیں پھیلائیں، اس کے کولھوں کے بیچ تھوکا، اور اس میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ اس کا کام آسان کرنے کے لیے ساتھی نے عازل کو ایسی ضرب لگائی کہ اس کے ہوش کوچ کر گئے۔ اس پر کچھ اور تھوکا، پھر جھاڑو کے دستے جیسا ڈنڈا اس کی مقعد میں گھسیڑ دیا، جس سے اسے اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ حواس جاتے رہے۔ دونوں اسے مارتے رہے، اس پر تھوکتے رہے اور باری باری اس میں داخل ہوتے رہے۔

"زامل، یہ لے! ہیجڑے۔ مجہول۔ تیری مقعد بڑی لاجواب ہے — ایک عبقری کی مقعد کسی کھلی ہوئی ضخیم کتاب جیسی ہوتی ہے، لیکن ہم پڑھتے کب ہیں، ہم تو سواری کرتے ہیں، لے، اور لے! کتے، قحبہ، ہاں، یہی تو تُو اس عیسائی کے ساتھ کرتا ہے، وہ پیٹ کے بل پڑ جاتا ہے اور تو اس میں ٹھونس دیتا ہے، اور اب ہم تجھ میں ٹھونس رہے ہیں اور تجھے مزہ آئے گا، تو اور زیادہ کے لیے منت کرے گا، یہاں تک کہ مقعد چھلنی بن جائے گی، سچ مچ ریل گاڑی کا اڈا، لے، اور لے، خبیث عبقری، تو رو رہا ہے، کسی لڑکی کی طرح ٹسوے بہا رہا ہے، بتا، ہمیں بتا کہ لذت کے مارے رو رہا ہے، اوہ، دین امک، چدکڑ طوائف، تیری مقعد ایک لونڈیا جیسی ہے، ایک بال تک نہیں، تو بنا ہی ایک پوری ریل گاڑی کھینچنے کے لیے ہے..."

Scanned with CamScanner

فرش خون، قے، اور پیشاب کے چھینٹوں سے آلودہ ہو گیا تھا۔ عازل نیم بیہوش تھا اور کھڑا نہ ہو سکا۔ چند گھنٹوں کے بعد جب آنکھیں کھولیں تو میگیل کو تھوڑا بہت پہچان گیا، جو اسے وہاں لینے آیا تھا۔ سپاہیوں نے وضاحتاً بتایا کہ ٹھیک جب چند غنڈے 'شارع موریلو' کے ایک ہوٹل کے کمرے میں زبردستی اس کا ریپ کرنے ہی والے تھے کہ انھوں نے اسے آ کر بچالیا تھا۔

''کیف کے معاملے میں کوئی جھگڑا تھا؛ ہم نے اس لیے مداخلت کی کیونکہ ہوٹل کے دربان نے ہمیں اطلاع کر کے بلالیا تھا۔ خوش قسمتی سے ہم عین وقت پر پہنچ گئے۔ فرش پر پڑا ہوا تھا، پتلون نیچے کھسکی ہوئی تھی... اس شہر میں آدمی کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ کس کے ساتھ میل جول رکھے!''

عازل کا چہرہ بہت بری طرح سوجا ہوا تھا، اور مشکل سے چل پا رہا تھا، میگیل کا ڈرائیور سہارا دیے ہوئے تھا۔

''مجھے اندازہ ہے کیا ماجرا ہوا ہوگا،'' میگیل نے گھر پہنچنے پر کہا۔ ''میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔''

''نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھے ندامت ہو رہی ہے، سخت ندامت!''

''سنو: یہ بہت ضروری ہے کہ ہم میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کریں اور ان لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کریں۔ رباط میں میرے کئی بڑے عمدہ روابط ہیں۔ جو انھوں نے کیا ہے ناقابلِ برداشت ہے — بادشاہ نے انھیں کھلی چھٹی نہیں دے رکھی!''

''لیکن میرا قول ایک پولیس والے کے قول کے سامنے بے قیمت ہے! بادشاہ کو بھلا کیا پروا — وہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ حالات بدستور رہیں، اسے جزئیات سے غرض نہیں۔''

''یہ سب مراکش کی شہرت کے لیے بہت برا ہے! اگر پریس کو پتا چل جائے تو بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی!''

''پریس؟ اگر کسی دن اخبار حقیقتِ حال بیان کر دیں تو انھیں بند کر دیا جائے۔''

شفایابی کی خاطر عازل چند دنوں تک میگیل کے یہاں پڑا رہا۔ اس نے فون کر کے ماں کو اطمینان دلایا۔ بولا کہ دار البیضا میں ایک ملازمت کی پیشکش کے سلسلے میں آیا ہوا ہے۔ جب کنزہ ملنے آئی تو بہن کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور منت کی کہ کسی اور کو ہوا نہ لگنے دے۔ عازل جتنی ہی تحقیر محسوس کرتے

Scanned with CamScanner

ہوے اس نے وعدہ کیا کہ طنجہ سے باہر نکلنے میں وہ اس کی مقدور بھر کوشش کرے گی۔

صفائی کی مہم اپنے شکاروں کا کچومر نکالے دے رہی تھی۔ منشیات کا دھندا کرنے والے چند لوگ پکڑے گئے؛ دوسرے کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلے۔ بینکوں کے وہ ملازم جو کالے دھن کو سفید کرنے میں ملوث تھے انھیں جیل ہوگئی، اور کسٹم کے ان افسروں کو بھی جنھوں نے جو ہو رہا تھا اس سے چشم پوشی کر رکھی تھی۔ ضمنی نقصان کی لپیٹ میں چند معصوم بھی آگئے جن پر ملکی امن کے لیے خطرناک ہونے کا الزام لگایا گیا۔ وزیر داخلہ نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر ان دردسر، بے روزگار دانشوروں کو بھی مختلف الزاموں کے تحت پکڑ کر جیل بھجوا دیا۔ صحافت بھی اس کھیل میں ساتھ دیتی رہی، مہم کی پیشرفت کی خبریں چھاپتی رہی۔ مقدمے بڑی برق رفتاری سے طے ہوتے رہے اور سارا ملک دم مارے بیٹھا رہا۔ تاجروں نے سنگین اقتصادی بحران کی پیشگوئی کی، اور نجی گفتگو میں صراحتاً کہا کہ اگر ملک چل رہا ہے تو جزوی طور پر اسی گندے پیسے کے طفیل، اور اب غیر قانونی لین دین کرنے والے اپنی ساری جمع پونجی غیر ملکی بینکوں میں سینت کر رکھیں گے، اور کوئی بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ ایک سیاستداں نے یہ استدلال کیا کہ بے گناہوں پر فردِ جرم لگانا اس لیے کارآمد ہے کہ اس سے شک وشبہ اور خوف و ہراس پھیلے گا اور یوں مخالفت پر بالواسطہ ضرب لگے گی۔ تقریر کے اختتام پر جب ارکان نے سوال کیا تو وزیر نے اپنے عمل کو اس طرح حق بجانب ثابت کیا۔

''ملک کرپشن اور منشیات کی تجارت کی وبا سے پامال ہو گیا ہے؛ ان داداگیروں کو شکار کرنے سے زیادہ معقول اور کیا کام ہو سکتا ہے؟ ہمیں ملک کی صفائی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ہم یہی کر رہے ہیں، بالکل فطری بات ہے۔ عدالت اپنا فرض بطریق احسن انجام دے رہی ہے، بعض منصفوں نے ایسے لوگوں پر حملہ کرنے کی جرأت کی جو سمجھتے تھے کہ وہ قانون سے بالاتر ہیں کیونکہ وہ حکومت کے اس یا اُس رکن سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ سب ختم شد: کوئی مصالحت نہیں کی جائے گی۔ سر کٹتے ہیں تو کٹا کریں، اور مجھے تو یقین نہیں کہ لوگوں کے یہ ممتاز نمائندے اس پر احتجاج کریں گے۔ ہماری عدالت ایک خودمختار ادارہ ہے، ہماری پولیس مستحکم ہے، اور جس راہِ ترقی کی داغ بیل ہمارے محبوب جلالت الملک نے — خدا انھیں سلامت رکھے اور لمبی عمر عطا کرے — ڈالی ہے اس پر ہمیں اس پیشرفت کی خوشی منانی چاہیے۔''

Scanned with CamScanner

ایک عمر رسیدہ نائب، جس کا بہت احترام کیا جاتا تھا، وزیر سے تخاطب کرنے کھڑا ہوا۔
''وزیر صاحب، ہمیں اس سے اتفاق ہے، لیکن ان سے ابتدا کیوں نہ کی جائے جو آپ سے قریب ہیں، یعنی خود آپ کے رشتے دار؟ سب جانتے ہیں کہ آپ کے صاحبزادے نے بعض بڑے نفع بخش کاروباری سودے کیے ہیں، ان دروازوں کی بدولت جو آپ نے ان کے لیے کھول دیے تھے۔ اگر آپ واقعی اپنی بات منوانا چاہتے ہیں تو خود اچھی مثال قائم کریں۔ لیکن صورت یہ ہے، جناب وزیر، کہ آپ دوسروں کو اس طرح وعظ فرماتے ہیں جیسے آپ خود جملہ ملامتوں سے پاک ہیں۔ چونکہ جلالت الملک نے ملک کی صفائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے، بہتر ہوگا کہ یہ مکمل صفائی ہو: اپنے آس پاس کی صفائی کیجیے اور موقعے سے فائدہ اٹھا کر انھیں جیل کی سیر نہ کرایئے جو آپ کی استحصالی سیاست کے مخالف ہیں۔''
''آپ اس باعزت مجلس کے بزرگ رکن ہیں، اور میں آپ کے بے بنیاد اتہامات کا جواب دینے سے پرہیز کروں گا۔''
اس قصے کو نمٹانے کے لیے مجلس کے صدر نے گھنٹے بھر کے وقفے کا فیصلہ کیا۔
عازل کی حالت بحال ہونے میں دو ہفتے لگے۔ راتوں کا چین جاتا رہا تھا اور اسے خواب آور گولیاں لینی پڑ رہی تھیں، تاہم اس کے خواب سفاکی اور تشدد کے منظروں سے بھرے ہوئے تھے۔ اگرچہ میگیل نے اس سے پولیس کے خلاف شکایت نامہ داخل کرنے کے لیے بار بار کہا، لیکن عازل نے انکار کر دیا۔

# 7

## للّا زُہرہ

عازل کی ماں، للّا زہرہ، کو فکر کھائے جا رہی تھی۔ جب سے بیٹے نے رات کو دیر سے لوٹنا شروع کیا تھا، وہ اس کے انتظار میں جگتی رہتی۔ لونگ روم میں ٹیلیوژن کے سامنے جا بیٹھتی اور اس کی راہ تکتی رہتی۔ بیٹی کنزہ کہتی کہ یہ فضول حرکت ہے، لیکن وہ اپنی من مانی کرتی اور یہ ماننے سے انکار کر دیتی کہ

Scanned with CamScanner

بیٹا شہر کی باروں اور قہوہ خانوں میں ڈیرہ جمائے بیٹھا ہے۔ تمام ماؤں کی طرح اسے بھی کسی بات کا اندیشہ تھا۔ اسے لگتا کہ کنزہ حقیقت کی پردہ پوشی کر رہی ہے، اور یہ خوف دامنگیر رہتا کہ کہیں عازل دوبارہ تنگنائے کے پار جانے کے جتن نہ کر رہا ہو۔

''میں جانتی ہوں کہ میرا بیٹا ایک جگہ کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اسے کسی عورت کا سہارا، حتیٰ کہ اپنی بہن کا سہارا بھی گوارا نہیں۔ خوددار ہے، اور مجھے معلوم ہے کہ وہ وہاں، اسپین، جانے کے لیے سب کچھ کر رہا ہے۔ خدا اس کی حفاظت کرے، خدا اسے ابلیس کے وسوسوں پر غالب آنے کی طاقت عطا کرے، اور گناہوں اور خطاؤں سے دور رہنے کی توفیق دے! لیکن وہ فون کیوں نہیں کرتا، یہ خاموشی کس لیے؟ کہیں بیمار نہ ہو؟ ہسپتال میں تو نہیں؟ خدا نہ کرے ایسا ہو... ہمارے ہسپتالوں کا جو حال ہے اسے دیکھتے ہوئے دعا مانگنی چاہیے کہ کوئی صالح آدمی ان میں قدم رکھنے پر مجبور نہ ہو۔''

وہ شاون نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی تھی جہاں روایات کی پاسداری ابھی تک کی جاتی تھی، جہاں جدید زندگی نے جملہ اشیا کو تہہ و بالا نہیں کر ڈالا تھا۔ وہ لکھنے پڑھنے سے نابلد تھی، لیکن ہر رات ٹیلیوژن پر خبریں ضرور دیکھتی تھی۔ اس نے گنتی کے ہندسے سیکھ لیے تھے تاکہ فون کر سکے۔

عازل کو اپنا باپ مبہم سا یاد تھا۔ جب عازل ابھی چھوٹا سا تھا کہ وہ ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ چونکہ سیمنٹ فیکٹری میں ملازم تھا، بیمہ کمپنی کی طرف سے اس کے گھر والوں کو کچھ رقم مل گئی تھی۔ ہر سال کچھ مدد حکومت کی طرف سے بھی چند میٹھی روٹیوں، تیل کے ڈبوں، اور آٹے کے ایک تھیلے کی شکل میں مل جاتی تھی۔ جس نیلے کاغذ میں شکر لپٹی ہوتی وہ عازل کو اتنا پسند تھا کہ اس نے اسے اپنے کمرے کی دیواروں پر چپکا دیا تھا۔ ماں نے نوکری ڈھونڈ لی تھی۔ اپنے علاقے اور نسل کی بہت سی دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی اسمگلنگ میں ملوث تھی: سو وہ 'براغدیا' (bragdia) بن گئی تھی، جیسے دوسری عورتیں درزن کا پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ جنوب کے باشندے اسمگلروں کو 'کونترابوندو' (contrabondo) کہتے تھے اور شمال والے 'براغد' (bragued)۔ وہ رات کی بس سے سبتہ جاتی اور صبح کے پانچ بجے تک سرحد کھلنے کا انتظار کرتی، اور کھلتے ہی سینکڑوں دوسری عورتوں کے ساتھ مسقف تھوک بازار میں داخل ہوتی۔ وہاں ایسی اشیا خریدتی جنھیں بہ آسانی دوبارہ بیچ سکے: ولندیزی پنیر، اسپینی جام، پاستا، امریکی چاول، شیمپو، دانت مانجھنے کے برش —— غرض، ہر وہ

Scanned with CamScanner

شے جسے اپنے لباس میں چھپا سکے۔ منٹوں میں یہ چھپکلی سی عورت پھول کر کپا ہو جاتی اور ہاتھ میں بچوں کے لیے اچھی اچھی چیزوں کی چنگیری تھامے واپس سرحد پار کرتی۔ کم از کم کسٹم کے گماشتے سے تو وہ یہی کہتی اور اس کی خاموشی کے عوض پچاس درہم کا نوٹ چپکے سے اس کی ہتھیلی میں دبا دیتی۔ اسپینی پیسیتا اور مغربی درہم کی شرحِ مبادلہ کا فرق اس کی آمدنی تھی: دوسرے لفظوں میں، تقریباً نہ ہونے کے برابر۔

سبتہ میں داخل ہونے کے لیے — جو ایک مراکشی شہر تھا جس پر اسپینی پانچ سو سال سے قبضہ کیے بیٹھے تھے — مقامیوں کو نہ پاسپورٹ کی حاجت تھی نہ ویزا کی، صرف شناختی کارڈ کافی تھا۔ للاّ زہرہ نے اپنے کارڈ کو پلاسٹک میں ملفوف کرا لیا تھا تاکہ محفوظ رہے۔ وہ اسے ہمہ وقت ساتھ رکھتی۔

''ہم اس کی بدولت کھا پی سکتے ہیں،'' وہ بیٹی سے کہا کرتی۔

شروع شروع میں اسے اسمگلنگ میں مزہ آتا تھا۔ لپکتے جھپکتے بازار کا چکر لگانا اور سب سے پہلے واپس آنا، جلدی جلدی مال بیچنا، اور گھر لوٹنا۔ ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ دو بچوں کی ماں تھی۔ بچوں کو وہ ایک ہمسائی کی نگرانی میں چھوڑ جاتی جو اولاد سے محروم ایک راست باز عورت تھی۔ وقت اور اضمحلال کے ساتھ ساتھ بازار کی اس بھاگ دوڑ سے للاّ زہرہ کا اولین جوش و خروش آہستہ آہستہ ماند پڑ گیا۔ اب وہ دیر دیر سے سبتہ جانے لگی تھی، بعض اوقات دوسروں کی خریدی ہوئی چیزوں کو دوبارہ بیچنے پر قناعت کرتی۔

عازل کے تعلق سے للاّ زہرہ نے بڑے بڑے خواب دیکھ رکھے تھے۔ کبھی تصور میں اسے ڈاکٹر کے روپ میں دیکھتی، کبھی کسی بلند مرتبہ افسر کے، اور کسی اچھے گھرانے کی لڑکی سے اس کی شادی کرنے کی تمنا کرتی۔ رہی کنزہ، جس کی تعلیم بھائی سے کم تھی، تو وہ ملازمت کرتی اور اچھے دنوں کا انتظار۔ کنزہ کا مرغوب مشغلہ رقص تھا، خاص طور پر شرقِ اوسط کے نغموں پر، جن سے اسے عشق تھا۔ اسے واقعی خداداد صلاحیت ملی تھی اور خاندان کی ہر تقریب میں اس سے گانے اور رقص کی فرمائش کی جاتی۔ ایسے موقعوں پر وہ خود کو بے روک ٹوک بہہ جانے دیتی، خوب لہک لہک کر ناچتی اور اپنے پرکشش جسم کی نمائش کرتی۔ کبھی کبھی وہ پڑوسیوں کے لیے بھی رقص کرنے پر راضی ہو جاتی، جو بعد میں اسے برائے نام سا نذرانہ بھی پیش کر دیتے۔ ماں اس کے ساتھ آتی اور اس پر نظر رکھتی۔ اگر کنزہ چاہتی تو پیشہ ور رقاصہ بن سکتی تھی، لیکن اس معاشرے میں اگر کوئی لڑکی روزی کمانے کے لیے رقص

Scanned with CamScanner

کرے تو لامحالہ اس کی عفت پر شک کیا جانے لگتا ہے۔ بس ایسا ہی چلن ہے۔ یوں دیکھنے میں تو للاّ زہرہ اپنی بیٹی کے بارے میں فکر مند لگتی تھی، جسے ابھی تک خاوند نہیں ملا تھا، لیکن حقیقت میں وہ بیٹے کے مستقبل کے بارے میں دیوانگی کی حد تک متفکر تھی، جسے لاڈ پیار سے بگاڑنے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ لیکن ماں کی مالکانہ، غلبہ آور محبت سے عازل کو روز بروز اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔

❁

جب وہ میگیل کے یہاں قیام کے بعد گھر لوٹا تو للاّ زہرہ اسے اس قدر زرد اور دبلا دیکھ کر واویلا کرنے لگی۔

''کس نے تیرا یہ حال کیا ہے؟ کیا ہوا؟ آخر معاملہ مجھ سے کیوں مخفی رکھا گیا؟ ہائے، میرے اللہ، میں جانتی تھی، مجھے برا خواب آیا تھا لیکن میں نے اس پر یقین کرنے سے انکار کر دیا — میرا ایک دانت کھو گیا تھا، اور وہ اسے کسی کڑوے گوند سے دوبارہ جما رہے تھے۔ اچھا تو وہ اسی کی پیشگوئی تھی: میرا بیٹا قریب قریب ہلاک ہو گیا! تم سمندر پار تو نہیں گئے تھے؟ تنگنائے تو نہیں عبور کیا تھا؟ مجھے بتاؤ، بتاؤ کیا ہوا تھا...''

عازل کے پیچھے پیچھے خالد کھانے پینے کی چیزوں سے بھرے بڑے بڑے ٹوکرے اٹھائے داخل ہوا جو میگیل نے بھیجے تھے: موسمی پھل اور ترکاریاں، آدھی بھیڑ، اور کئی بڑی دریائی مچھلیاں۔ خالد وہاں سے ہٹ گیا اور اب اس کا مالک نمودار ہوا، خاص درزی کا سلا ہوا شاندار سفید غندورہ زیب تن کیے ہوئے اور پیروں میں اس سے ملتے جلتے رنگ کی بابوجین ڈالے ہوئے۔ میگیل نے للاّ زہرہ کو پھولوں کا بے حد دیدہ زیب گلدستہ پیش کیا۔

لمحہ بھر یہ خیال کر کے کہ ملاقاتی کنزہ سے شادی کرنے کی درخواست کرنے آیا ہے، للاّ زہرہ نے بیٹی کو بلایا، جو میگیل کا بڑھا ہوا ہاتھ ملانے اور اپنی ممنونیت کا اظہار کرنے شرماتی لجاتی وہاں پہنچی۔

''عازل نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ آپ نے اس کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کا شکریہ!''

''اس میں شکریہ کیسا؟ یہ تو بالکل قدرتی تھا۔ اپنی والدہ سے کہیں کہ مجھے ان سے مل کر بے حد

مسرت ہوئی ہے۔ عازل دوست ہے، اور میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

للاّ زہرہ چکرا گئی۔ یہ آدمی کون تھا، اتنا آراستہ جتنی کوئی عورت ہو، اور اُسی کی طرح خوشبوؤں میں بسا ہوا؟ اور اتنا حسین بھی! یہ کیا چاہتا ہے؟

عازل نے ماں سے کہا کہ ان کے لیے اچھا سا کھانا تیار کرے، لیکن للاّ زہرہ نے معذرت کی اور کہا، وقت اتنا کم ہے کہ کھانے کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا، اور میگیل سے اصرار کے ساتھ کہا کہ وہ اگلے روز ان کے یہاں دعوت پر آئے۔

میگیل کے رخصت ہونے کے بعد بھی ایک لطیف سی مہک عازل کے چھوٹے سے گھر میں دیر تک منڈلاتی رہی۔ للاّ زہرہ سمجھ گئی تھی لیکن پھر بھی اپنے کو یہی یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ کنزہ سے شادی کرنے کی نیت سے وہاں آیا تھا۔

''کیوں بیٹی، تمھارے لیے کچھ زیادہ عمر کا نہیں ہے؟''

''ہاں، لیکن اس سے کیا؟ رحمدل اور شائستہ آدمی تو ہے۔ کم مسلمان اس عیسائی جتنے سخی اور مہذب ہوتے ہیں۔''

''بڑی احمقانہ بات کہہ رہی ہو،'' عازل نے بے ٹوک کہا۔ ''یہ مسلمان یا عیسائی ہونے کا معاملہ نہیں ہے۔ بہرحال، ہم دوسروں کی ہتک کرنے اور اپنی جماعت میں کیڑے نکالنے کے استاد ہیں۔ عرب اس پر متفق ہیں کہ کسی چیز پر ان کا اتفاق نہیں ہوگا، سب جانتے ہیں۔ سو ہمیں چاہیے کہ ان پامال فقروں کو دریا برد کریں۔''

''میں تو صرف یہی کہہ رہی تھی کہ یہ شخص مجھے پسند ہے،'' کنزہ نے احتجاج کیا، ''لیکن جیسا کہ تمھیں معلوم ہے، میں وہ نہیں جس میں اسے دلچسپی ہے!''

یوں بن کر جیسے آخری جملہ سنا ہی نہ ہو، للاّ زہرہ نے کنزہ سے کہا کہ ایک سفید میز پوش 'فندق الشجرۃ' سے خرید لائے، وہ بازار جہاں وہ اسمگلنگ کا مال بیچنے جایا کرتی تھی۔

''بچو، کل کی دعوت کو ہر لحاظ سے بالکل پر تکلف ہونا چاہیے۔ اور اب، عز العرب، تم سب کچھ مجھے بتاؤ۔''

عازل نے ہنستے ہوئے ماں کو سینے سے لگا لیا۔ ماں کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں، اور خود اس کی بھی۔

Scanned with CamScanner

اگلے روز للا زہرہ کا واجبی سا گھر شادمانی سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے داخلے پر دوبارہ نیل پڑی سفیدی پوت دی تھی اور اب بے چینی سے اس آدمی کا انتظار کر رہی تھی جو اس کے حسابوں خدا کا بھیجا ہوا رحمت کا فرشتہ تھا۔ گو اس نے کہا نہیں لیکن اس کی دلی آرزو تھی کہ عازل کو کہیں بھی، کسی جگہ بھی کوئی کام مل جائے! میگیل کم از کم کوئی سفیر یا قونصل تو ضرور ہی ہوگا، لامحالہ کہیں نہ کہیں اثر ورسوخ رکھتا ہوگا۔

کھانے کے پورے دوران للا زہرہ نے باورچی خانے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ خود کچھ نہ کھایا اور صرف چائے کے وقت بس تھوڑی دیر کے لیے ہی منھ دکھانے کو نمودار ہوئی۔ میگیل بہت خوش تھا اور اس کے پکوان کی خوش ذائقگی کی مسلسل تعریف کیے جا رہا تھا اور اسے ''حاجّہ'' کہہ کر پکار رہا تھا؛ اور ہر بار وہ اسے یہ کہہ کر ٹوکتی، ''نہیں، نہیں، ابھی نہیں: اگلے سال، انشاءاللہ!''

میگیل نے عازل اور اس کی بہن کو اس تقریب میں آنے کی دعوت دی جو وہ اپنی عنقریب روانگی کے سلسلے میں دے رہا تھا، اور مدد کے لیے عازل کو ذرا سویرے آنے کے لیے کہا۔ ہر چیز کو نک سک سے درست ہونا چاہیے۔ کہیں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

''خوش ادائی اور آراستگی،'' میگیل نے کہا۔ ''اور ہاں، پھول: سارے گھر میں پھول ہونے چاہییں! چھری کانٹے سب خالص چاندی کے، ظاہر ہے! شیمپین، یخ، لیکن بہت زیادہ بھی نہیں، بس اتنی ہی جتنی ہونی چاہیے۔ خدمتگاروں کو چاہیے کہ نہایت ادب سے پیش آئیں۔ جواد اور خالد، تم دونوں کی ڈاڑھی منڈی ہونی چاہیے۔ خاص طور پر خوشبو بالکل نہ لگانا۔ اور بادام اور ایسی ہی دوسری چیزیں بالکل پیش نہ کرنا جن سے بھوک مر جاتی ہے۔ اپیریتیف (aperitif) اشتہا انگیزی کے لیے ہوتے ہیں، اشتہا کو ختم کرنے کے لیے نہیں!''

سارا طنجہ وہاں موجود تھا، شہر کے عمائد بھی اور میگیل کے بے حد قریبی احباب بھی۔ ڈنر کی تیاری میں جزئیات پر غیر معمولی توجہ دی گئی تھی؛ ہر چیز کے لیے بہترین ذوق کی نمائندگی لازم تھی، اور میگیل ذرا سی بھول چوک یا فروگزاشت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ شام پڑنے تک اعلیٰ سوسائٹی وِلا میں یوں امڈ آئی تھی جیسے سیدھی کسی دوسرے عہد سے چلی آ رہی ہو۔ کسی دور دراز ملک کی سن رسیدہ شہزادی کسی سابقہ حکومتی وزیر یا چند فلمی ستاروں سے جنھیں یاد سے محو ہوئے زمانہ ہو چکا تھا، مل جل رہی ہے۔ سر تا پا نیلے

Scanned with CamScanner

لباس میں ملبوس ایک زنِ پیر جس کی بابت لوگ اشاروں کنایوں میں کہہ رہے ہیں کہ برسوں تک ملک کی داشتہ رہی ہے، لیکن، ظاہر ہے، رازدارانہ طور پر۔ اس کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا تھا کہ بادشاہ سے اس کے بچہ بھی ہوا ہے، لیکن یہ صرف افواہ ہی تھی۔ وہ بڑی دلربا خاتون تھی جس نے کچھ مدت تک فلموں میں کام کیا تھا حتیٰ کہ شاہ نے منع کر دیا: جو ایک بڑا معقول فیصلہ تھا، خاص طور پر اس لیے کہ اس کی اداکاری... عازل میگیل کا ایک بے حد دیدہ زیب سفید غندورہ پہنے مہمانوں کی پذیرائی کر رہا تھا، اور انھیں ان کی جگہوں کی نشاندہی کرا رہا تھا۔ بالکل ایک مشرقی شہزادہ یا پانچویں دہائی کی سفید و سیاہ فلموں کا کوئی کردار نظر آتا تھا۔ مہمانوں کے درمیان شائستگی اور ٹھہراؤ سے یوں گھوم پھر رہا تھا جیسے اہلِ خانہ میں سے ہو۔ اس کی خوش اخلاقی دیکھ کر میگیل کو اسے اپنے حلقے میں شامل کر لینے پر خوشی ہوئی، تاہم کچھ اضطراب بھی، دل میں ایک ناقابلِ بیان کسک سی۔ اس حسین و جمیل جوانِ رعنا کو دیکھتے ہوئے اچانک اس کا دل بھر آیا، لیکن اس نے اپنے جذبات کو ظاہر نہ ہونے دیا اور بڑی جزرسی سے اپنے مہمانوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ اُس شام اس کی زندگی ایک نیا موڑ کاٹ رہی تھی: وہ اپنی روانگی منانے سے زیادہ اپنے نئے دوست کو متعارف کرا رہا تھا۔ مہمان اِس غندورہ پہنے ہوئے خدمتگار کو دیکھ کر ہنستے ہوئے سرگوشیاں کر رہے تھے: برا نہیں ہے یہ جوان، حتیٰ کہ خاصا شان بان والا لگ رہا ہے! کم از کم ایک بار تو میگیل کی قسمت چمکی! کیا خیال ہے، کب تک رہے گی؟ کون جانے؟ لیکن تم نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہو— ہوش میں آؤ، یہ تو بس ایک نوکر ہی ہے، میگیل کا نیا عاشق نہیں! میری بات سنو، نوکر ہوا تو کیا، کم از کم اسے آزمانے میں مجھے کوئی عار نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے اسے عورتیں بھی پسند ہوں... چپ، چپ، میگیل آ رہا ہے!

ٹیرس پر کاک ٹیل پیش کی گئی، جہاں سے نیچے تنگنائے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ واقعی میگیل نے سارے گھر میں پھول سجا رکھے تھے۔ پستئی سبز رنگ کا قفطان، جو اس نے خود وضع کیا تھا، اور شنگرفی مالا پہنے میگیل بے حد شاندار لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے حالیہ ہندوستانی دورے کا ذکر کیا اور جس قدر جلد ممکن ہو دوبارہ وہاں لوٹنے کا، حتیٰ کہ عازل کو اپنے ساتھ لے جانے کی طرف بھی موہوم سا اشارہ کیا۔ اب جبکہ اس کے دوستوں پر حقیقتِ حال واضح ہو چکی تھی، انھوں نے چاہا کہ اس نوخیز سے واقفیت پیدا کریں، اس کے پاس آئیں، بات چیت کریں، اس کی سن گن لیں۔ لیکن عازل باورچی

Scanned with CamScanner

خانے میں جا چھپا۔ رہی کنزہ، تو وہ سخت بیزاری محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس لیے چلی آئی تھی کہ میگیل کی دعوت کو رد کرنا دشوار تھا۔ لیکن وہ جاننا چاہتی تھی کہ میگیل اس کے بھائی سے آخر کیا لینا دینا چاہتا ہے۔ وہ بے وقوف نہیں بن گئی تھی، اور یکبارگی اس کا دل بھی رو دینے کو چاہا، لیکن جبر کر کے مسکراتی رہی۔ اس دنیادار گروہ میں، جس کے وجود کے بارے میں اس نے کبھی شک نہیں کیا تھا، سارے مرد نا قابلِ حصول تھے۔ ''ایک دن، ہاں،'' اس نے خود سے کہا، ''ایک دن میں اپنے خوابوں کے شہزادے سے ضرور ملوں گی۔ وہ دراز قامت ہوگا، رحمدل، بھلا، اور شہوت انگیز۔ چاہے مسلمان ہو یا عیسائی، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس ملک میں یہ ساری باتیں کتنی دشوار ہیں۔ مجھ سے جو توقع کی جاتی ہے اگر پوری نہیں کرتی تو کنواری بڑھیا رہ جاؤں گی، مجھے کسی 'مبھورہ' کی طرح حقارت سے دیکھا جائے گا، واماندہ اور ناکارہ۔''

میگیل کنزہ کے پاس آیا، اس کی بانہہ تھام لی، اور اس کا اسماعیل سے تعارف کرایا، جو اس سارے مجمعے میں تنہا غیر شادی شدہ آدمی تھا جو ہم جنسیہ نہیں تھا۔ کنزہ کی توجہ میں آیا کہ اس کے ہاتھ کچھ لجلجے سے ہیں، جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ آدمی اس کے لیے نہیں بنا۔ تاہم وہ شائستگی کے ساتھ کچھ دیر اس سے باتیں کرتی رہی: طنجہ، مشرق، آب و ہوا، کوہِ قدیم، ان رہائش گاہوں کی باتیں جن پر یورپی فنافٹ قابض ہو جاتے ہیں، اسلامیت کا فروغ، اسپین، جو شفاف فضا میں دور سے صاف نظر آتا ہے...

وہ اس پسیجی ہتھیلیوں اور خالی خالی آنکھوں والے آدمی سے اس قسم کی مبتذل بکواس کیے جانے پر خود سے نالاں تھی۔ سو کنزہ نے اپنی حکمتِ عملی بدلی اور جان بوجھ کر بھڑکانے والا لہجہ اختیار کیا۔

''اسماعیل، صاف صاف بتاؤ، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''مدعو ہوں، تمھاری طرح!''

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اس بھیڑ بھاڑ میں تمھارا کیا کام؟ میرا مطلب ہے، تم یہاں ان جیسے بننے کے لیے آئے ہو تاکہ ان کے قبیلے کا حصہ بن جاؤ؟''

''اس لیے آیا ہوں کہ کبھی کبھی میرا جی بھی کسی شاندار عیسائی مقعد کی ضیافت کرنے کو چاہتا ہے! یہ بات ہے!''

Scanned with CamScanner

اسے یوں بھڑکانے پر کنزہ کو مسرت ہوئی اور وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے رفو چکر ہوگئی۔ گھر کے راستے میں اسے یہ چہرے مسلسل نظر آتے رہے جو انیس سو پچاس کی دہائی کے طنجہ میں منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔

ہوائی جہاز میں سوار ہو کر رخصت ہونے سے پہلے میگیل نے اسپینی قونصل خانے سے ویزا کا فارم لے کر عازل کو دے دیا تھا۔

''تم اسے بھر لینا، اور میں تمھیں ضروری کاغذات بھجوادوں گا۔ اصول کے مطابق، اگر تمام دستاویزات مکمل ہوں تو تمھیں ویزا مل جائے گا۔ تمھارے لیے ملازمت کا معاہدہ براہِ راست قونصل خانے کو بھیج دوں گا۔ ہوشیار رہنا، کسی سے اس کے بارے میں کچھ کہنا نہیں — میں سخت توہم پرست واقع ہوا ہوں!''

عازل کو ویزا کی درخواست کی جملہ کارروائی پہلے ہی سے ازبر تھی، کیونکہ تین بار پہلے کوشش کر چکا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ اس بار قسمت بار آور ہوگی۔

اس نے فارم اس طرح پُر کیا جیسے پھر اسکول کا طالب علم بن گیا ہو۔ ایک ایک حرف خوب سنبھل سنبھل کر لکھا اور فارم کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے ہاتھ کے نیچے جاذب رکھ لیا جو اپنی کسی پرانی کاپی میں دبا ہوا مل گیا تھا۔ سوالات عام اور سادہ لیکن معینہ تھے۔ والد کا خاندانی نام، تاریخ ولادت۔ اس کے جواب میں اس نے ''متوفی'' لکھ دیا، اور اس صورت میں اسے موت کا صداقت نامہ مہیا کرنا پڑا۔ اس کے بعد اس کی ماں کا خاندانی نام پوچھا گیا تھا۔ یہ وہ بھول گیا تھا۔ کنزہ سے پوچھا، اسے بھی یاد نہ آ سکا۔

''لیکن آخر انھیں میرے خاندانی نام کی کیا ضرورت ہے؟'' للّا زہرہ نے دنگ ہو کر پوچھا۔

''مہاجرت تم کر رہے ہو، میں نہیں، کم از کم اِس وقت . . . ''

''افسر شاہی سرخ فیتہ۔ سوال چاہے بالکل احمقانہ ہوں، جواب دینے کے سوا چارہ نہیں۔ تو اپنا پورا نام بتاؤ نا؟''

''للّا زہرہ طوزانی۔''

تاریخ ولادت: 1936 قیاساً۔ عازل کو اپنا نانا یاد آیا جس نے اسے اکثر اسپینی خانہ جنگی کا

قصہ سنایا تھا۔ وہ ایک ریفی فوجی تھا جسے فرانکو نے زبردستی بھرتی کر لیا تھا۔

حالیہ ملازمت: عازل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب میں کیا لکھے۔ بے روزگار؟ طالب علم؟ سیاح؟ کچھ نہیں . . . جہاں کام کرتا ہے اس کا پتا اور فون نمبر: لیکن وہ کام کہاں کر رہا ہے؟ . . . سفر کی غرض و غایت: ایک اپنے دوست سے ملاقات۔ روانگی کی تاریخ اور واپسی کی تاریخ: ان کے بارے میں اسے علم نہیں۔

جب سوائے ان کاغذات کے جو میگیل بھیجنے والا تھا، سب کچھ تیار ہو گیا تو عازل نے درخواست کو ایک خاکی رنگ کے فولڈر میں رکھ دیا اور اس کے گرد ماں کی اوڑھنی لپیٹ دی۔

''اماں، یہ میری قسمت ہے، تمھارے ہاتھوں میں۔ اس پر اپنی دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھ دو۔''

''تاکہ برکت نازل ہو؟''

''نہیں، اماں، کامیابی کے لیے تمھاری آشیرباد چاہتا ہوں، لیکن اپنے لفظوں میں دینا، ایسی دعائیں جو سیدھی آسمان کو جاتی ہوں۔ ان کے بغیر میرا قصہ پاک سمجھو، ان کے بغیر میں کچھ بھی نہیں، یہ تمھیں خوب معلوم ہے۔ تمھاری دعاؤں کو خوب جاندار ہونا چاہیے: بعض تو چھت کے پار بھی نہیں جاتیں!''

''ہاں، میرے بچے، میرے ننھے سے بالک، میری زندگی کی روشنی۔''

# 8

# وطنِ عزیز

زندگی میں پہلی بار عازل ہوائی جہاز میں سفر کر رہا تھا— اور مغرب سے کوچ۔ ماں اور بہن ہوائی اڈے پر چھوڑنے ساتھ آئی تھیں، بے تحاشا رو رہی تھیں اور عازل کو، جو پہلے سے ہی ہیجانی ہو رہا تھا، اور زیادہ نادم کیے دے رہی تھیں، لیکن جب اسے احساس ہوا کہ صرف وہی نہیں رو رہی تھیں، تو اس

Scanned with CamScanner

کی ندامت اتنی واضح نہیں دکھائی دینے لگی۔ للاّ زہرہ نے ایک تھیلے میں کھانے کی چیزیں تیار کر رکھی تھیں — شہد میں بسے ہوئے کیک، کریپ، اور سیاہ زیتون — جسے عازل ماں کی منتوں کے باوجود ساتھ لے جانے سے انکار کیے جا رہا تھا۔ اسے خجالت محسوس ہو رہی تھی۔ پولیس اور کسٹم والے کوئی اعتراض بھی نہیں کر رہے تھے۔ جہاز ابھی پہنچا نہیں تھا۔ اس سے عازل کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ اس نے اس خط کو دوبارہ پڑھنے کا فیصلہ کیا جو اسپین میں داخلے کے ویزا اور وہاں رہائش کی اجازت ملنے والے دن اس نے اپنے ملک کے نام لکھا تھا۔ وہ کیفے ٹیریا میں گیا، ایک قہوے کا آڈر دیا، اپنی یادداشت کی کتاب نکالی، اور خط پڑھنے لگا۔ وہ مسکرا رہا تھا، ساتھ ہی کسی کے ناگہانی مخل ہونے سے بھی چوکنا تھا۔ گاہے گاہے پڑھنا بند کر کے قہوے کی چسکی لیتا اور دوسرے مسافروں کا مشاہدہ کرنے لگتا۔ ایک موقعے پر جب ایک مکھی آ کر میز پر بھنبھنانے لگی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ پھر اعلان ہوا: جہاز کی دیر سے آمد کے سبب مسافر کوئی آدھے گھنٹے تاخیر سے سوار ہوں گے۔ عازل کا جی چاہا کہ کہیں اور کھسک لے، کسی بالکل مختلف جگہ، اور وہاں اپنا خط بلند آواز سے پڑھے، ایسا خط جو اس کے بہت سے دوستوں نے لکھنا چاہا ہوتا:

عزیز وطن (ہاں، 'عزیز وطن' بالکل مناسب ہے، کیونکہ شاہ بھی لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے "میرے عزیز ہم وطنو")، آج کا دن میرے لیے بڑا عظیم دن ہے: آخر کار میری قسمت جاگ اٹھی ہے اور مجھے یہاں سے رخصت ہونے کا موقع ملا ہے، تجھے چھوڑ دینے کا، ایک نئے ملک کی فضا میں سانس لینے کا، تیری پولیس کے آزاروں اور اہانتوں سے نجات پانے کا۔ میں تجھ سے رخصت ہو رہا ہوں، اس حال میں کہ میرا دل ہلکا ہے، آنکھیں افق پر ثبت ہیں، مستقبل میں جھانک رہی ہیں؛ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ کیا کروں گا — بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ میں ہر تبدیلی کے لیے تیار ہوں، آزاد زندگی گزارنے کے لیے، کارآمد بننے کے لیے، ایسی چیزوں کی تگ و دو کے لیے جو مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیں گی، ایسا آدمی بنا دیں گی جسے خوف دامنگیر نہ ہوگا، جو سگریٹ کے خرچ کے لیے اپنی بہن کا دست نگر نہ ہوگا، جسے اوٹ پٹانگ کام نہیں کرنے پڑیں گے، اسے

کبھی یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ ناکارہ ہے اپنی اسناد نہیں دکھانی پڑیں گی، جسے اب دوبارہ کبھی اس منشیات کا دھندا کرنے والے تخم حرام العافیہ کے منہ نہیں لگنا پڑے گا، یا اس بڑھے کھوسٹ الحاج کی چاپلوسی نہیں کرنی پڑے گی جو نوجوان لڑکیوں کو چھو چھا کر خوش ہو لیتا ہے لیکن ان کے ساتھ جفتی کرنے سے عاجز ہے۔ میں جا رہا ہوں، میرے عزیز وطن، میں سرحد پار کر رہا ہوں، دوسری جگہوں کا قصد کر رہا ہوں، اور کام کے اجازت نامے سے مسلح ہوں: اب، آخر کار، اپنی روزی خود کماؤں گا۔ میرے وطن نے میرے ساتھ شفقت اور رحمدلی کا سلوک نہیں کیا ہے، اور نہ میری نسل کے دوسرے بہت سے جوانوں کے ساتھ۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہماری تعلیم ہمارے لیے دروازے کھول دے گی، کہ مراکش بالآخر اپنے مراعات و امتیاز پسند معاشرے کو تج دے گا، ان من مانی بدقسمتیوں کو جو وہ دوسروں پر لاتا ہے، لیکن سبھی نے ہمیں مایوس کیا، سو ہمیں کسی طرح گزارہ کرنے کے لیے کڑی بھاگ دوڑ اور یہاں سے نکل جانے کے لیے ہر طرح کی کوشش کرنی پڑی۔ ہم میں سے بعضوں نے صحیح دروازے پر دستک دی ہے، جو بھی مل جائے اسے قبول کرنے کے لیے تیار، جبکہ بعض دوسروں کو بڑی کڑی مشقت کا سامنا کرنا پڑا ہے...

لیکن، میرے پیارے وطن،

میں ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہا ہوں۔ تم مجھے اہل اسپین کو صرف مستعار ہی دے رہے ہو، جو ہمارے پڑوسی ہیں، ہمارے دوست ہیں۔ ہم انھیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایک طویل عرصے تک وہ بھی ہماری طرح نادار تھے، لیکن پھر ایک دن فرانکو مر گیا، جمہوریت آئی، پیچھے پیچھے آزادی اور خوشحالی۔ یہ سب معلومات مجھے قہوہ خانوں کے باہر بیٹھ کر حاصل ہوئی ہیں، وہ جگہ جو ہم جیسے سارے مراکشیوں نے اسپین کے ساحلوں کے انتھک مشاہدے اور ساتھ مل کر اس من موہنے ملک کی تاریخ کی بازخوانی کے لیے چن رکھی ہے۔ ہمیں آوازیں سنائی دیتیں، ان ساحلوں کو ٹکٹکی باندھے کر دیکھتے ہوئے یہ یقین ہو جاتا کہ ہم کسی جل پری یا فرشتے کو بلانے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ہم پر رحم کھا کر

ہمارے ہاتھ تھام لے گا اور ہمیں تنگنائے کے پار لے جائے گا۔ دیوانگی آہستہ آہستہ ہم پر طاری ہوتی جاری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نوخیز رشید ایک دن بنی مکادہ کے نفسیاتی امراض کے ہسپتال پہنچ گیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا مرض لاحق ہے؛ وہ صرف ایک ہی لفظ کہنے پر قادر تھا؛ جسے مسلسل دہرائے جاتا: ''اسپانیا۔'' اس نے کھانا پینا بند کر دیا تھا، اس امید میں کہ اتنا لطیف ہو جائے گا کہ فرشتے کے پروں پر بیٹھ کر اڑ جائے گا!

آہ میرے وطن، میرے ناکام ارادے، میری ہزیمت خوردہ خواہش، میری بڑی سے بڑی حسرت! تم میری ماں، میری بہن، اور میرے چند دوستوں کو اپنے پاس رکھو؛ تمھی میرا اجالا اور میری اداسی ہو؛ میں انھیں تمھارے سپرد کرتا ہوں کیونکہ میں واپس آؤں گا، اور میں انھیں تندرست دیکھنے کا متمنی ہوں، خاص طور پر اپنے گھر والوں کو۔ لیکن ہمیں بچاؤ، اُن غنڈوں سے بچاؤ جو ہمارا خون چوستے ہیں، صرف اس لیے کہ انھیں حمایت اور امان حاصل ہے، جبکہ ان کا سامنا تو عدالت اور جیل سے ہونا چاہیے؛ ان وحشیوں سے نجات دلاؤ جو قانون سے خوب واقف ہیں اور اس سے بھی کہ اسے کیسے توڑا مروڑا جاتا ہے۔ انھیں اپنی کرنے سے کوئی نہیں روکتا۔ پیسہ، جیسا کہ ماں کہتی ہے، کڑوی چیزوں پر شکر پھیر دیتا ہے۔

اخلاقی اعتبار سے میں کوئی بلند آدمی نہیں ہوں، نہ پوری طرح ایماندار، اور کامل ہونے سے کوسوں دور۔ میں تو اس ضیافت سے روٹی کا گرا ہوا ریزہ ہوں جس کے مہمان ہمیشہ ایک ہی لوگ ہوتے ہیں، جہاں ایک غریب ہمیشہ ہی بے محل ہوتا ہے، جس کی غربت ایک جرم، ایک گناہ تصور کی جاتی ہے۔ ''ارے، مال سامنے پڑا ہے؛'' میں العافیہ کو کہتے ہوئے سنتا تھا۔ ''بس ہاتھ بڑھاؤ اور لے لو۔ مفلس نہیں رہنا چاہتے؟ تو بس نہ رہنے کا ارادہ کر لو!''

اور مجھے اوروں جیسا کرنے کی ترغیب محسوس ہوتی۔ لیکن ماں کا ہاتھ، اور اس باپ کا ہاتھ جس سے بمشکل واقف ہو سکا تھا، مجھے دوبارہ سیدھی راہ پر ڈال دیتا۔ آسان راہ نہ اختیار کرنے پر میں ان کا شکر گذار ہوں۔

Scanned with CamScanner

اب مجھے رک جانا چاہیے؛ میں تھک گیا ہوں۔ میں خود کو جہاز میں بیٹھا ہوا تصور کر رہا ہوں۔ میں خوفزدہ نہیں ہوں، میں تو جوش میں آ گیا ہوں—— پیارے وطن، تمھیں بلندیوں سے دیکھنے کو متجسس ہوں، اور امید کہ پائلٹ کو ٹھیک طنجہ کے اوپر سے پرواز کرنے کا نادر خیال آئے گا، صرف میری خاطر، تا کہ اسے خداحافظ کہہ سکوں، تا کہ اندازہ کر سکوں کہ اُس دور پرے کے جھونپڑے میں کون پڑا ہے، ڈھیتی دیواروں میں تکلیفیں سہہ رہا ہے، اس کچی آبادی میں کون زندگی بسر کر رہا ہے، اور کب تک یہ لوگ اپنی منحوس غریبی کو برداشت کر سکیں گے۔

اسپین کے ہوائی اڈے پر ایک پستہ قد، شاندار کپڑوں میں ملبوس بوڑھا آدمی، ہاتھ میں تختی اٹھائے، جس پر عازل کا نام موٹے موٹے نمایاں حروف میں لکھا ہوا تھا، اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی فوراً بولا:

''مجھے چیکو کہتے ہیں، یہ میرا لقب ہے، میں سینور میگیل کے یہاں کام کرتا ہوں۔ میں کوتاہ قامت ضرور ہوں، لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔''

عازل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے، سو اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ سارے راستے چیکو نے منھ نہیں کھولا۔ بوڑھی کارمن نے، جو میگیل کے گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی، عازل کو لونگ روم میں لا کر بٹھا دیا اور میگیل کی واپسی تک انتظار کرنے کے لیے کہا۔ کارمن کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ کوئی چیز اسے مضطرب کر رہی ہے۔ وہ میگیل کو بہت اچھی طرح جانتی تھی، سو اسے اندازہ تھا کہ کیا پیش آنے والا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ میگیل کو عشق میں مبتلا ہوتے ہوئے دیکھا تھا، اور ان لگاوٹوں کا انجام ہمیشہ ہی برا ہوا تھا۔ میگیل لوگوں پر بڑی آسانی سے اور بہت زیادہ اعتبار کر لیتا تھا اور اس شرمناک حد تک انھیں اپنے سے فائدہ اٹھانے دیتا تھا کہ لگتا ایسا جان بوجھ کر کر رہا ہے، تا کہ کسی موہوم احساسِ جرم کی سزا خود کو دے سکے۔

تھکن سے چور عازل اپنے نئے ماحول سے ابھی تک حواس باختہ تھا۔ دیوار پر آویزاں تصویروں کی تعداد پر دنگ ہو رہا تھا۔ لونگ روم میں بیٹھے وہ بمشکل سگریٹ پینے کی جرأت کر سکا۔ ہر

شے بے حد صاف ستھری تھی۔ کہیں گرد کا ایک ذرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے چاندی کے اعجوبے، بیش قیمت نوادارت کی ایک پوری پلٹن نمائشی الماریوں میں جگمگا رہی تھی۔

کارمن عازل کے لیے قہوہ لے کر آئی۔ اس کا دماغ ڈولنے لگا تھا۔ ٹھیک اس سے کس چیز کی توقع کی جا رہی تھی؟ اس کے اولین خیالات میں ماں جاگزیں تھی، اور کنزہ بھی۔ کسی دن دونوں اس پر فخر کریں گی۔ شاید وہ کنزہ کو کچھ پیسہ بھی بھیج سکے اور اسے اسپین بلا لے۔ لیکن اس وقت اسے حال سے نبرد آزما ہونا ہے؛ میگیل، اور ان مشکل لمحات سے جو جلد یا بدیر لامحالہ آ کر رہیں گے ... ظاہر ہے، میگیل یہ سب خالص جذبۂ ایثار سے نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک حساس اور ذہین آدمی تھا: اس نے ضرور یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ عازل کو عورتیں کتنی زیادہ پسند آتی ہیں ...

اچانک میگیل لونگ روم میں داخل ہوا، حسب عادت خوش پوشاک، تاہم کسی قدر لیا دیا ہوا، نہایت متین لباس میں، سر پر سیاہ فیڈورا ہیٹ لگائے ہوے۔

''سفر ٹھیک رہا نا؟'' اور جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے یہ اور کہا، ''تمھارے کاغذات فوری دیکھ لینے چاہییں۔ کل تمھارا پاسپورٹ لے کر پولیس اسٹیشن چلیں گے اور من بھر فارم وغیرہ بھریں گے۔ پھر میرے وکیل کے پاس جائیں گے تاکہ وہ تمھاری ملازمت کا قطعی معاہدہ تیار کرے۔ فی الوقت تم اوپری منزل میں خادمہ کے کمرے میں رہو۔ جانتا ہوں یہ ساری باتیں خاصی جزبز کر دینے والی ہیں، لیکن ہمیں یہ سب ٹھیک اصول کے مطابق کرنا ہوگا۔''

عازل کچھ دیر گومگو کی کیفیت میں رہا، پھر پوچھ ہی لیا کہ اس کا کیا کام ہوگا۔

''اب رہنے بھی دو، جان بوجھ کر احمق نہ بنو، تم خوب جانتے ہو ...''

''نہیں، موسیو میگیل، یقین کریں ...''

''بس اتنا خالی خولی بننا کافی ہے! اس وقت ان دستاویزات سے نمٹتے ہیں، باقی باتیں بعد میں۔''

اس شام عازل اپنے چھوٹے سے کمرے میں تنہا بیٹھا رہا۔ باہر جانے کو جی چاہا لیکن میگیل کے ردعمل سے خائف تھا۔ تھکا ماندہ اور اداس، بستر پر آ پڑا لیکن سو نہ سکا۔ اس کا سر ایسے پیکروں سے چکرا رہا تھا جو کبھی صاف نظر آتے اور کبھی سایوں میں لپٹے ہوے اور گڈمڈ۔ خود کو فکروں میں غلطاں پا کر اس نے وہ تھیلا نکالا جس میں ماں نے کھانے پینے کی چیزیں باندھ دی تھیں اور کسی بچے کی طرح

Scanned with CamScanner

شہد میں بسے ہوئے کیک ٹھونسنے لگا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ جس جنت کا تصور کیا تھا وہ کسی وسیع و عریض ولا کی اٹاری کے اس تنگ سے کمرے سے تو کیا مشابہت رکھتی ہوگی، یا اس تنہائی سے جس نے نیند حرام کی ہوئی تھی۔ اسے سہام یاد آئی، اس کے آنسو یاد آئے اور اپنے جسم سے چمٹا ہوا اس کا جسم۔ اسے اس کی خواہش محسوس ہوئی۔ لیکن سہام اب بہت دور تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور اپنے عضو سے کھیلنے لگا۔ پھر اس نے اپنی کاپی نکالی اور وطن کے نام اپنا خط لکھنا جاری رکھا۔

عزیز وطن، سو اب میں یہاں ہوں، اور ابھی سے تیری کسی قدر کمی محسوس ہو رہی ہے؛ اپنی تنہائی میں تیرا خیال آتا ہے، ان کا خیال آتا ہے جنھیں پیچھے چھوڑ آیا ہوں، سب سے بڑھ کر ماں کا۔ اس وقت، جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، وہ کیا کر رہی ہوگی؟ یقیناً رات کا کھانا پکا رہی ہوگی۔ اور کنزہ؟ وہ بس اب گھر پہنچنے ہی والی ہوگی، الّا یہ کہ آج وہی شام ہو جب وہ پرائیویٹ نرس کا کام کرتی ہے۔ میرے دوست احباب، وہ مجھے صاف نظر آ رہے ہیں، قہوہ خانے میں بیٹھے ہیں۔ رشید ہسپتال سے لوٹ آیا ہے، کچھ بول نہیں رہا؛ دوسرے تاش کھیل رہے ہیں، مجھ پر رشک کر رہے ہیں، سوچ رہے ہیں میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ میں انھیں سن سکتا ہوں؛ وہ کبیدہ خاطری سے میرا ذکر کر رہے ہیں۔ عجیب بات ہے، میرا جی ان کے ساتھ ہونے کو چاہ رہا ہے، اور کچھ نہیں تو صرف ایک گھنٹے ہی کے لیے، پھر یہاں واپس چلا آؤں گا۔ میں تیرے بارے میں، تیری فضا، تیری روشنی کے بارے میں غور و فکر بند کرنا چاہتا ہوں۔ تجھے معلوم ہے، مراکش سے اسپین صاف نظر آتا ہے، لیکن اس کا برعکس درست نہیں ہے۔ اسپینی ہمیں نہیں دیکھتے، انھیں ہماری ذرا پروا نہیں، ہمارا ملک ان کے لیے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ میں اپنے تنگ سے کمرے میں پڑا ہوں جس میں اُبسی ہوئی بو پھیلی ہوئی ہے؛ اس میں صرف ایک کھڑکی ہے اور اسے کھولنے کی جرأت مجھ میں نہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے مایوسی ہوئی ہے — یہی ہے کہ میں بے صبرا ہوں، تھکا ہارا ہوں، آب و ہوا کی تبدیلی سے نڈھال ہوں، اور خوف سے بھی، نئے پن کا خوف، اس سے بخوبی عہدہ برآ نہ ہو پانے کا خوف... میں تیرے

بارے میں سوچتے ہوئے سو جانے کی کوشش کروں گا، میرے پیارے وطن، عزیز ترین اور میری بڑی سے بڑی بے چینیوں کے مسکن۔

# 9

# سہام

جب عازل بارسلونا کی رہائش گاہ میں بودوماند اختیار کر رہا تھا، سہام ویزا کی درخواست داخل کرنے کے لیے اسپینی قونصل خانے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے سارے کاغذات مکمل تھے۔ الحاج نے اس کے لیے ماربیا میں مقیم ایک سعودی کنبہ ڈھونڈ نکالا تھا جسے ایک معذور عورت کے لیے ایک مددگار نرس کی ضرورت تھی۔ الحاج کے مشورے پر اس نے ان لوگوں کو اپنا کوائف نامہ بھیج دیا تھا اور نوک پلک سے درست خط جس میں ملازمت میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ الحاج نے اصرار کیا تھا کہ وہ اس میں اپنے شناختی فوٹو بھی شامل کرے، جس پر شروع میں اسے یہ شبہ ہوا تھا کہ کہیں کوئی جال تو نہیں بچھایا جا رہا۔ لیکن جلد ہی اسے معذور عورت کا جواب ملا جس سے الحاج کی بات کی وضاحت ہوگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ جس عورت سے اس کا لینا دینا ہو وہ مسلمان ہو، عیسائی نہیں۔ سہام نے حجاب پہن کر فوٹو کھنچوانے کی بابت غور کیا، جس کا پرزور مشورہ الحاج نے دیا تھا، لیکن آخر میں یہ خیال اسے سخت احمقانہ معلوم ہوا۔ اسے اسلامی اور ریاکار لوگ ناپسند تھے۔ مناسب پوشاک اور شک وشبہے سے بلند سلوک: بس یہی حقیقت میں اس کے نزدیک اہم تھے۔ الحاج، جو اسے پسند کرتا تھا، اصرار کیے گیا۔

''دیکھو سہام، میری عزیزہ، بعض اوقات حجاب اچھا رہتا ہے۔ ایسی لڑکیاں جو باہر حجاب پہن کر نکلتی ہوں انھیں لوگوں کے تنگ کرنے کا امکان کم ہوتا ہے، اور پھر بہر حال نہ پہننے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں! تمھیں بشریٰ یاد نہیں، جس نے اپنی سے عمر سے بہت بڑے لیکن صاحب دولت تاجر سے شادی کی تھی؟ وہ پورے نقاب میں میرے یہاں آیا کرتی تھی، میں نے تو اسے 'نقاب پوش اعجوبہ' کا لقب دے رکھا تھا! خیر، جب وہ اپنا جلابیہ اور نقاب تن سے جدا کرتی تو اندر سے بالکل دوسری

عورت نکلتی: وہ ایسے شفاف بلاؤز پہنتی کہ کچھ ڈھکا چھپا نہ رہتا، اور بڑی چست پتلونیں... بڑی لاجواب تھی۔ سو آخر میں وہ پالا مارنے میں کامیاب ہوگئی۔ اب یہ کب تک چلے گا، اس کی بابت میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنے کا گر جانتی ہے۔ اور سونے پہ سہاگہ —— اور یہ میں تم سے کہہ سکتا ہوں —— وہ باکرہ تھی۔ اس نے اپنی بکارت بڑی ہوشیاری سے اپنے شوہر کے لیے سنبھال رکھی تھی۔''

''کیا وہ خوش ہے؟ خیر کچھ بھی سہی، کم از کم اسے پیسے کی تنگی تو نہ ہوگی۔''

''بے وقوف نہ بنو، وہ شخص سخت بخیل نکلا۔ کل پرسوں ہی بشریٰ نے مجھے فون کیا تھا، رو رہی تھی۔ ٹھیک ہے، محل جیسے مکان میں رہتی ہے اور گھر خادماؤں سے بھرا ہوا ہے، لیکن اسے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اچھا، تو اب حجاب پہن رہی ہو یا پھینک رہی ہو؟''

''پھینک رہی ہوں! بات یہ ہے کہ میری رادی، جو ریف سے آئی تھی، حَیک [5] پہنتی تھی۔ یہ ایک طرح کا عرب جبہ ہے۔ دیکھنے میں خلخلا تا ہوا کفن لگتا ہے، سفید رنگ کے کپڑے کا ٹکڑا جو وہ اپنے گرد لپیٹ لیتی تھی۔ اُس دور میں حَیک پہننے پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا، یہ بالکل فطری تھا۔ میری ماں حجاب بغیر جلابیہ پہنتی تھی، اور ہم سے کبھی کسی نے حجاب پہننے کو نہیں کہا، البتہ میرا چچا، وہی جو بیلجیم مہاجرت کر گیا ہے، ضرور تنبیہ کرتا تھا۔ گرمیوں کی تعطیل میں جب بھی لوٹتا تو ہمیں اخلاقیات پر لیکچر دیتا۔ اس پر میں کھی کھی کرنے لگتی، کیونکہ اس کی بیٹیاں چوری چھپے سگریٹ پیتی تھیں، لڑکوں کو دوست بنا رکھا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ وہ اپنے باپ کی فرمانبرداری صرف اس لیے کرتیں کہ اس کے بعد وہ انھیں چین سے بیٹھنے دے گا تاکہ من مانی کرتی پھریں۔ اس قسم کی ریاکاری سے مجھے سخت نفرت ہے۔ ظاہر میں نیکوکاری، اور باطن میں اخلاقی گراوٹ، یہ وہ مراکش ہے جو مجھے برہم کر دیتا ہے۔''

''میری عزیز، پاگل نہ بنو۔ تم دیکھو گی کہ اگر یہاں سے چلی بھی گئیں تو بھی اپنے ملک کی کمی ہمیشہ محسوس کرو گی۔ ہم مراکش سے اس درجہ وابستہ ہیں کہ اسے بالکل بھول نہیں سکتے۔ یہ واقعی ہم سے چپک جاتا ہے، جس طرح کسی نئی کڑھائی سے پکوان۔ ہم اسے بھول نہیں سکتے۔ میں نے جوانی میں

---

5۔ الحیک: شمالی افریقہ، بالخصوص مراکش کا پہناوا۔ یہ ڈھیلا ڈھالا اور سفید کپڑے کا ہوتا ہے اور سر اور سارے جسم کو گھیرے ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

بہت سفر کیے ہیں، حرام پیسے کی فراوانی اور ایسے والدین کی بدولت جو کبھی جرح نہیں کرتے تھے: میں بہت دور دور تک گیا ہوں اور جہاں کہیں بھی گیا ہوں، عجیب بات ہے کہ مجھے ہر جگہ مراکش کی کمی محسوس ہوئی ہے...''

''تو پھر تم اس کی کیا توجیہہ کرو گے کہ ہم پر حکومت کرنے والے ہمارے لیے کچھ نہیں کرتے؟''

سہام ایسے نوجوانوں میں گھری ہوئی تھی جنھیں صرف ایک ہی فکر لگی تھی: فرار ہو جائیں، کوچ کر جائیں، کہیں کام مل جائے، چاہے ان کے ملک سے کتنی ہی دور کیوں نہ سہی۔ پیسے کی تنگی کی وجہ سے سہام اپنی ادب کی تعلیم ختم نہیں کر سکی تھی اور آخر کار ایک وکالتی دفتر میں سیکرٹری کی نوکری کر لی تھی۔

سہام کو چار ماہ کا سیاحتی ویزا مل گیا۔ جس دن وہ روانہ ہوئی، ماں باپ نے دعائیں دیں۔ ہر چند کہ والدین کی دعائیں بہت ضروری تھیں، صرف یہی کافی نہیں تھیں، اور سہام کو ان سے قوی تر محافظت کی حاجت محسوس ہوئی۔ اس نے وضو کیا، ماں سے جانماز مانگی اور بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ خدا سے دعا مانگی۔ وہ نامعلوم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے ہر وقت چوکنا رہنا پڑے گا، خاص طور پر ماربیا میں رہنے والے عربوں سے۔ اس نے عورتوں کو جبراً کسبی بنانے اور ان کے ساتھ نہایت بُرا برتاؤ کرنے کی بابت کہانیاں سن رکھی تھیں۔

اسے الجسیر اس کے ہوائی اڈے پر پارکنگ لاٹ کا راستہ تلاش کرنے میں کچھ وقت لگ گیا جہاں، خط میں دی گئی ہدایات کے مطابق، ایک سیاہ مرسیڈیز اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب شوفر نے دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر اسے بٹھانے میں مدد کی تو اسے اپنے ساتھ کسی امریکی فلمی ستارے کی طرح سلوک کیے جانے پر فخر محسوس ہوا۔ اور اس کا تخیل یہیں پر نہیں رک گیا، بلکہ اسے تو اور مہمیز لگ گئی اور سرپٹ دوڑنے لگا: اسے اغوا کیا جا رہا ہے، اس کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کے بعد اجاڑ سے دیہاتی علاقے کے بیچ میں چھوڑ دیا گیا ہے! اس نے خود کو سعودی گھرانے میں قیدی تصور کیا، بیمار عورت کا شوہر اسے جنسی طور پر استعمال کر رہا ہے، وہ فرش پر بھوکی پیاسی چت پڑی ہوئی ہے۔ چیخیں مارتی ہے لیکن کوئی سنتا نہیں۔ وہ خودکشی کی نیت سے اپنی کلائی کی شریانیں کاٹنے کی کوشش کر رہی ہے

Scanned with CamScanner

لیکن یہ کر نہیں پاتی۔ پھر، یکبارگی، سہام نے اپنے حواس پر قابو پالیا، اور اپنے وسوسوں کو ابلیس کے کیے دھرے سے منسوب کیا۔ ان تیرہ و تاریک خیالات کو ہمیشہ کے لیے ذہن سے خارج کردینے کے لیے اس نے دل ہی دل میں آیت الکرسی کی تلاوت کی۔ لیکن گلوخلاصی کہاں ہوئی تھی؟ کہیں زیادہ تشدد آمیز مناظر ذہن میں تیزی سے گزرنے لگے۔ آخر میں اس نے ان پر ٹھٹھا مار کر ہنسنے کا فیصلہ کیا۔ جب شوفر نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سہام نے ہنسنے پر معذرت کی اور مناظر کو گزرتے ہوئے دیکھنے لگی۔

ماربیا کروڑ پتیوں کے لیے ایک طرح کا سیاحتی قریہ نظر آتا تھا، جہاں خلیج کی ریاستوں کے باشندوں نے اپنے لیے بڑی شاندار رہائش گاہیں تعمیر کروا رکھی تھیں۔ یہاں وہ بس سال کے چند دن ہی آ کر رہتے تھے۔ ان میں سے بعضوں کے لیے کسی دعوت میں شرکت کے لیے تنگنائے کے پار جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ان میں سے بیشتر ایسے موقعوں پر طنجہ کے بڑے بڑے پر تعیش ہوٹلوں میں کمرے کرائے پر لے لیتے، اور باہر سے پر تکلف کھانے، شرابیں، موسیقار، اور لڑکیاں منگواتے تھے۔ ارباب حل وعقد ان سے اغماض کرتے۔ سہام نے ان ساری باتوں کے بارے میں اپنی سہیلیوں سے سن رکھا تھا، اور اسے تو یہاں تک بتایا گیا تھا کہ چند لڑکیوں نے ساری رات کمرے میں بیٹھے بیٹھے گزار دی تھی لیکن ان کا بلاوا آ کر نہ دیا، اور صبح ہونے پر چند ڈالر دے کر انھیں رخصت کر دیا گیا۔ سہام نے ایسی لڑکیوں پر کوئی حکم نہیں لگایا؛ بس خود کو ایسی حرکتوں سے دور اور اپنے وقار کو قائم رکھا، اگر کچھ کہا تو بس اتنا ہی کہ اس روز افزوں طوائف بازی کو قبول کرنے کی ذمے داری ہر ایک پر عائد ہوتی تھی۔

غانی صاحب —— وہ مالدار سعودی جنھوں نے اسے ملازمت دی تھی —— کے گھر پر ایک عجیب وغریب چیز اس کی منتظر تھی۔ سعودی کی بیوی غیتا نے بڑی پھرتی سے اس کا استقبال کیا۔ سہام نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اسے کیا جسمانی معذوری لاحق ہے اسے بڑے غور سے دیکھا، لیکن غیتا کی حرکات وسکنات، فکر اور گفتگو سب نارمل لوگوں جیسے تھے۔

سہام کی حیرت کو بھانپتے ہوئے غیتا نے خود ہی کہا، ''جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو، میں مراکشی ہوں۔ میں سال کا زیادہ حصہ یہیں رہتی ہوں؛ میرے خاوند سعودی عرب میں رہتے ہیں، جہاں ان کے کاروباری علاقے اور دوسرے گھر والے ہیں۔ میں ان کی دوسری، اور میرے خیال میں تو ان کی

Scanned with CamScanner

چہیتی بیوی ہوں۔ مشکل یہ ہے: ہماری بیٹی وداد معذور ہے۔ بارہ سال کی ہے۔ اسے بولنے اور حرکت کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ ہمیں کسی ایسی عورت کی ضرورت ہے جو ہمہ وقت اس کے ساتھ رہے، جس میں برداشت کی طاقت اور استحکام دونوں ہوں، اور اس کی دیکھ بھال میں ہمارا ہاتھ بٹا سکے۔ پہلے ہم نے کئی اسپینی آیائیں رکھیں، لیکن یہ سب مزدوروں کی انجمن کی رکن ہوتی ہیں اور سرکاری ملازموں کی طرح کام کرتی ہیں — پھر یہ بھی ہے کہ ہم ایسی آیا چاہتے ہیں جو ہماری طرف کی ہو، عربی بولتی ہو، ہماری روایات اور رسم و رواج سے واقف ہو۔ سمجھو، ہماری بچی کے لیے ہر چیز پہلے ہی کافی دشوار ہے، چنانچہ اس کی زندگی میں مزید الجھنیں ڈالنے کی کوئی وجہ نہیں۔ میں تم سے صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ کام بہت محنت طلب اور تھکا دینے والا ہے، لیکن معاوضہ بہت اچھا ہے۔ میرے خاوند وداد کے والہ و شیدا ہیں، اور اسے شاد ماں ... اور عام بچوں جیسا دیکھنے کے لیے کچھ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

سہام کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر سنتی رہی؛ جو بتایا جا رہا تھا وہ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا، اس نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ایک ایبنارمل بچی کی خدمت کرنی ہوگی۔ اس صورت میں وہ واپس جا سکتی ہے... اس سفر کو چھوٹی موٹی تعطیل گردان سکتی ہے، منظر کی تبدیلی، ایک غلط فہمی۔ دوبارہ رخصت... ہاں، لیکن کہاں کے لیے؟ مراکش؟ ناممکن، اس تنگ، گھٹی گھٹی زندگی، طنجہ کی ان حقیری ملازمتوں کی طرف لوٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سہام نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس کیا کہ وہ معذوروں کے بارے میں جانتی ہی کیا ہے، اور اس میں وہ داخلی وسائل کہاں ہیں کہ اس قسم کے دشوار گزار کام کو انجام دے سکے۔ لیکن سامان باندھ کر طنجہ جانے والی کشتی میں جا بیٹھنا بھی اس کی قدرت سے باہر تھا۔

غیتا خاموشی سے اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ کچھ توقف کے بعد سہام نے بچی کو دیکھنے کے لیے کہا۔

"پرسوں اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ صرف ایک لمحے کی غفلت کا یہ انجام ہوا: وہ گر پڑی اور چوٹ لگا بیٹھی۔ تمھیں سارا وقت چوکس رہنا ہوگا۔ کیا تم کام کے لیے تیار ہو؟"

سہام کو اپنے دوست عازل کا خیال آیا اور سوچا کہ اس کام کو کرنے میں کوئی عیب نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

''ٹھیک ہے، کرلوں گی، لیکن آپ یہ دھیان میں رکھیں کہ مجھے اس قسم کے کام کی باقاعدہ تربیت نہیں دی گئی ہے۔ یہ یقین رکھیں کہ میں خوش اسلوبی سے کام کرنے کی بساط بھر کوشش کروں گی۔''

غیتا نے سہام کو ایک سیل فون دیا۔

''اسے ہمیشہ کھلا رکھنا ہوگا۔ تم اسے اپنے دوستوں اور والدین سے بات کرنے کے لیے بھی استعمال کرسکتی ہو۔''

ماریا، اسپینی خادمہ، سینی پر مشروبات اور کچھ میٹھی چیزیں رکھے نمودار ہوئی۔ بعد میں اس نے سہام کو اس کا رہائشی کمرہ دکھایا، جو کافی کشادہ تھا اور اس میں دو پلنگ تھے اور غسلخانہ۔ سہام فوراً سمجھ گئی کہ اسے بچی کے برابر ہی سونا ہوگا۔ اس نے وِداد کے بے شمار کھلونوں اور دیوار پر آویزاں اس کی تصویروں پر نظر ڈالی جو اس کی پیدائش تک جاتی تھیں۔ افسردہ رو خوبصورت بچی تھی، لیکن آنکھوں سے ایک متین ذہانت ٹپک رہی تھی۔

سہام اور وِداد کی پہلی ملاقات تقریباً تباہ کن ثابت ہوئی۔ تھکی ماندی اور چڑچڑی، بچی نئی آیا کی موجودگی کو یکسر نظرانداز کرکے روتی رہی اور ماں کی آغوش میں آنے سے انکار کردیا۔ سہام کو محسوس ہوا کہ مداخلت نہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔ انتظار کرے یہاں تک کہ اس کا شوروغل اپنی انتہا کو پہنچے، اور بالاتر یہ کہ کوئی احتجاج یا واویلا نہ کرے۔ سہام اپنی زندگی کو سدھارنے کی کوشش میں اب ایک زمانے سے خود کو صبر وتحمل کرنا سکھا رہی تھی۔ اس نے ایک کتاب لی اور اپنی خوابگاہ میں چلی آئی۔ جب وِداد کمرے میں آئی اور دیکھا کہ سہام بستر پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے تو ہاتھ لہرا کے اسے وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

لیکن سہام ٹس سے مس نہ ہوئی۔ یہ پہلی بار تھی کہ کسی نے بچی کی خواہشات کی مزاحمت کی تھی۔ وِداد مسکراتی ہوئی اپنی نئی آیا پر جا پڑی اور کتاب سہام کے ہاتھوں سے جھپٹ لی۔ سہام کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ابھی ابھی کوئی بیش بہا چیز پالی ہو: اس نے وِداد کا اعتماد حاصل کرلیا تھا۔

Scanned with CamScanner

# 10

# سہام اور عازل

جب عازل خادموں کے کمرے میں تین ماہ گزار چکا تو میگیل نے اسے مہمانوں کے کمرے میں سونے کی دعوت دی جو راہداری میں اس کی خوابگاہ سے ذرا آگے تھا۔ دونوں کے تعلق میں سکون آ گیا تھا۔ عازل نے اپنے محسن کے کاروباری سفروں کے دوران متعدد بار اس کی رفاقت کی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ اس کا سامان اٹھاتا، باقی وقتوں میں آرٹ گیلری کی نگرانی کرتا، ٹیلیفون کے جواب دیتا، اور چھوٹے موٹے کام کرتا۔ دیدہ زیب کپڑے پہنتا، جن میں سے کئی میگیل کے اترے ہوئے ہوتے۔ اس طرح وہ کشمیر اون کے کوٹوں اور سویٹروں، درزی کی سلی ہوئی قمیصوں، اور انگلش جوتوں کے تعیش سے واقف ہوا۔ وہ میگیل کے روزمرہ میں اس طرح زندگی گزار رہا تھا جیسے کسی اور ہی آدمی کی جون میں ہو۔ زندگی میں پہلی بار اسے اطمینان اور فرحت محسوس ہو رہی تھی، اور وہ اپنے اہتمام پر بھی وقت صرف کرنے لگا تھا۔ میگیل نے اسے ورزش اور یوگا کی کلاسوں میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ عازل کسرت کرنے کے معاملے میں بڑا پرجوش تھا لیکن یوگا کے دوران اسے خاصی بے کیفی محسوس ہوتی۔ چنانچہ اس نے میگیل کو بتائے بغیر ان میں شرکت بند کر دی۔ سہام اکثر عازل کو فون کرتی۔ وہ چاہتی تھی کہ عازل مربیا اس سے ملنے آئے، کیونکہ وہ خود زیرِ نگرانی بچی کو چھوڑ کر نہیں آ سکتی تھی۔ بالآخر جب اس نے سہام سے جا کر ملنے کا فیصلہ کیا تو میگیل سے جھوٹ بولنا پڑا۔ اس نے یہ بہانہ بنایا کہ مالاگا میں اس کا چچا ہے جو بیمار ہے۔ اسی طرح اسے کچھ وقت کے لیے باہر جانے کی اجازت مل سکتی تھی۔ میگیل نے بس اتنا کہا: ”امید ہے کہ تم ان عورتوں میں سے کسی سے ملنے نہیں جا رہے ہو جو ہر وقت تمھارے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں!“

”کون سی عورتیں، موسیو میگیل؟“

”خبردار، مجھ سے جھوٹ نہ بولا کرو!“

”بخدا، میں جھوٹ نہیں بول رہا!“

Scanned with CamScanner

''جھوٹے ہمیشہ جھوٹ نہ بولنے کی قسمیں کھاتے ہیں!''

اِدھر سہام نے بھی کسی نہ کسی طرح غیتا سے آدھے دن کی چھٹی لے لی تھی۔

''وہ میرا منگیتر ہے، بارسیلونا میں کام کرتا ہے۔ سچ مچ بڑا اچھا آدمی ہے۔ مہذب، تعلیم یافتہ، سارے ہی گن ہیں اس میں۔ ہم دونوں ایک ہی شہر کے ہیں، ایک ہی محلے کے۔''

غیتا نے جواب میں کہا کہ سہام کی نجی زندگی اس کا اپنا معاملہ ہے؛ ضروری یہ ہے کہ اس سے وِداد سے اس کا تعلق متاثر نہ ہو۔

''بیگم صاحب، آپ اطمینان رکھیں۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔''

ان کی دوبارہ ملاقات مختصر لیکن بے حد پرجوش رہی: وہ ایک دوسرے کی خواہش میں بھڑک رہے تھے۔ مباشرت، شراب کی پوری بوتل، اور چند سگریٹوں کے بعد عادل نے اپنا اعتراف کیا۔

''میں میگیل کا عاشق بن گیا ہوں۔''

کافی دیر کے بعد، سہام نے، جس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا، پوچھا کہ کیا اس سے اسے لذت ملتی ہے۔

''کہہ نہیں سکتا۔ جب اس کے ساتھ جفتی کرتا ہوں پورے زور سے دھیان کسی عورت کی طرف لے جاتا ہوں — مثلاً تمھاری طرف۔ خیر چلو، اب تمھیں سب معلوم ہوگیا۔ میں تمھارے سامنے بالکل ننگا ہوگیا ہوں۔ اور اگر کسی دم میں نے شادی کی، تو تم ہی سے کروں گا، کیونکہ ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں، ایک دوسرے سے دل کی بات کرتے ہیں، پھر یہ بھی کہ مجھے تمھارے ساتھ ہمیشہ راحت محسوس ہوئی ہے۔''

''جانتے ہو، مجھے پہلے ہی اس کا شک تھا۔ اس کے بارے میں اور کچھ مت بتاؤ۔ اہم یہ ہے کہ ہم کو کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے ملتے رہنا چاہیے تاکہ سانس لے سکیں، دوبارہ اپنی توانائی حاصل کرسکیں، اور اپنا کام بہتر طور پر انجام دے سکیں۔''

عازل کو ندامت محسوس ہوئی۔ اس نے سہام سے وِداد کے بارے میں پوچھا۔

''میں خوش ہوں کہ اس کی دیکھ بھال کر رہی ہوں: کام ہی مجھے ولولہ اور تحریک دلاتا ہے، مجھے اس سے فائدہ پہنچا ہے۔ بڑا کٹھن کام ہے، ناگہانی باتوں اور تشدد سے پُر۔ لیکن یہ مشکلات میرا حوصلہ

بڑھاتی ہیں۔ بچی کے والدین نے مجھے پوری چھوٹ دے رکھی ہے۔ میں بچی کے لیے کوئی مثبت کام کر رہی ہوں جو بیچاری اتنے مصائب سے گزر رہی ہے۔ اس میں کسی کا قصور نہیں، وہ اسی معذوری کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی مجھے خدا کے وجود پر شک ہونے لگتا ہے ... سمجھو، یوں لگتا ہے جیسے یہ بچے دنیا میں لوگوں کے درمیان انکساری اور ایمانداری پھیلانے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اب میں نہ صرف روزی کما رہی ہوں اور اپنے گھر والوں کی کفالت کر رہی ہوں، بلکہ راہ راست پر بھی چل رہی ہوں۔ جب کبھی مجھے الحاج کی تقریبوں کا خیال آتا ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ یہاں کم از کم میں کارآمد تو ہوں۔ اگر میں وہاں ہوتی تو عین ممکن تھا بہت سی دوسری لڑکیوں کی طرح راہ سے بھٹک جاتی اور ان مذموم سلسلوں کا حصہ بن جاتی۔ ہاں، بالکل — لیکن تم سے ملاقات ہوئی اور میں تم سے محبت کرنے لگی۔ یہ زیادہ دیر قائم نہ رہی، لیکن شروع میں مَیں تمھاری گرویدہ تھی، آنکھوں میں صرف تمھی سمائے ہوئے تھے: تم لحاظ رکھتے تھے، توجہ دیتے تھے، ٹھیک ہے کہ تمھیں محبت نہ تھی، لیکن تم زیادہ وقت پاس تو رہتے تھے ... اور اب تم سے دوبارہ مل رہی ہوں تو مونچھیں رکھے ہوئے ہو!''

''اوہ یہ، یہ میکیل کے کہنے پر رکھی ہیں۔ بولا کہ مجھ پر خوب جچیں گی۔''

''اگر اس کا تعلق تمھارے کام سے ہے تو حرج نہیں ...''

''تم بڑی اچھی ہو! مجھے کتنی خواہش ہے کہ میں بھی چیزوں کو تمھاری جتنی صفائی اور وضاحت کے ساتھ دیکھ سکوں۔ میں اپنی ساری زندگی محبت میں گرفتار نہیں ہوا ہوں: یہ ایک طرح کی کمزوری ہے، اور یہی سبق مجھے پڑھایا گیا تھا — کہ محبت عورتوں کا دھندا ہے۔ مردوں کو طاقتور ہونا چاہیے، غیر متزلزل، تم جانو، وہی پامال، بوسیدہ فقرے۔ اب مجھے احساسِ جرم ہوتا ہے: دن میں اس آدمی کی خدمت کرتا ہوں، اور رات کو اسے لذت پہنچائی ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کب تک یہ ڈھرّا قائم رہے گا۔ تم سے اکثر ملتے رہنا بہت ضروری ہے — مجھے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ کہیں ایک دن خود اپنی شہوانیت پر شک نہ کرنے لگوں۔''

''پریشان مت ہو۔ زندگی میں جنس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ میرے لیے، سب سے پہلے، تم عازل ہو، وہ جس سے میں نے محبت کی ہے اور اب بھی کرتی ہوں۔ روزگار کے لیے تم جو بھی کرتے ہو، میں چاہتی ہوں کہ اس کے بارے میں کچھ نہ سوچوں۔''

ایک طویل ہم آغوشی کے بعد دونوں رخصت ہو گئے۔

اس شام عازل مالاگا کی باروں کا چکر لگانے نکلا۔ بعض ہم وطنوں سے ملاقات ہوئی، ان میں بہت سے غیر قانونی طور پر رہ رہے تھے۔ اس نے شراب کے چند جاموں سے ان کی تواضع کی۔ ایک نے اسے کچھ حشیش بھی پیش کی، ''خالص ریفی ہے۔'' عازل نے دو ایک دم لگائے، ایک افریقی کسبی کی پیش قدمی کو شائستگی سے رد کیا، ایک تیونسی اسے سیل فون یا طلائی گھڑی بیچنے کی نیت سے قریب آیا، جس پر عازل کو محسوس ہوا کہ واپس طنجہ پہنچ گیا ہے، 'بیتی سوکو' کی بھول بھلیوں میں۔ اسے بچوں کی آوازیں سنائی دیں جو ایک بیمار بلی کو عذاب دے رہے تھے، 'قصبہ' کی نالیوں سے آتی ہوئی کراہت انگیز بدبو سونگھائی دی، مغربی ٹیلی وژن پر سوٹ اور ٹائی ڈانٹے جوانوں کو ماؤفیت سے گاتے ہوئے دیکھا، سیاحوں کے ایک ریٹائرڈ گائیڈ کی جھلک نظر آئی جو اب بینائی کھو چکا تھا اور بیٹھا دودھ ڈلا قہوہ پی رہا تھا، ایک بھکارن کو دیکھا جو اپنے دو بچوں کو گھسیٹے لے جا رہی تھی، اور، سب سے بڑھ کر، خیال گزرا کہ اسے العافیہ اپنی لمبی سی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی سمیت، ڈھیلا ڈھالا سفید جلباب پہنے 'کیفے سنترال' کی ایک میز پر محمد لعربی کے ساتھ بیٹھا ہوا نظر آیا ہے۔ عازل کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی دام میں آ گیا ہے۔ نامعلوم لوگوں نے چہرے پر نقاب چڑھا کر اسے مغرب جانے والے ایک ٹرک میں ڈال دیا ہے۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، چیخ رہا ہے، لیکن کوئی اس کی مدد کو نہیں آ رہا۔ عازل ہذیانی کیفیت میں تھا۔ یقیناً یہ سب حشیش اور شراب کی کارفرمائی تھی: اسے مراکشیوں سے بھرے ہوئے اس محلے سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ اس نے ہوٹل واپس پہنچنے کے لیے ٹیکسی لی۔ کمرے میں آ کر اس کا جی چاہا کہ وطن کے نام اپنا خط جاری رکھے، لیکن اتنا نڈھال ہو گیا تھا کہ لکھنا دوبھر ہو گیا۔

اگلے دن، ریل گاڑی کے اسٹیشن جانے سے پہلے کہیں جا کر وہ اپنی کاپی کھولنے کے قابل ہوا۔

کیا میں نسل پرست ہوں؟ کیا آدمی خود اپنے لوگوں کے بارے میں نسل پرست ہو سکتا ہے؟ آخر یہ مراکشی کیوں میرے لیے اس قدر وبالِ جان بن جاتے ہیں؟ انھیں اپنی ذات سے محبت نہیں۔ تاہم کوئی ان کے ملک پر ذرا سی بھی تنقید کر دے تو یہ بھنا کے

Scanned with CamScanner

آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ میں ان سے کنی کاٹ جانے کو کیوں ترجیح دیتا ہوں؟ کیا اس طرح خود اپنے سے نہیں کترا رہا ہوتا ہوں؟ اپنے سے فرار نہیں کر رہا ہوتا ہوں؟ میں حالتِ فرار میں ہوں۔ اسے مشکل ہی سے کوئی معرکہ آرا بات کہا جا سکتا ہے۔ کل جن مراکشیوں سے ملاقات ہوئی تھی وہ مجھے شدت سے یاد دلاتے ہیں کہ میں کیا بن گیا ہوتا۔ ہوائی ڈینگیں مارتے ہیں، اور شہد سے خالی بوتل میں مکھیوں کی طرح اِدھر اُدھر بھنبھناتے پھرتے ہیں۔ وسعتِ خیال تقریباً ناپید ہے۔ تحقیر اور ہزیمتیں برداشت کرتے ہیں اور دال روٹی کے لیے کیسی کیسی چالیں چلتے ہیں۔ قابلِ افسوس لوگ۔ کڑی مشقت اور حاصل برائے نام۔ اس پر یہ شوق چرّاتا ہے کہ اپنے لیے اپنے قریے کے بازار 'جوطیہ' کی تخلیقِ نو کریں، دوبارہ ایک دوسرے سے گھال میل کریں، جبکہ حال یہ ہے کہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا یارا نہیں، لیکن کم از کم اس سے یہ خیال تو ہوتا ہے کہ اپنے قریے میں ہی زندہ ہیں، کہ محفوظ تو ہیں۔

میں شرمندہ ہوں۔ مجھے خود پر فخر نہیں۔ آہ، میرے پیارے وطن، کاش تو دیکھ سکتا کہ میری کیا گت بنی ہے! میں عذر تلاش کرتا پھرتا ہوں، اپنی برأت کا جواز۔ جب بھی میگیل مجھے چھوتا ہے، میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں، خود سے غائب ہو جاتا ہوں، اپنا جسم اس کے لیے چھوڑ کر: میں سیر کے لیے نکل جاتا ہوں، دکھاوا کرتا ہوں، سوانگ رچاتا ہوں، اور پھر بیدار ہو جاتا ہوں، کھڑا ہوتا ہوں، اور آئینے کا سامنا کرنے کی سکت نہیں پاتا۔ خود کو ذلت خوردہ محسوس کرتا ہوں۔

آہ، اگر ماں مجھے دیکھ لیتی . . . میں تو اس خیال کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے کیسے کہوں کہ اس کا بیٹا صرف عطّای ہے، امرد پرست، ایک مرد جو پیٹ کے بل رینگتا ہے، ایک گھٹیا طوائف ہے، اپنے تشخص کا مرتد ہے اور اپنی جنس کا؟ بہر کیف، وہ کوئی بے وقوف نہیں، یقیناً اس نے اپنے طور پر سب سمجھ لیا ہوگا۔ ٹھیک ہے، اس کا بیٹا قوی الباہ مرد جو ٹھہرا — وہ عورت کے ساتھ سوتا ہے اور مرد کے ساتھ بھی . . . ظاہر ہے ایسی باتوں کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

Scanned with CamScanner

پھر یہ کہ حق کی بات کہنی چاہیے: میگیل قابلِ تعریف آدمی ہے، شائستہ، اور توجہ دینے والا۔ وہ یقیناً دیکھ سکتا ہے کہ میں اس کے ساتھ ہمبستری میں راحت محسوس نہیں کرتا۔ کل پرسوں کی بات ہے، میرے کوٹ کی جیب میں چند کونڈوم پا کر وہ چراغ پا ہو گیا تھا۔ چلّانے لگا تھا: ''بہتر ہوگا کہ تم دوسرے مردوں کے ساتھ نہ جایا کرو! مجھے تقریباً یہ زیادہ پسند ہے— میں نے کہا 'تقریباً'— کہ تم کسی مرد کے بجائے کسی لحیم شحیم تھنوں والی گائے سے جنفتی کرو۔ میں یہ بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ سن رہے ہو؟ تم مراکشی، تم بڑی بڑی چھاتیوں کے متوالے ہو، تمھیں ابھی تک ماں کے پستانوں سے چمٹے رہنے کی حسرت ہے۔''

اور یہ اس سے اعتراف کرنے کا مناسب موقع تھا کہ میں سہام سے ملتا رہا ہوں، چھوٹی چھوٹی چھاتیوں والی سہام سے!

اس شام میگیل اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ باقی رہا میں، تو میں لونگ روم ہی میں سو رہا، ٹیلیوژن کے سامنے، ریموٹ کو ہاتھ میں بھینچے بھینچے۔

# 11

## محمد لعربی

محمد لعربی ایک کم آمیز اور خاموش طبیعت نوجوان تھا۔ اپنے گوشے میں تنہا بیٹھا بالآخر ملک سے کوچ اور اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ بیس سال پہلے اس کا خالو صادق بیلجیم مہاجرت کر گیا تھا اور وہاں ملازمت حاصل کر لی تھی، اور وعدہ کیا تھا کہ اپنے بھانجے کو بھی کسی دن وہیں بلوا لے گا۔ اب وہ برسلز کے شمالی محلّوں میں مسلمانوں کی جماعت کا سربراہ تھا۔ مراکشی مہاجر آبادی میں اپنے وسیع روابط کے طفیل وہ مراکش سے نکلنے کے ان سارے راستوں سے واقف تھا جو ممکن تھے یا جن کا کبھی تصور کیا جا سکے۔ جب صادق مراکش سے نکلا تو اس وقت بیس سال کا تھا، غیر معمولی طور پر محنتی اور کامیاب ہونے کا عزم کیے ہوئے تھا، لیکن ایسا کوئی خاص پابندِ شعائر مسلمان نہیں تھا۔ اب وہ اکثر دیکھتا

Scanned with CamScanner

کہ مہاجروں کے بچے بگڑ رہے ہیں، ماں باپ بے بس ہیں اور بچوں پر قابو نہیں رہا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بڑی بے جگری سے ایک ایسی ثقافت سے چمٹے ہوئے ہیں جو عام طور پر دو ایک اہم مذہبی تقریبوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، جیسے رمضان اور عیدین، اگرچہ اب بھیڑ کو غسلخانے کے ٹب یا گھر کے عقبی احاطے میں ذبح کرنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ہمسائے اور جانوروں کی سلامتی کی جماعتیں احتجاج کرتیں، اور حکومت مداخلت پر مجبور ہو جاتی۔ بھیڑیں اب مذبح خانوں سے سیدھی اَوَن میں جانے کے لیے تیار آنے لگی تھیں، یا کٹی کٹائی، جس سے عید اپنی اصلی معنویت اور روح سے بہت کچھ محروم ہو جاتی، لیکن متقی لوگوں کو جس طرح بھی ممکن ہو اس صورت حال سے سمجھوتہ کرنا ہی تھا۔ صادق پڑھ لکھ سکتا تھا، ایک دن اس کے جی میں آئی کہ ان تمام مثالی ثقافتی اشیا کی فہرست مرتب کرے جن کی روزمرہ کی زندگی میں ضرورت پڑتی تھی: جانماز، تسبیح، وضو کے لیے صیقل شدہ حجرِ اسود، اندلسی موسیقی، عب اور بَر بَر پاپ گانے، ادائے نماز کے لیے جلابیہ، جمعے کی نماز کے بعد کھانے کے لیے کسکس، مراکشی ٹیلیوژن دیکھنے کے لیے سیٹلائٹ ڈش، شہد والی پیسٹریاں، بھرت کی چائے دانی، پودینے کی چائے، پستہ قدمیز، لوبان، گلاب کا پانی، سرخ طربوش، پیلے بابوجان، گھڑی جس کے ڈائل پر کعبے کی تصویر بنی ہو . . .

پھر، یکلخت، وہ رک گیا تھا۔

''زبان!'' اس نے بہ آواز بلند کہا۔ ''ہم اپنے بچوں کے ساتھ کس زبان میں بولتے ہیں؟ آہ، ہماری عربی زبان، اپنے مقامی لہجے میں، وہاں کتنی مانوس لگتی ہے اور یہاں کتنی اجنبی . . . بگڑی عربی، اور اس میں بھی بری فرانسیسی ٹھنسی ہوئی!''

اس نتیجے پر پہنچ کر کہ اسے اور ہم وطنوں کو اسلامی کلچر ہی کی ضرورت ہے، اس نے بلدیہ کے اربابِ اقتدار کے ساتھ مسجد قائم کرنے کے لیے طویل اور مشقت طلب گفت و شنید شروع کی۔ صادق کی تین سال کی متواتر کوششوں کی بدولت مومنین کو مسلمانوں کی آبادی کے عین قلب میں عبادت گاہ بنانے کے لیے ایک واجبی لیکن مناسب جگہ پیش کر دی گئی۔ یہ 1990 کی دہائی کے اوائل کا ذکر ہے، ٹھیک اس وقت کا جب الجزائر کے باشندے ایک دوسرے کا کام تمام کرنا شروع کر رہے تھے۔

رہا محمد لعربی، تو اس نے بڑی رازداری سے اپنا ویزا حاصل کیا۔ عازل کی ایک مدت تک اس سے دوستی رہی تھی، اور ایک موقعے پر عازل کو، یہ محسوس کر کے کہ ایک عرصے سے اسے نہیں دیکھا،

Scanned with CamScanner

گمان ہوا کہ کہیں غائب تو نہیں ہو گیا، یا اپنا رہائشی محلہ اور یار دوست تو نہیں بدل لیے۔ لیکن محمد لعربی غائب نہیں ہوا تھا: وہ ایک بیکری میں کام کرنے لگا تھا اور اب صرف رات کو ہی نکلا کرتا تھا۔ اس کی ہیئت کذائی میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے اسے مشخص کیا جا سکے، نہ پستہ نہ دراز قد، غیر معمولی سیاہ آنکھوں اور کالے بھجنگ بشرے والا یہ آدمی جلد ہی بھلا دیا گیا تھا۔ عازل کو یہ ضرور یاد رہا کہ وہ بہت تیزی سے بولتا تھا اور پیتا تو جلد ہی بدمست ہو جاتا اور اول فول بکنے لگتا، مذہب کو صلواتیں سناتا، اور مقدس اور دنیوی باتوں کو خلط ملط کر دیتا۔ عازل کو خاص طور پر وہ شام یاد آئی جب محمد لعربی نے پوری کائنات کی خبر لے ڈالی تھی، خدا اور پیغمبروں کو کوسنے دیے تھے، راستہ چلنے والوں پر تھوک اچھالا تھا اور ان سے خواہ مخواہ جھگڑا ٹنٹا کرنے لگا تھا۔ وہ مضبوط آدمی تھا، اور اس کے ساتھیوں نے اسے قابو میں کرنے کی کوشش کی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس پر غیظ و غضب کے یہ دورے کیوں پڑتے ہیں، لیکن کوئی باریک بیں فوراً بھانپ لیتا کہ وہ نفسیاتی طور پر محور سے کھسکا ہوا ہے۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے محمد لعربی نے اپنا حلیہ اور رویہ بدل ڈالا: قہوہ خانے کے بجائے ہر روز مسجد جانے لگا، اور پاس پڑوس کے سارے یار دوستوں سے بولنا بند کر دیا۔ ایک روز جب اس کی کنزہ سے سڑک پر مڈبھیڑ ہو گئی تو وہ اسے گال پر دوستانہ بوسہ دینے بڑھی، جیسا کہ بچپن سے کرتی چلی آئی تھی جب دونوں ساتھ کھیلا کرتے تھے، لیکن اس نے اسے بڑی سختی سے دور کر دیا۔

"مجھ سے ہاتھ ملانا چاہتی ہو تو ہاتھ پر ٹشو لپیٹ لیا کرو، اور بہتر ہوگا کہ آئندہ مجھ سے بات نہ کیا کرو۔ یہ غیرت کا معاملہ ہے۔"

خیر، تو اس نے ویزا حاصل کیا اور اس کے بعد اپنے دوستوں کو کبھی نظر نہیں آیا۔

بیلجیم میں وارد ہوتے ہی اس کے چچا صادق نے اسے اپنی نگرانی میں لے لیا اور اپنے بنائے ہوئے مختصر سے گروہ میں شامل ہونے کی دعوت دی جو ہر شام قرآن کی تلاوت کرنے اور ایک مصری کا وعظ سننے کے لیے جمع ہوتے تھے جو خود کو 'عالم دین' کہتا تھا۔ ان مجلسوں کی فضا ماتمی سی ہوا کرتی تھی۔ خالو کی تلقین اور آموزش کے نتیجے میں محمد لعربی خاموش ہی رہتا، لیکن 'عالم' صاحب کی باتیں غور سے سنتا اور ان کے پند و نصائح کو پلو میں باندھ لیتا۔ ہر شام یہ لوگ ایک نئے موضوع پر اظہار خیال کرتے، مثلاً، مرد اور عورت کے تعلقات، عورت پر مرد کی مطلق برتری کیسے قائم رکھی جائے، مرد کی بالادستی کے

Scanned with CamScanner

انہدام کی بابت مغربی پروپیگنڈے کو کیسے شکست دی جائے، برائی میں پڑے بغیر ازدواجی فرائض کیسے انجام دیے جائیں، وغیرہ وغیرہ۔

'عالم' صاحب چبا چبا کر بات نہیں کرتے تھے بلکہ بڑی صراحت سے۔

''کبھی نہ بھولنا کہ عورتوں کے تریا چتر بڑے ہولناک ہوتے ہیں: خدا نے خود ہمیں ان سے آگاہ اور متنبہ کیا ہے۔ جان لو کہ شر عورت کے قلب اور جسم سے پھوٹتا ہے، لیکن خیر بھی ان میں جاگزیں ہونا جانتا ہے، جس کی مثال ہماری مائیں ہیں... کسب سے بڑھ کر اپنی بیٹیوں کے مستقبل پر توجہ دو، یہاں، اس عیسائی سرزمین میں۔ کیا چند دن پہلے اس ملک کی پولیس نے میرے دوستوں میں سے ایک کو، جو نیک آدمی ہے، یہ جاننے کے لیے طلب نہیں کیا تھا کہ اس نے اپنی سب سے بڑی نافرمان لڑکی کو کیوں زدوکوب کیا؟ وہ رات کو باہر جانا چاہتی تھی، میک اَپ تھوپ کر اور خدا جانے کیا کچھ کرنے کے لیے تیار! خدا کی پناہ! کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ یہاں ایک باپ کو اپنی بیٹی کی عفت کی حفاظت کرنے پر سزا دی جاتی ہے؟ مغرب روگی ہے، اور ہم نہیں چاہتے کہ اس کا چھوت ہمارے بچوں کو بھی لگ جائے۔ تمھیں ان قوانین کی خبر ہے جن کی رو سے مرد آپس میں شادی کر سکتے ہیں اور بچے گود لے سکتے ہیں؟ یہ معاشرہ اپنے ہوش وحواس کھوتا جا رہا ہے! چنانچہ تمھارے لیے یہ اور بھی ضروری ہے کہ اپنی اولاد کے بارے میں زیادہ چوکس رہو، خاص طور پر اپنی لڑکیوں کے بارے میں تاکہ وہ راہ راست سے بھٹک کر معصیت کی راہ پر نہ لگ جائیں۔ ذرا برسلز کی دیواروں پر نظر ڈالو: یہ اسے اشتہار بازی کہتے ہیں! نیم برہنہ لڑکیاں چوتڑوں کی نمائش کر کے اِس یا اُس کار کے گن گاتی ہیں! مرد عورتوں کی طرح بن ٹھن کر عطریات بیچتے ہیں! اس فسق و فجور سے، اس ترکِ اقدار سے، گھر والوں سے غفلت برتنے سے، اور بزرگوں کے عدم احترام سے ہمارا دور کا بھی تعلق نہیں۔ ہم یہاں ہیں تو اس لیے کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا: یہی خدا کی مرضی ہے، اور ہم خدا کے رحم و کرم پر ہیں، جو ہمیں دیکھ رہا ہے، ہماری آزمائش کر رہا ہے۔ تو کیا ہم اپنے بچے اس کافر معاشرے کے حوالے کر دیں؟ بس منھ میں انگلیاں دیے، کوئی تدارک کیے بغیر کھڑے رہیں؟ نہیں، میرے بھائیو، نہیں۔ ہم مسلمان ہیں، ذمے دار لوگ ہیں اور آپس میں متحد، ایک ہی گھر سے ہیں، ایک ہی امت سے، اور وہ 'امتِ اسلامیہ' ہے! کوئی بھی اس عظیم دارالاسلام سے نہیں نکل سکتا۔ ہم مسلمان پیدا ہوئے ہیں اور اپنے خالق کے پاس مسلمان ہی لوٹیں گے۔''

Scanned with CamScanner

'عالم' صاحب وہی سب دہرا رہے تھے جو دوسرے مہاجر قہوہ خانوں میں کہہ رہے تھے۔ ان کے وعظ میں کوئی بات بھی نئی نہیں تھی، اور اغلب ہے کہ محمد لعربی نے یہ سب پہلے سے سن رکھا تھا، حتیٰ کہ طنجہ میں، خاص طور پر گرمیوں میں جب مہاجر کنبے چھٹیاں گزارنے وہاں آتے تھے۔ یا شاید اسے صرف وہی گھمنڈی نوخیز یاد آ رہے تھے جو چھٹیاں منانے آئے ہوتے۔ اَن پڑھ، متشدد لونڈے جو نہ پوری طرح یورپی تھے نہ مراکشی، اور پرتعیش کاروں میں ہر طرف گھومتے پھرتے تھے۔ یہ آخری تفصیل اسے خاص طور پر کھلتی تھی۔ آخر یہ اتنا بہت سا پیسہ آتا کہاں سے ہے؟ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ کاریں تو صرف کیف اسمگل کرنے کا صلہ ہیں؛ دوسروں کا خیال تھا کہ یہ کرائے پر لی جاتی ہیں، صرف شیخی مارنے کے لیے۔ یہ سب کچھ خاصا مشتبہ معاملہ تھا اور مہاجرت کی کوئی خوش آئند صورت نہیں پیش کرتا تھا۔

محمد لعربی قرآن سے واقف تھا کیونکہ بچپن سے حفظ کر رکھا تھا۔ اگرچہ جو حفظ کیا تھا اس کے معنی نہیں جانتا تھا، آیات اسے ابھی تک یاد تھیں۔ برسلز میں، جہاں اس کے خالو نے اسے گھریلو استعمال کے آلات کے کل پرزوں کی دکان میں کام دلوا دیا تھا، اس نے پہلی بار قرآن کو سنجیدگی اور غائر نظر سے پڑھا۔ عالم صاحب نے اسے ایک نسخہ یہ کہہ کر دے دیا تھا کہ جب وہ اسے پورا پڑھ لے گا تو وہ اسے بعض سورتوں کی تفسیر بتائیں گے۔ اس درمیان میں محمد لعربی کو معلوم ہوا کہ عالم صاحب کی دو بیویاں ہیں، جو ایک ہی مکان میں رہتی ہیں۔ ایک دن، جمعے کی نماز کے بعد، عالم نے اسے اپنے گھر روایتی کسکس کھانے کے لیے مدعو کیا۔ جب محمد لعربی جوتے اتار رہا تھا اسے ایک حسین لڑکی کی جھلک نظر آئی جو پردے کے پیچھے سے اسے جھانک رہی تھی۔ یہ باپ کی توجہ میں نہ آیا اور اپنا وعظ کرتا رہا جیسے ابھی تک مسجد ہی میں ہو۔ بعد میں، جب محمد لعربی رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا، اسے اپنے داہنے پیر کے جوتے میں کوئی چیز تلوے میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی؛ اس نے مڑی تڑی سی پرچی نکال کر تیزی سے اپنی جیب میں ڈال لی۔ عالم کے پیٹھ پھیرنے کی دیر تھی کہ محمد لعربی نے پرچی کی سلوٹیں دور کیں اور پڑھا: ''سہ پہر مجھے پانچ اور چھ بجے کے درمیان اس نمبر پر فون کرنا۔ نادیہ، پردے کے پیچھے والی لڑکی۔''

اگرچہ محمد لعربی کے تجسس کو مہمیز لگی ہوئی تھی، وہ فون کرنے سے پہلے کافی دیر تک گومگو کی کیفیت میں رہا۔ بہت سی تخمینی صورتوں پر غور کرنے کے بعد پبلک فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔

Scanned with CamScanner

نادیہ نے جواب دیا اور سیدھی مطلب کی بات پر اتر آئی، بہت تیزی سے بول رہی تھی۔

''مجھے سزا دی جارہی ہے۔ والد نے مجھے گھر میں بند کر دیا ہے کیونکہ انھوں نے اسکول کے باہر مجھے ایک لڑکے سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہیں اور میرا خیال ہے کہ انھوں نے پرنسپل سے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھے اسکول سے اٹھا رہے ہیں۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو، مجھے بچا سکتے ہو؟ کسی سے کچھ کہنا نہیں، اور کوئی بہانہ نکال کر گھر آنا اور کہنا کہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی، لیکن اگر یہاں سے خلاصی کا یہی ایک چارہ ہے تو یوں ہی سہی۔ میں ساڑھے سترہ سال کی ہوں، میں اس گھر میں اب اور سانس نہیں لے سکتی: میرے والد دیوانے ہو گئے ہیں، میری تمام دوسری بہنوں کی ایسے آدمیوں سے شادیاں کر دی ہیں جو انھیں پسند نہ تھے، اور مجھے شبہ ہے کہ والد میری شادی کا بھی ایسا ہی انتظام کر رہے ہیں! اگر تم چاہو تو ہم دونوں ساتھ ساتھ فرار ہو سکتے ہیں۔ اب میں فون رکھ رہی ہوں۔ یہ میرے بڑے بھائی کا ہے جو اب مسجد سے واپس آتا ہی ہوگا، جہاں والد کے ساتھ گیا ہے۔ کیا تمھارے پاس فون نمبر ہے جہاں میں تمھیں کال کر سکوں؟''

''نہیں، میں پبلک فون سے بات کر رہا ہوں۔''

''مجھے جمعرات، دوپہر فون کرنا۔''

ایسا ہوا کہ بعد میں اسی ہفتے عالم نے محمد لعربی کو ایک سیل فون دیا، اس کے آنے والے مصری سفر کی تیاری کے لیے جہاں اسے دینیات پڑھنے بھیجا جارہا تھا۔ خالو نے کہا کہ یہ ایک بڑا نادر موقع ہے۔

''تمھیں عالم کا اعتماد حاصل ہو گیا ہے، سو اسے مایوس نہ کرنا۔ تم جیسے کوئی دس یا بارہ لڑکے قاہرہ جائیں گے، جہاں ہمارے دینی بھائی تمھاری مدد کریں گے۔ بڑا حسین شہر ہے، قاہرہ، تم دیکھو گے، اور بھائی بھی صالح لوگ ہیں، دیندار مسلمان ہیں اور فساد اور رذالت کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔''

محمد لعربی نے سب سے پہلے نادیہ کو فون کیا۔ فون عالم نے اٹھایا، اور نمبر پہچان لیا۔ اس نے کسی غصے کا اظہار نہیں کیا، کچھ کہا بھی نہیں، بس اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا اور اشاراتی زبان میں کچھ فون کیے۔ اس دن محمد لعربی کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ مصر سے اسے ایک پاکستانی تربیتی کیمپ بھیج دیا گیا اور وہ پھر کبھی دوبارہ نظر نہ آیا۔

Scanned with CamScanner

# 12

## ملیکہ

ننھی ملیکہ عازل کی پڑوسی تھی۔ ایک دن اس نے عازل کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور اس سے اپنی تعلیمی اسناد دکھانے کے لیے کہا تھا۔ اس عجیب وغریب درخواست پر متعجب ہو کر اس نے ملیکہ کو اندر بلالیا تھا اور لیموں کے شربت کا گلاس پیش کیا تھا۔ لونگ روم کی دیواروں پر اس کی قانون اور بین الاقوامی تعلقات کی پڑھائی مکمل کرنے کی دونوں اسناد ٹنگی ہوئی تھیں۔

''یہ رہیں،'' عازل نے کہا۔ ''رباط میں پانچ سال کی تعلیم۔ امید کے پانچ سال اور پھر، بدقسمتی۔ میری ماں کا فخر اور بڑی سے بڑی پریشانی۔ لیکن امید ہے کہ تم ہائی اسکول ضرور ختم کروگی، کم از کم، اور پھر یونیورسٹی جاؤ گی تاکہ اچھی سی ملازمت مل جائے۔ بعد میں کیا کرنا چاہو گی؟''

''یہاں سے رخصت ہونا۔''

''رخصت؟ لیکن یہ تو کوئی کام دھندا نہ ہوا!''

''ایک باریہاں سے نکل تو لوں، پھر کام دھندا بھی ہو جائے گا۔''

''کہاں جاؤ گی؟''

''کہیں بھی، مثلاً سمندر پار۔''

''اسپین؟''

''ہاں۔ اسپین، فرانس—— خوابوں میں تو پہلے سے فرانس میں رہ رہی ہوں۔''

''تمھیں پسند ہے؟''

''اس کا انحصار رات پر ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اصل میں اس کا انحصار بادلوں پر ہے: یہ میرے لیے وہ قالین ہیں جن پر میں رات کو سفر کرتی ہوں؛ کبھی کبھی ان سے گر پڑتی ہوں اور پھر جب جاگتی ہوں تو پیشانی پر چھوٹا سا گومڑ پڑا ہوتا ہے۔''

Scanned with CamScanner

''واہ، تم تو زبردست خواب دیکھتی ہو!''

''صرف خواب ہی نہیں۔ میرے پاس خیالات بھی ہیں، چلو منصوبے کہہ لو، دیکھتے رہو، ایک نہ ایک دن وہاں پہنچ ہی جاؤں گی۔''

عازل نے اسے ایک سیب دیا اور اس کے گھر پہنچا آیا۔ اس جی دار لڑکی کے پرجوش حوصلے کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔

اور اس جیسی لڑکیاں اسے ہر روز ہی نظر آتی تھیں۔ وہ انھیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گزرتے ہوئے دیکھتا تھا، حجاب لپیٹے ہوئے، پرسکوت، دلیر، جھینگا فیکٹری کی ٹھٹھری ہوئی فضا کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ۔

ملیکہ کے خواب میں بچپن کی مہک تھی۔ اسے طنجہ کے 'ابن بطوطہ اسکول' جانے کے لیے اپنے والدین سے باقاعدہ لڑنا پڑا تھا۔ وہ پیدل اسکول جاتی اور اکثر دیر سے پہنچتی۔ بس جاتی تھی لیکن اس کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔ وہ تیز رفتاری سے چلتی، سر جھکا کر، اور راستے میں جانے کیا کیا سوچتی رہتی کہ کبھی راہ سے بھٹک جاتی۔ اس کے قدم ہمیشہ ہی اسے 'شارع پاستور' پر لے آتے تھے جو 'الکسائی' ٹیرس پر آ کر ختم ہوتی تھی۔ یہاں سے بندرگاہ کا دلفریب، مشہورِ زمانہ منظر دکھائی دیتا تھا اور، جن دنوں مطلع ابر آلود نہ ہو، اسپینی ساحل بھی۔ ملیکہ آتے جاتے جہازوں کا نظارہ کرنے ٹھہر جاتی: اسے خاص طور پر سفید جہاز پسند تھے اور وہ دیر تک انھیں دیکھتی رہتی، اور آہستہ آہستہ بھول جاتی کہ کہاں ہے۔ پھر یکبارگی کسی راہگیر سے پوچھتی کہ کیا وقت ہوا ہے اور اسکول کی سمت دوڑ پڑتی۔

ملیکہ جماعت میں کبھی اچھے نمبر حاصل نہ کر سکی۔ گھر میں پڑھائی یا اسکول کا دیا ہوا کام کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ تھی۔ کبھی باہر جا کر بجلی کے کھمبے کی روشنی میں پڑھائی کرتی۔ جب کبھی وہ باپ کو وہاں نظر آتی تو وہ اسے بڑی درشتی سے گھسیٹ کر گھر میں لے آتا۔ وہ فحص کے علاقے کا ایک دہقان تھا جو 1986 کی خشک سالی کے نتیجے میں شہر چلا آیا تھا۔ تعمیرات کا کام کرتا تھا لیکن کمائی بہت کم ہوتی، اور اسے بیٹی کے اسکول جانے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے نزدیک لڑکیوں کو گھر میں بیٹھنا چاہیے تھا، اور ملیکہ کے لیے یہ بدرجہا بہتر تھا کہ کسی کے یہاں خادمہ بن جائے اور

Scanned with CamScanner

انتظار کرے یہاں تک کہ گھر والے اس کے لیے کوئی بَر تلاش کرلیں۔

جب ملیکہ چودہ سال کی ہوگئی تو باپ نے فیصلہ کرڈالا کہ لڑکی نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اسے اسکول سے اٹھالیا اور کہا کہ بہرصورت اس کا کوئی مصرف نہیں تھا۔

''عزالعرب کو دیکھو، للاّ زہرہ کا بیٹا، ہمارا پڑوسی: وہ ایک زمانے تک پڑھتا رہا، اور ماں نے اس کی پڑھائی مکمل کرلینے کے لیے کیا کیا قربانیاں نہ دیں۔ اس کے پاس اسناد ہیں، اہم اسناد، اور جانتی ہو، یہ اس کی کوئی مدد نہیں کررہیں۔ تم انھیں ان کے لونگ روم میں دیکھ چکی ہو، جس طرح میں نے دیکھا تھا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ہر جگہ کام تلاش کرتا پھرتا ہے، اسے کچھ ملتا ملاتا نہیں، تو تمھیں کیا ملے گا، ایک لڑکی کو؟ —— سو خبردار جو میری مخالفت کی!''

اپنی سہیلی عشوشہ، پڑوسی خاتون حفصہ، چچازاد بہن فاطمہ، اور آس پڑوس کی سینکڑوں لڑکیوں کی طرح، ملیکہ بھی بندرگاہ کے آزاد منطقے کی ولندیزی فیکٹری میں جھینگوں کے خول اتارنے جاتی۔ ریفریجریٹڈ ٹرک روزانہ ٹنوں پکے ہوئے جھینگے لاتے، جنھیں تھائی لینڈ میں پکڑا گیا ہوتا اور ہالینڈ میں محفوظ کرنے والے مادے میں بسا کر یہاں بھیجا جاتا۔ فیکٹری میں سبک سی انگلیوں والے چھوٹے چھوٹے ہاتھ دن رات ان کے چھلکے اتارتے رہتے جس کے بعد یہ جھینگے ایک اور منزل کا سفر کرتے۔ یہاں انھیں ٹین کے ڈبوں میں بند کرکے بالآخر یورپی مارکیٹوں میں بیچنے کے لیے بھیج دیا جاتا۔ طنجہ میں ان لڑکیوں کو برائے نام محنتانہ ملتا۔ بے حد بلند عزم رکھنے والیوں میں بھی کم ہی ایسی تھیں جو دن بھر میں دس پاؤنڈ سے زیادہ جھینگوں کے خول اتار سکیں۔ ملکیہ، بہرحال، کبھی اس سطح تک نہ پہنچ سکی اور شام کو زیادہ سے زیادہ پچاس درہم لے کر گھر لوٹتی، جو وہ سیدھے ماں کو دے دیتی۔ وہ سرد فضا کی مسلسل شکایت کرتی اور اس کی انگلیاں تقریباً شل ہو کر رہ گئی تھیں۔

فیکٹری میں اسے اپنے اسکول کے دن اور وہ بھاگم بھاگ ٹیرس پر پہنچ کر سمندر کا نظارہ کرنا بری طرح یاد آتا۔ کام کے دوران وہ بمشکل ہی کبھی اپنا سر اٹھاتی۔ کسی خودکار مشینی آدمی کی طرح حرکت کرتی، اور ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتی۔ گھر کے راستے میں اب وہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں لیتی تھی، تاہم جب کبھی اپنے اسکول کے پاس سے گزر ہوتا تو اسے شدت سے خیال آتا کہ وہ کیا بن سکتی تھی۔

Scanned with CamScanner

لیکن یہاں سے رخصت ہونے کا خواب، کام کرنے اور روزی کمانے کا خواب ایک بے رحم مذاق بن کر رہ گیا تھا: اس کی کمر درد کرنے لگی تھی، اور انگلیاں، گلابی اور خستہ حال، اب ان جھینگوں کی طرح نظر آنے لگی تھیں جن کو وہ سارا دن بیٹھی چھیلا کرتی تھی۔

ملیکہ کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ فیکٹری میں زیادہ دنوں پنپ نہ سکے گی۔ انگلیوں میں خارش ہو جانے کے سبب لڑکیاں مسلسل چھ ماہ کے اندر ہی وہاں سے چل دیتیں، اور بعض کو تو نمونیہ بھی ہو جاتا۔

ملیکہ کو کمزور اور بیمار پا کر اس کی سب سے بڑی بہن، زینب، اسے اپنے گھر لے آئی تا کہ اس کی دیکھ بھال کر سکے۔ ملیکہ اپنے خواب سے دستبردار نہیں ہوئی تھی، لیکن اپنی بہن کو بتانے کی جرأت نہ کر سکی، بس کسی عزیز شے کی طرح دل سے لگائے رہی۔ اسے کامل یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ بحری جہاز میں ہو گی جو اسے الجسیر اس یا طریفہ لے جا رہا ہو گا۔ وہ اسپین اترے گی، اور وہاں کوئی ملازمت ڈھونڈ نکالے گی۔ مثلاً 'ال کورتے انگلیس' میں سیلز وومن کی۔ اس نے ڈپارٹمنٹ اسٹورز کی اس چین کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ یا پھر آرائش گیسو کرنے والی بنے گی، یا شاید ایک ماڈل (جس کا تصور کرنے کی وہ کبھی جرأت بھی نہیں کر پائی): اس طرح اسے رنگ برنگے دیدہ زیب لباس پہننے کو ملیں گے، اس کی تصویریں اتاری جائیں گی، اور وہ حسین و جمیل بن جائے گی۔ پاسپورٹ حاصل کرنے کے لیے وہ پہلے اٹھارہ سال کی ہو جانے کا انتظار کرے گی۔ یا شاید، بہت سے دوسروں کی طرح، اسے اتنا لمبا انتظار نہ کرنا پڑے۔ وہ کسی پرانے دھرانے ٹب میں بیٹھ کر تنگنائے عبور کرے گی یا جھینگوں کے کسی ٹرک کے عقبی حصے میں...

زینب کا شوہر مچھیرا تھا، رحمدل اور مستقیم۔ مسلمان طرز کی ڈاڑھی رکھتا تھا، اور پنج وقتہ نمازی تھا۔ اسے یہ دیکھ کر شدید رنج ہوا کہ فیکٹری کس بری طرح ملیکہ کا استحصال کر رہی ہے، اور اس نے بڑی خندہ پیشانی سے ملیکہ کو گھر میں خوش آمدید کہا۔ جھینگے صاف کرتے وقت ملیکہ صفائی ستھرائی کی پابندی کی خاطر سر پر رومال باندھ لیا کرتی تھی؛ اب بہن کے گھر پر اپنے متقی بہنوئی کی رضا جوئی کے لیے باندھنے لگی۔ وہ کسی قسم کی مشکل نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی، پھر یہ بھی تھا کہ بہن اس کے ساتھ اپنی اولاد کی طرح پیش آ رہی تھی۔ ملیکہ بچوں کی دیکھ بھال میں بہن کی مدد کرتی، لیکن اس تمام عرصے میں اپنے خفیہ خواب کی آبیاری بھی کرتی رہتی۔ اسے جلد اندازہ ہو گیا کہ مچھیرا اسپینیوں کی طرف مائل

نہیں تھا۔ وہ انھیں 'موروں'[6] سے تعصب برتنے، اور مراکش کے ساحلوں کو غیر قانونی جالوں سے مچھلیاں پکڑ کر لوٹنے کا الزام دیتا۔ اس کا کبھی اسپین جانا نہیں ہوا تھا، لیکن یہ سب اس نے اپنے بھائی سے سن رکھا تھا، جو الاندلسیہ کے صوبے 'اسخیدو' میں برسرِ روزگار تھا۔

خیر، چودہ سالہ ہونے کے سبب ملیکہ فی الحال کہیں نہیں جا رہی تھی، تاہم اس نے ایک سیڑھی ضرور دریافت کر لی تھی جو نیلگوں آسمان تک جاتی تھی۔ وہ دبے قدموں سے اس پر چڑھتی، اپنے بہنوئی کے شک و شبے کو ابھارے بغیر، تاکہ چند لمحوں کے لیے فرار ہو کر اس چھوٹی سی ٹیرس پر جا سکے جہاں وہ بالکل تنہا ہوتی اور آنکھیں بند کر لیتی۔ وہ سر سے رومال کھول دیتی اور ہوا کو بالوں سے اٹکھیلیاں کرنے دیتی، اور اپنے خیالات کو جتنی دور ممکن تھا خود کو لے جانے دیتی، بنا کوشش کے، منھ سے کوئی لفظ یا آواز نکالے بغیر۔ شادمانی اس پر چھا جاتی، وہ شفاف نیلگونی کے سمندر پر منڈلاتی رہتی۔

زیادہ سے زیادہ جھینگے چھیلنے کے نتیجے میں اس کی انگلیاں بالکل شفاف ہو گئی تھیں۔ ملیکہ کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں جاتی نہ رہیں، کہ کہیں خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ نہ جائیں۔ وہ انھیں موڑ سکتی تھی، لیکن اس سے بہت درد ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ ہوا کے ساتھ تیرنے نکلتی تو سارا درد معدوم ہو جاتا۔ اکثر فضا میں اس کی دوسرے بچوں سے مڈبھیڑ ہوتی، ہر ایک سفید کپڑے میں لپٹا ہوا ہوتا۔ وہ سب کہیں رخصت ہو رہے ہوتے، تھوڑے سے گم گشتہ دکھائی دیتے، لیکن پرسکون۔ اسے ایک بار بتایا گیا تھا کہ جب بچے مر جاتے ہیں تو فرشتے بن کر سیدھے جنت میں چلے جاتے ہیں۔ ملیکہ کو ابھی ابھی معلوم ہوا تھا کہ جنت کا راستہ ٹیرس سے ہو کر جاتا ہے۔

اُس پہلے دن جب وہ بلندیوں سے اتر کر واپس اپنے کمرے میں پہنچی تو شک کی ایک ٹیس سی اٹھی: فرشتے اسپین نہیں جا رہے تھے، بلکہ مخالف سمت میں رواں تھے، اندرونِ مراکش کی طرف۔

اس نے اپنے سے وعدہ کیا کہ اگلی بار وہ فرشتوں کے راستے کی ٹھیک تصدیق کرے گی۔

اس نے پوری رات کھانستے اور بخار سے کپکپاتے ہوئے گزاری۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں تھی جو وہ بیمار پڑی تھی۔ ساری 'جھینگوں والی لڑکیوں' کو اس کا سامنا ہوا تھا۔ اس کے ناتواں جسم اور کمزور صحت

---

6۔ The Moor یہ لفظ شمالی افریقہ کے بربر، افریقی، اور عرب باشندوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس میں اہانت کا پہلو بھی ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

پر بڑا بار آ پڑا تھا، اور مزاحمت کرنے کے لیے، بھول جانے کے لیے، اسے سیڑھی کا خیال آیا اور آسمان کی شفاف نیلگونی کا۔ اس رات، اپنی باری میں، اس نے خود کو سفید کپڑے میں لپٹا ہوا سطح آب پر بہتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہڑبڑا کر جگ پڑی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بہن نے اسے اپنی آغوش میں بھر کر اسپرین کی ایک ٹکیا دی۔

# 13

## سُمیّہ

عازل نے عزم کیا کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور چکلے جایا کرے گا۔ یہ اس کے لیے ایک اہم فیصلہ تھا۔ وہ میگیل کے ساتھ سوتا لیکن اس کی اپنی خواہش صرف عورتوں ہی سے آسودہ ہوتی۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ سہام کو بمشکل ہی فرصت ملتی ہے، عازل کو محسوس ہوا کہ اسے اپنی جنسی شہوت کو برقرار رکھنے کے لیے ان شمالی افریقی عرب لڑکیوں سے تعلقات رکھنا ضروری ہے جن سے وہ 'قصبہ' نامی قہوہ خانے میں ملا تھا۔ یہ ایک بیسترو[7] تھا جس میں سگریٹوں اور سستی شراب کی بو بسی ہوتی۔ اس میں زیادہ تر مراکشی ہی آتے تھے، اور یہ ایسی جگہ تھی جہاں مشکل میں آئی ہوئی لڑکیوں کو پناہ مل جاتی تھی۔ اس کا مالک، جو فرانکو سے اپنی مشابہت کے باعث 'ایل کودیو'[8] کہلاتا تھا، 'نادور' کا رہنے والا سابق چرواہا تھا۔ اس نے ایک اسپینی عورت سے شادی کر لی تھی اور اس کے بعد کبھی بھولے سے بھی مراکش میں واپس قدم نہیں رکھا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اسے اپنے وطن کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی؛ اس کا بچپن ناخوشی اور مشقت میں گزرا تھا، اور اس نے اپنی ساری جوانی ریف اور اطلس کے پہاڑوں کے درمیان چھوٹی موٹی اسمگلنگ میں گزاری تھی۔ بہرکیف، اس نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ 'مراکش کی ساختہ مسرت' میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

---

7۔ bistro: چھوٹا سا ریستوراں۔

8۔ کودیو: جنگجو عسکری سردار، آمر اور وارلارڈ کے لیے اسپینی اور پرتگالی زبان میں caudillo کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

اس سے جب بھی اپنے ملک کا وصف بیان کرنے کے لیے کہا جاتا تو کچھ عمومی سے مشاہدات کا ذکر کرتا جن میں کہیں کہیں چند داخلی حقائق کی آمیزش ہوتی: مراکش میں تمھیں وہی سب کرنا پڑتا ہے جو دوسرے کرتے ہیں: عید الکبیر پر خود اپنے ہاتھوں سے بھیڑ کو ذبح کرنا؛ باکرہ سے شادی کرنا؛ گھنٹوں قہوہ خانے میں بیٹھ کر لوگوں کی غیبتیں کرنا (یا بہت ہوا تو تازہ ترین جرمن کاروں کی قیمتوں کا موازنہ کرنا)؛ ٹی وی پروگراموں پر گفتگو کرنا؛ رمضان شروع ہونے سے تین دن پہلے سے ختم ہونے کے تین بعد تک شراب نہ پینا؛ زمین پر بار بار تھوکنا؛ دھکم پیل کر کے لوگوں سے آگے نکلنا؛ ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا؛ ''ہاں'' کہنا جبکہ منشا ''نہ'' ہو؛ ہر جملے میں ''ما کاین مشکل'' (کوئی مشکل نہیں) ٹانک دینا؛ اور دوستوں کے ساتھ چند بیئر پی کر گھر لوٹنا اور کھانے کی میز پر جم کر خوب ٹھسائی کرنا، اتنی کہ پیٹ سور کی طرح پھول جائے۔ اور یہ سور دن کو خاتمے تک پہنچانے کے لیے جا کر بستر میں جالیٹتا اور انتظار کرنے لگتا کہ بیوی کام نمٹا کر آئے تو اس میں دخول کرے، لیکن اگر اسے باورچی خانے میں دیر ہو جاتی تو سو جاتا اور خراٹے لینے لگتا۔

عازل 'ایل کو دیتو' کو پسند کرتا تھا، خاص طور پر اس لیے کہ اس شخص نے اس سے کبھی اس کی زندگی، اس کے ماضی، اور وطن کی بابت کوئی کرید نہیں کی تھی۔ سمیّہ سے اس کی ملاقات ایل کو دیتو کے یہاں ہی ہوئی تھی۔ وہ 'وَجدہ' سے اپنے شوہر کے ساتھ اسپین آئی تھی، جو اسے قلاش چھوڑ کر چلتا بنا تھا— یہ وہ کہانی تھی جو وہ جھٹ سنا دیا کرتی لیکن سبھی کو شبہ تھا کہ اس کے بعض پہلو زیبِ داستاں کے لیے بڑھا چڑھا دیے گئے ہیں۔ حقیقت اتنی رومان پرور نہیں تھی۔ ایک کویتی عاشق نے اسے بڑے بڑے سبز باغ دکھائے تھے، شادی اور پر تعیش زندگی کے وعدے کیے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ اسپین چلے آئے تھے اور یہاں ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ ایک شام کویتی نے سمیّہ کو بتائے بغیر کمرے کا اگلے ایک ماہ تک کا بل ادا کیا، اس کے لیے اچھی خاصی رقم چھوڑی، اور چپ چپاتے کویت میں اپنے مختصر سے کنبے کے پاس لوٹ گیا۔ ظاہر ہے، زیادہ دیر نہیں لگی کہ سمیّہ بالکل قلاش ہو گئی۔ مراکش لوٹنے کے بجائے اس نے خود کو عیاشی کی سہل انگار زندگی میں بہہ جانے دیا۔ سو اس طرح، جب سمجھ میں نہیں آیا کہ اور کہاں جائے، وہ ایک شام بہتی بہاتی 'قصبہ' پہنچ گئی۔ ایل کو دیو کی بیوی نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور باورچی خانے میں کام پر لگا دیا۔

Scanned with CamScanner

عازل نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کی داشتہ بن جائے گی۔ اس کے مردوں کی طرف دیکھنے کے انداز میں حقیقی دعوتِ عشق چھپی بیٹھی تھی۔ جب سے اس نے ایل کو دیتو کے یہاں کام شروع کیا تھا، اس کے حالات کسی قدر سلجھ گئے تھے۔ اس کے بنائے ہوئے مراکشی پکوان کافی مقبول ہو گئے تھے۔ وہ ایک پرانی سی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی سب سے اوپری منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتی تھی جو 'قصبہ' قہوہ خانے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ کبھی کبھار وہ اپنی بدقسمتی پر رو بھی لیتی۔ اسے اپنے وطن کی یاد بہت ستاتی تھی، لیکن گھر واپس جانے سے پہلے کچھ پیسہ کما لینا ضروری تھا۔ وہ جب بھی اپنے گھر والوں کو فون کرتی تو اپنے کویتی شوہر سلیم کے بارے میں بتاتی کہ کسی تجارتی دورے پر گیا ہوا ہے، اور یہ کہ وہ جلد ہی ان سے ملنے آئے گی۔

ایک شام جب گھر کی یاد بہت دل دکھا رہی تھی، عازل نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا اور تسلی دی، اور اس کے کانوں میں ایک مقبولِ عام چلبلا سا مختصر گیت گنگنانے لگا جس سے ہنسی کے مارے اس کے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ اس نے کچھ شرما اور کچھ جھینپ کر اسے رازداری سے بتایا:

"مجھے کبھی یہ سان گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دن میں کسی ریستوراں کے باورچی خانے میں یوں اپنی ہنڈیاں پلوا رہی ہوں گی۔ اگر میرے والدین مجھے اس حال میں دیکھ لیں تو ان کے ہوش اڑ جائیں۔ میرا باپ طنجہ کی ضلعی انتظامیہ کا ایک اہم افسر ہے، اور میری ماں ایک پرائیویٹ اسکول میں عربی پڑھاتی ہے۔ انھوں نے اپنے لاڈ پیار سے مجھے بگاڑ دیا تھا۔ مجھے اپنے بدن کی گولائیاں اسی سے حاصل ہوئی ہیں . . . مردوں کو بھرے بھرے بدن پسند آتے ہیں۔ سلیم تو میرا دیوانہ تھا، وہ میرے سامنے دوزانو ہو کر کہتا، 'تمھاری خواہش میرے لیے حکم ہے!' وہ مجھے چاہتا تھا، لیکن اس پر ذمے داریاں تھیں، اور اس خطے کے مرد آزاد کہاں ہوتے ہیں؟ مجھے اس کی بابت پہلے ہی متنبہ کر دیا گیا تھا۔ یہ لوگ مراکش آتے ہیں، مال دولت سے خوب عیش کرتے ہیں، اور پھر ڈھیر سارے وعدے کر کے رفوچکر ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود، میری ایک دوست ہے، وفا، جو کسی نہ کسی طرح ایک سعودی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ وہیں رہتی ہے؛ مجھے پتا نہیں کہ خوش ہے یا ناخوش، لیکن یقیناً اسے کسی اسپینی بار کے باورچی خانے میں کام نہیں کرنا پڑتا ہوگا۔ وہ کبھی واپس مراکش بھی نہیں آئی، اور اس کے والدین کو اب تک ویزا ہی نہیں ملا کہ جا کر اس سے مل سکیں۔ ہو سکتا

Scanned with CamScanner

ہے وہ مر گئی ہو، یا ان بڑے بڑے محلوں میں سے کسی میں قید کردی گئی ہو جن کے دروازوں پر پہرے دار لگے ہوتے ہیں۔۔۔''

''تم کتنی رحمدل ہو!'' عازل نے آہ بھر کر کہا۔ ''میرا مطلب ہے، تم میں بھلائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے!''

''اور میں بستر میں بھی بھلی ہوں! تم جانو، کسی مراکشی سے یوں کھل کر باتیں کرنا بڑی نادر بات ہے۔ لیکن تمھارے ساتھ مجھے اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ، مردوں سے محبت کرنے پر لوگ اس قدر ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہیں؟ لوگ اکثر مردوں سے اپنی محبت کا اظہار کرنے پر میری مذمت کرتے ہیں۔ لیکن میں اپنے محسوسات چھپا نہیں سکتی۔ جب مجھے کوئی مرد اچھا لگتا ہے تو میں یہ اس پر ظاہر کر دیتی ہوں۔ اس میں کیا برائی ہے؟''

تنگ سے بستر میں جفتی کرنے کے لیے کسی بازی گر کی مہارت ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ سمیّہ اور عازل دونوں فرش پر گر پڑے، اس پر ہنستے ہوئے کہ انھیں کتنا پیچیدہ آسن اختیار کرنا پڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، اور انھوں نے یہ بتا بھی دیا۔ سمیّہ باورچی خانے کی بوؤں کو دبانے کے لیے بڑی تیز خوشبو استعمال کرتی تھی۔ خواہ وہ کتنی ہی بار کیوں نہ نہالے، کلونوں میں جسم کو بسالے، یہ بوئیں جوں کی توں چمٹی ہی رہتیں۔ کوئی کوشش بارآور نہ ہوتی۔ عازل کا دل نہ ہوا کہ اس کا ذکر کرے۔

## 14

## عازل

''اگلی بار جب اپنی رنڈی کے پاس جاؤ تو مجھے بتا کر جانا۔ میں خوشبو کی بوتل خرید دوں گا، میری طرف سے اسے پیش کر دینا۔''

میگیل غصے میں تو نہیں تھا، بس ان صاف نظر آنے والی علامات سے کہ اس کا عاشق بھٹکنے لگا ہے، کچھ بددل سا ہو گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

عازل نے کوئی جواب دیے بغیر سر جھکا لیا، پھر غسلخانے میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے پتا تھا کہ آج رات اسے اپنے کمرے میں سونا پڑے گا۔ حقیقت میں اسے دوبارہ تنہا ہونے کا کوئی غم بھی نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایک نہ ایک روز اسے میگیل کو چھوڑنا ہی پڑے گا، اگرچہ یہ منزل ابھی دور تھی۔ پھر ایک بات اور بھی تھی: اس کی ماں اور بہن اِدھر مسلسل اس کا پیچھا کر رہی تھیں، ہفتے میں کئی بار فون کرتیں۔ ماں اس سے گنگناتی آواز میں بولتی، جو گداز اور تڑپ سے بھری ہوتی۔

''کیسے ہو، میرے لعل؟ امید ہے کہ تمھیں ضرورت کی ہر شے میسر ہو گی۔ اچھی طرح کھاتو رہے ہو نا؟ بتاؤ، سارا دن کیا کرتے ہو؟ مجھے کبھی کبھار یاد تو کر لیتے ہو نا؟ میں تمھیں دوبارہ دیکھنے کی کتنی مشتاق ہوں! میں تمھیں اپنی دعائیں بھیجے بغیر کبھی نہیں سوتی۔ تم جانو، خدا میری سنتا ہے! کیا تم نے کنزہ کے لیے وہ کیا جو میں نے آخری بار تم سے کہا تھا؟ کیا تم نے اُس سے بات کی، عیسائی سے؟ وہ کتنا رحمدل ہے، کتنا فیاض، وہ یہ احسان کرنے سے انکار نہیں کرے گا، ٹھیک ہے نا؟ اچھا، یہ رہی کنزہ، اس سے بات کرو۔ میں تمھیں اپنے سینے سے لگاتی ہوں، میرے پیارے بچے۔''

کنزہ سیدھی مطلب کی بات پر اتر آئی۔

''تم نے اس سے پوچھا؟''

''ابھی نہیں۔''

''دیکھو، میرے لیے جاننا ضروری ہے! آخر تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے، دیکھو. . . ''

''تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ اس انتظار میں ہو کہ جب اس کے دل سے تمھاری محبت اتر جائے تب پوچھو؟ جب محبت کرنے کے لیے اسے کوئی دوسرا مل جائے تب، کوئی دوسرا جو تم سے زیادہ خوبصورت ہو، زیادہ ذہین ہو، زیادہ زیرک؟''

''میں جلد ہی تمھیں فون کروں گا۔ وعدہ رہا۔''

اس معاملے میں عازل کا دماغ بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ میگیل سے بات چھیڑنے سے قبل وہ چاہتا تھا کہ کم از کم ان کی ملاقات کی سالگرہ آنے تک انتظار کر لے۔ عازل نے تجویز پیش کی کہ صرف

Scanned with CamScanner

دوستوں کے واسطے ایک تقریب منائی جائے، اور میگیل کو یہ خیال بھا گیا۔ اداس وقتوں کو بھلا دینے کے لیے تقریب، چند لوگوں سے دوبارہ ملنا جلنا، یہ یقین کرنا کہ محبت تمام دوسری چیزوں سے قوی تر ہے: ہاں، کیوں نہیں؟

جہاں تک میگیل کا تعلق تھا، وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ عازل کو اس سے محبت نہیں، کہ وہ زیادہ تر موقعے سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ظاہر ہے، اب بات اتنی سیدھی سادی بھی نہیں تھی۔ ان کے درمیان حقیقی چاہ کے نایاب لمحے بھی آئے تھے، جب انھوں نے بے حد قربت محسوس کی تھی، تاہم عازل ہمیشہ ہی خود کو پوری طرح دینے سے باز رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کو قابو میں رکھے ہوتا، جیسے اپنی خواہش کی لہروں سے خائف ہو، اور جفتی کے دوران برجستگی سے عاجز۔ اس کے برخلاف جب عورتوں کے ساتھ ہوتا تو جنسی فعل کے ساتھ لگاؤ کی باتیں بھی ہوتیں۔ میگیل کے ساتھ، عازل آنکھیں بند کر لیتا اور منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکالتا۔

میگیل نے عازل اور اپنے درمیان عمر اور ثقافت کے فرق کو کبھی کوئی مسئلہ نہیں سمجھا تھا۔ عازل اسے ایک گم گشتہ نوجوان معلوم ہوتا تھا، جس کا مقدر طنجہ کے نتھو خیروں میں اول آخر ضم ہو جانا تھا، اپنی ساری اسناد اور تیز ذہانت کے باوجود۔ یہ لڑکا بیک وقت اتنا ہی پُرکشش تھا جتنا اشتعال انگیز، متضاد باتوں کا بے ترتیب مجموعہ، اس پر اس کا سہل انگار زندگی گزارنے اور کاہلی کا واضح میلان مستزاد۔ میگیل کا اکثر جی کرتا کہ اسے اس کے خوابِ گراں سے جھنجھوڑ کر جگا دے، کہے کہ جو اس کے ساتھ پیش آ رہا ہے اس میں زیادہ دلچسپی لے۔ وہ کتنا چاہتا تھا کہ اس کے عاشق کی شخصیت بدل جائے، کہ وہ اعتماد سے امور کی زمام سنبھالے، بالکل جس طرح خود اس نے عازل کی سی عمر میں کیا تھا، لیکن میگیل کی یہ کوشش بھی تھی کہ موازنہ کرنے سے باز رہے۔ زندگی اب اور بھی زیادہ جاں گسل ہو گئی تھی، آدمی سے جنگِ پیہم کی طلبگار تھی؛ کوئی چیز بھی ہمیشہ کے لیے نہ حاصل ہوتی تھی نہ ملے، چاہے آدمی جنسیت کے حاشیے پر ہو یا فرانکو کے کیتھولک بیٹی بورژوا حامیوں میں سے کسی کا سپوت۔

عازل کا گیلری کے معاملات سے نمٹنے کا انداز کافی ناہموار تھا۔ لیکن اس نے اپنے آقا کو اپنی غیر معمولی تیز کاروباری حس اور لوگوں سے معاملہ فہمی کی مہارت سے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ گاہکوں کا دل موہ

Scanned with CamScanner

لیتا، اپنی مشرقی کشش کو بروئے کار لاتا، ساتھ ہی ساتھ مغربی کارکردگی پر بھی تکیہ کرتا جو اس نے میگیل کے طور وطریق کے مشاہدے سے اچک لی تھی۔ تاہم بعض اوقات وہ پٹری سے اتر جاتا، بغیر پیشگی خبردار کیے کئی کئی دن کے لیے غائب ہو جاتا، اور جب واپس آتا تو گندی سندی حالت میں، ڈاڑھی بڑھی ہوئی، چہرے پر اداسی پُتی ہوئی، حتیٰ کہ میگیل سے اپنے طرزِ عمل کی وضاحت تک اپنی شان کے خلاف سمجھتا۔ میگیل تلخی لیکن بے بسی سے گلہ شکوہ کرتا۔ میگیل کو یقین ہوتا جارہا تھا کہ عازل کسی منشیات کا دھندا کرنے والے یا دلال کے چنگل میں آگیا ہے — لیکن اس معاملے میں وہ سو فیصد غلطی پر تھا۔
جب عازل نظروں سے اوجھل ہوتا تو سمیّہ میں پناہ ڈھونڈنے کے لیے، جس کے ساتھ اسے ایسی شہوت انگیز لذتوں کا تجربہ ہو رہا تھا جنھیں سہام کے ساتھ کھوجنے کی اسے کبھی مہلت نہ مل سکی تھی۔ سمیّہ میں شرم و حیا نام کی کوئی چیز نہیں تھی، کوئی فعل ممنوعہ نہیں تھا، وہ اپنے کو پورے طور پر سپرد کر دیتی اور ان چیزوں کی بابت اپنے شغف کا بے محابا اظہار کرتی جنھیں وہ 'رکیک' کہتی تھی۔ عازل کے جسم کے چپے چپے پر اپنی زبان ہولے ہولے پھرانے کا اس کا اپنا انداز تھا، اور خاص طور پر اس کے کولھوں اور ٹانگوں کے درمیان رکے رہنے کا۔ جب کبھی وہ پوچھتا کہ یہ ساری لذت پہنچانے والی ترکیبیں اس نے آخر کہاں سے سیکھیں، تو کہتی کہ یہ سب وجدان کا نتیجہ ہے: آزادی جو صرف خواہش کی پیروی کر رہی ہو!

ایک دن جب عازل سمیّہ کے یہاں اپنے مختصر قیام کے بعد لوٹا، میگیل نے اس کی آوارہ گردی کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک کرنے کا فیصلہ کر ڈالا۔

''تم سے عورت کی بو آرہی ہے! اس گھر میں، سن رہے ہو، کسی کو بھی اس کی اجازت نہیں کہ اس کے جسم سے عورت کی بو آئے۔ اور ہاں، اسی مناسبت سے، ڈاڑھی مت مونڈنا، اور خبردار جو مونچھوں کو ہاتھ بھی لگایا۔ کل خوب تفریح ہوگی!''

عازل شاور سے نہایا اور مزید ہدایات کا انتظار کرنے لگا۔ میگیل نے کوئی تیس کے لگ بھگ لوگوں کو ایک نقاب پوش پارٹی کے لیے مدعو کیا تھا اور اس کا عنوان 'شرقِ وردی' [گلابی مشرق] رکھا تھا۔
میگیل نے الف لیلہ و لیلہ کے کسی وزیر کی طرز کا لباس پہن رکھا تھا، جبکہ اس کے بیشتر دوست احباب ہر قسم کے گلابی رنگ کے مراکشی جلابے یا ترکی جبا دور اور شراویل [شلواروں] میں

ملبوس تھے۔ خدام کے کمرے میں بند، عازل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا پیش آنے والا ہے؛ اسے پارٹی کا شور و شغب سنائی دے رہا تھا، لیکن وہ ساکت و صامت بیٹھا رہا— منتظر۔ پھر کارمن نے آ کر قفطان، تقریباً سرخ وِگ، طلائی سوزن کاری کی پیٹی، بابوجین، اور نقاب اس کے حوالے کی۔ سب عورتوں کے پہننے کی چیزیں! عازل کو فوراً پتا چل گیا کہ میگیل کی کیا نیت ہے۔

''یہ سب پہن لو اور جب تک میں گھنٹی نہ بجاؤں نیچے نہ آنا۔'' کارمن نے کہا۔

''بھینس، تیرا حکم سر آنکھوں پر!''

کارمن نے یوں ظاہر کیا جیسے سنا ہی نہ ہو اور غائب ہوگئی۔ پھر یکبارگی عازل کو چشمِ تخیل میں اپنا دوست نورالدین نظر آیا جو تنگنائے میں ڈوب گیا تھا۔ مارے دہشت کے وہ آئینے کی طرف لپکا لیکن وہاں صرف اپنا چہرہ ہی نظر آیا، جو اتنا مضمحل اور اور پژمردہ تھا کہ تقریباً ایک نقاب لگ رہا تھا۔

مقابلے کے لیے تیار، عازل نے فیصلہ کیا کہ مالک کا کھیل ہی نہیں کھیلے گا، اسے دنگ بھی کر دے گا۔ اس نے دلہن کی طرح خود کو بنایا سنوارا، بڑے سلیقے سے عورتوں کا لباس پہنا، وگ کو قرینے سے سر پر جمایا اور دوبارہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ آدھی رات گزرنے پر بالآخر چھوٹی سی گھنٹی بجی۔ عازل کمرے سے نکلا اور آہستہ آہستہ چار منزلیں اترا۔ جب اس نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا تو سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ وہ اسے تحسین آمیز نظروں سے تک رہے تھے۔ پھر مردوں نے اس پر تعریفوں کے ڈونگرے برسانے شروع کیے۔

''کیسا شاندار مجسمہ ہے!''

''اور کیسا کامل امتزاج ہے: آدھا عورت، آدھا مرد! میگیل آج رات ہمارے ساتھ لاڈ نہیں کر رہا!''

''خدا کی پناہ— مونچھیں کیا ستم ڈھا رہی ہیں! اور ڈاڑھی کی گھنڈیاں تو دیکھو! یہ سب کس قدر تحریک انگیز ہے!''

''مراکش کا حسین ترین مفعول!''

''نہیں، نہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، یہ کوئی اٹھایا ہوا لونڈا نہیں، نہ کوئی آنی جانی وہم۔ یہ حقیقت ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں!''

Scanned with CamScanner

عازل بڑی تمکنت سے آگے بڑھا، کسی اداکار یا رقاص کی طرح جو اپنا بیلے رقص پیش کرنے کو تیار ہو۔

میگیل انگشت بدنداں رہ گیا تھا، لیکن موافقانہ انداز میں۔ اس نے عازل کا ہاتھ پکڑ کر اپنے مہمانوں کو مخاطب کیا:

''دوستو، میں تمھارے سامنے اپنی تازہ ترین فتح کا ثمر پیش کر رہا ہوں: کانسی سے تراشا ہوا کسرتی جسم، جس میں ہیجان آور نسائیت کا شائبہ ہے۔ ایک نادر سانڈ! تعلیم یافتہ، لیکن طنجہ کے جرائم پیشہ طبقے سے بھی پوری طور پر باخبر۔ طنجہ جو ڈاکوؤں اور غداروں کا شہر ہے۔ لیکن یہ نہ ڈاکو ہے نہ غدار، عازل تو صرف ایک شاندار شے ہے، ایسی شے جو ہر آنکھ کو فریفتہ کرتی ہے۔ ذرا اس کی سحر انگیز جلد کو تو دیکھو! تم اسے چھو سکتے ہو۔ قطار بنالو، لیکن خبردار جو دھکم دھکا کی۔ اتاؤلے ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ یہیں ہے، کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ اس کے کولھوں پر ہاتھ پھراؤ، لیکن اپنی شہوت کو قابو میں رکھنا۔ یہ میرا ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ تم اس کے لیے جھگڑنے لگو!''

میگیل سختی سے عازل کا ہاتھ پکڑے رہا، دریں اثنا مہمان، نوجوان کو چھونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ایک ایک کر کے اس کے پاس سے گزرنے لگے۔

''اور اب،'' میگیل نے عازل کے کان میں سرگوشی کی، ''تم ناچو گے۔ اور کسی طوائف کی طرح ناچو گے۔ تمھیں تطوان کے میلے کا وہ شخص یاد ہے جو عورتوں کے کپڑے پہنے لاٹری کے ٹکٹ بیچ رہا تھا؟ تم وہی آدمی ہو، ایک باریش عورت!''

عازل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میگیل آخر کیوں اس قدر اس کی نمائش کی کوشش کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے ذلیل بھی کیے جا رہا ہے: ایک لمحے کے لیے اسے گمان گزرا کہ میگیل نے بہت زیادہ چڑھا لی ہے، یا پھر حشیش کے کش لگائے ہیں۔

وہ کسی مصری دھن پر رقص کرنے لگا، کولھے تھرکانے اور اپنی بہن کے بارے میں سوچنے لگا جو مشرقی رقص کرنے میں اتنی طاق تھی، لیکن بہن کا پیکر رفتہ رفتہ سمیّہ کے پیکر میں جذب ہو گیا۔ فضا کے تناؤ کے باوجود، عازل نے رقص پر توجہ مرکوز کرنے کی سخت کوشش کی، بار بار اپنے سے کہا کہ وہ صرف ایک ملازم ہے، اور ایک دیوانے آقا کی خدمت بجا لا رہا ہے۔ وہ زندگی اور قسمت کو کوسنے

دینے لگا، شرم سے پانی پانی ہو گیا، لیکن عزم کیا کہ وہ خود کو پچھتاوے اور یاس کے سپرد نہیں کرے گا۔

صبح کے کوئی دو بجے میگیل اسے مہمانوں کے بیچ چھوڑ کر الگ ہوا۔ ان لوگوں میں سے بعض مدہوش اور بعض دوسرے، تنہا یا اپنے ساتھی کے پہلو میں، صوفوں پر نیم خوابیدہ حالت میں ڈھیر ہو گئے تھے۔ نوجوان موسیقی نوازوں کی جماعت پہنچی، لیکن وہ گانے بجانے کے بجائے سارے گھر میں جہاں تہاں جفتی میں مصروف ہو گئے۔ عازل اوپر اپنے کمرے میں جانے کے قصد سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہاں ایک کالا بھجنگ دیو پیکر، جو یقیناً کسی نائٹ کلب کا باؤنسر رہا ہوگا، راستہ روکے کھڑا تھا...

عازل کو اندازہ ہو گیا کہ میگیل نے اس کے لیے دام بچھایا ہے۔ اس نے وگ سر سے نوچ ڈالی، چہرے کو رگڑ کر صاف کیا، اور باورچی خانے کے کونے میں چھپ جانے کے لیے چل دیا، اور وہاں کھانے کے کھوکھوں اور خالی بوتلوں کے درمیان کسی فراموش کردہ بچے کی طرح سو گیا۔

اگلے دن عازل نے مونچھیں مونڈ ڈالیں اور اس گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینے کی نیت سے اپنی چیزیں اکٹھی کیں۔ پر جائے تو جائے کہاں؟ لیکن گزشتہ رات کی پارٹی کی یاد اس کے پیٹ میں کسی ترش اور متعفن ذائقے کی طرح ابلنے لگی۔ اس میں اس صورت حال کو مزید برداشت کرنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ ہفتوں بعد آج پہلی بار اس کا نوٹ بک میں کچھ لکھنے کو جی چاہا، لیکن جب اس نے نوٹ بک کھولی تو الفاظ نے یارانہ کیا، اس نے خالی صفحے پر ایک سرے سے دوسرے تک بس ایک لکیر کھینچ دی۔

چند دن بعد، یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، میگیل نے اسے طلب کیا اور پوچھنے لگا کہ مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ ہے۔

''وہ پارٹی بڑا اچھا خیال تھی! کیوں نہ ایسی ہی ایک اور پارٹی طنجہ میں بھی دیں، ہمارے گھر میں — میرا مطلب ہے جبل قدیم پر میرے گھر میں۔''

عازل کو یہ تجویز بالکل پسند نہ آئی۔

''ٹھیک ہے! اور اس بار میں بندر کے بھیس میں ہوں گا، بچے پیدا کرنے والی گھوڑی، یا کسی

Scanned with CamScanner

بھک منگے کے بھیس میں — ہاں، کیوں نہیں!''

''سچ مچ، تم میں حس مزاح نام کو بھی نہیں۔''

''یہ کہنا آسان ہے، جب آدمی خود مذاق کا ہدف نہ ہو۔''

طنجہ واپسی کا خیال بہت زیادہ خوش کن نہیں تھا۔ ظاہر ہے، عازل ماں کو دوبارہ دیکھنے، اس کی بانہوں میں گر جانے، اور اسے اپنے سر پر قرآنی آیات کی قرأت کرتے سننے کا خواہشمند تھا... لیکن اسے کنزہ کا سامنا کرتے ہوئے خوف آتا تھا، وہ ابھی تک اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ اور اسے اپنے پرانے دوستوں سے ملنے کا بھی خوف تھا، جو اسے اسپینی کے ساتھ دیکھ کر سب کچھ تاڑ جاتے۔

''طنجہ، اچھا خیال ہے۔ لیکن 'ہمارا' گھر؟''

''ہاں، 'ہمارا' گھر، جس طرح میں صرف 'گھر' بھی کہہ سکتا تھا۔ مطلب یہ کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ چاہے یہاں ہو یا وہاں، گھر ہی پر ہو۔''

''اس کا کیا مطلب ہے 'گھر پر'؟ یہ کہ گھر میں جو چاہوں کر سکتا ہوں، اس کے ساتھ جو چاہوں کر سکتا ہوں؟''

''اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ آیا نصف گھر تمھاری ملکیت ہے، تو یہ تمھاری ملکیت نہیں ہے۔''

''کیونکہ یہ کسی اور کا حصہ ہے؟''

''ہاں: میرے بچوں کا!''

یہ پہلی مرتبہ تھا کہ عازل بچوں کا ذکر سن رہا تھا۔

''ہاں، بات یہ ہے کہ میں نے دو بچوں کو لے پالک بنایا ہوا ہے۔ یتیم تھے اور کوئی انھیں لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھے پاپا کہتے ہیں اور مجھے اس سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ہماری ملاقات صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں ہوتی ہے، کیونکہ بقیہ سال وہ میرے ساتھ نہیں رہتے، ظاہر ہے: میں نے انھیں دارالبیضا میں بورڈنگ اسکول میں داخل کیا ہوا ہے۔''

عازل کا تجسس اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔

''ان کے کیا نام ہیں؟''

''دونوں توام ہیں۔ حلیم اور حلیمہ۔ بہت پیارے بچے ہیں اور بے حد ذہین۔ ان سے تمھاری

ملاقات جلد ہوگی۔ میں سوچ رہا ہوں کہ انھیں یہیں بارسلونا میں اسکول میں داخل کرادوں۔ اس طرح یہ میرے قریب رہیں گے۔ مجھے ان کی بہت زیادہ کمی محسوس ہوتی ہے...''

''کیا یہ تمھارا [خاندانی] نام رکھتے ہیں؟''

''ابھی نہیں۔ فی الوقت، جبکہ میں چند انتظامی کارروائیوں کے یکسو ہونے کا انتظار کر رہا ہوں (تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ ان میں کتنی پیچیدگیاں ہیں!)، ان کی دیکھ بھال اسی طرح کر رہا ہوں جیسے یہ میرے اپنے بچے ہوں۔ ابھی تک ان کے پاس شناختی کاغذات نہیں ہیں۔ یہ معاملہ میرے دل سے بہت قریب ہے۔ میں اس کا ذکر نہیں کرتا لیکن میرا ذہن ہر وقت اسی طرف لگا رہتا ہے۔''

عازل نے قدرے تردد کے بعد پوچھ ہی لیا کہ اس نے بچوں کو کیوں گود لیا ہے۔

''میں ایک مراکشی جماعت کا رکن ہوں جسے چند بڑی غیر معمولی خواتین نے قائم کیا ہے۔ یہ غیر شادی شدہ ماؤں اور متروکہ بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، اور میں جب بھی ان سے ملنے جاتا ہوں، میرا دل نچڑ کر رہ جاتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ مراکش میں بچوں کو متبنیٰ بنانا بڑا دشوار معاملہ ہے؛ ان کی مدد کی جاسکتی ہے، لیکن آدمی کو انھیں اپنا نام دینے کا حق حاصل نہیں۔ ایک دن ایک شیخ نے بتایا کہ اسلام ہر صورتِ حال کا خیال رکھتا ہے، حتیٰ کہ ان امور کا بھی جن کا ہونا بعید از احتمال ہو۔ مثلاً یہ امکان کہ گود لیے بچوں کو اگر اپنے حیاتیاتی ماں باپ کا علم نہ ہو تو وہ لاعلمی میں ان سے جنسی تعلق کا شکار ہو سکتے ہیں، جو نادانستہ زنائے محرم قرار دیا جائے گا۔ لیکن مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، وہ میرے بچے ہی ہیں۔ لیکن سرکاری کاغذ کی رو سے نہیں ہیں۔ میرا ارادہ تو اسلام قبول کر لینے کا بھی ہے، اگر اس سے کارروائی آسان ہو جائے۔ اچھا تو عازل، اب تم سب کچھ جان گئے ہو۔ لیکن نہیں — ایک سوال ابھی تک باقی ہے: آخر میں انھیں متبنیٰ کرنے پر کیوں اس قدر مصر ہوں؟ میں نے ان کی زندگی اور اپنی سالخوردگی پر غور کیا ہے۔ میرے اس عمل میں بیک وقت خودغرضی بھی شامل ہے اور دریادلی بھی۔ ہاں، بالکل، میں آگے آنے والے وقت کا سوچ رہا ہوں جب میں اپنی خبرگیری اور دیکھ ریکھ کے لیے دوسرے لوگوں کا محتاج ہوں گا۔ یہ بالکل بشری اور فطری بات ہے؛ میں تن تنہا مرنا نہیں چاہتا، بہت سے بڈھوں کی طرح جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ تمھارے ملک میں سن رسیدہ لوگوں کو کبھی ترک نہیں کیا جاتا، لیکن یہاں معاملہ مختلف

ہے۔ آج تم میرے پاس ہو، میرے پہلو میں موجود ہو۔ یہاں تک کہ ہم مل کر منصوبے بناتے ہیں۔ لیکن کسی دن تمھاری زندگی میں کوئی دوسرا آ جائے گا، مرد یا عورت، اور پھر تم اچانک چل دو گے، مجھے کسی خستہ و پامال اترن کی طرح چھوڑ کر۔ جب تک وہ دن نہیں آ جاتا، کسی خوش فہمی میں نہ رہنا، میں فرشتہ نہیں ہوں!"

عازل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ اس نے میگیل کی طرف تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا، جس میں ہر چند خفیف لیکن تشویش کی آمیزش بھی تھی۔

میگیل اور عازل اگست کے وسط میں طنجہ لوٹے، جہاں سڑکوں اور شاہراہوں پر چھٹیاں منانے آئے ہوئے مہاجرین نے اپنی کاروں کے ہجوم سے آمدورفت کو معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ اور انھیں ان کے ہارن بجانے میں کیا زبردست لطف آتا تھا! پولیس کو ذرا علم نہیں تھا کہ ان مسلسل شکایت کرنے والے راہگیروں کو کیسے قابو کرے جنھیں بلدیہ کے اجرت پر لائے گئے جوان متنبہ کر رہے تھے کہ سڑک صرف نشان زدہ پٹی پر ہی پار کریں۔ یہ جوان، جو چوراہوں پر لاؤڈ اسپیکر لیے کھڑے تھے، فصیح عربی میں چلا چلا کر ہدایات دے رہے تھے اور کوئی ان پر کان دھرنے کا روادار نہیں تھا۔ سارا شہر گندا ہو گیا تھا اور خلقت کے ازدحام سے ابلا پڑ رہا تھا، لیکن جیسا کہ میگیل نے اظہار خیال کیا، "زندگی یہیں ہے۔"

عازل ماں سے ملنے چل دیا، جس نے اس کا استقبال اس طرح کیا جیسے وہ حج کر کے لوٹا ہو۔ اس پر نظر پڑتے ہی مسرت آمیز چیخیں مارنا شروع کر دیں، جبکہ کنزہ ماں کو چپ کرانے کی جدوجہد کرتی رہی۔ عازل کی واپسی ایسی ہی تھی جیسے آوارہ گرد بیٹے[9] کی گھر واپسی۔ سارے پڑوسی اپنی اپنی بالکونیوں یا ٹیرسوں پر نکل آئے تھے اور عازل کو تحفے تحائف سے ٹھسا ٹھس بھرے دو گرانڈیل صندوقوں کے ساتھ آتا دیکھ رہے تھے، اور اگر واحد کسی بات سے مایوسی ہوئی تھی تو وہ یہ کہ وہ بجائے ایک بڑی سی پرتعیش کار چلاتا ہوا آنے کے، ٹیکسی میں آیا تھا۔

"وہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آیا ہے،" للا زہرہ نے چلا کر کہا، "ہوائی جہاز، اور کار وہیں اسپین

---

9۔ Prodigal son: لوقا کی انجیل (15:11-32) میں درج قصے میں خود کو لٹا کر پچھتانے اور گھر لوٹنے والے فضول خرچ آوارہ گرد بیٹے کی طرف اشارہ ہے۔

Scanned with CamScanner

میں گھر پر چھوڑ آیا ہے۔۔۔ وہ ماں کو دیکھنے واپس آیا ہے، ٹھیک اس کے حج پر جانے سے پہلے!''

کنزہ نے ماں کا منھ بند کرانے کی کوشش کی: ''تمھیں شرم نہیں آتی — آخر سارے محلّے کو اپنی ساری زندگی، ہماری گھریلو زندگی کا کچا چٹھا بتانے کی کیا ضرورت ہے؟''

پہلی رات اچھا خاصا جشن رہا۔ عازل اپنے بارے میں لگا تار بولتا رہا، جو کچھ بھی ذہن میں آیا کہہ دیا، بڑھا چڑھا کر بتایا، دروغ گوئی سے کام لیا، اگرچہ کوئی بھی بے وقوف نہیں بن رہا تھا۔ جب سونے کا وقت آیا، کنزہ اسے ایک طرف کھینچ لائی۔

''اس ملک میں رہنے کی اب مجھ میں تاب نہیں رہی۔ تمھارے جانے کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ خلاصی کا کوئی راستہ نہیں بچا ہے، کوئی نہیں۔ خوش قسمتی سے موسیو میگیل ہمیں وقتاً فوقتاً یاد کر لیتے ہیں، وہ پیسے تمھیں بھجواتے ہو نا؟ لیکن منی آرڈر پر دستخط ان کے ہوتے ہیں۔''

عازل کچھ ہچکچایا، اس بارے میں وہ قطعی لاعلم تھا۔

''پیسہ اس کا ہو یا میرا، ایک ہی بات ہے۔ تاہم تم جو چاہتی ہو اس کے بارے میں اس سے کہنا اب بھی خاصا مشکل لگتا ہے۔''

''لیکن صرف تمھی یہ کام کر سکتے ہو! میں اس سے اچھی طرح واقف نہیں جو بے جھجک پوچھ سکوں، کہ مجھ سے صرف دکھاوے کی شادی کر سکو گے؟''

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو، لیکن مجھے اس کا خوف ہے کہ کہیں ہم ضرورت سے زیادہ خطرہ نہ مول لے لیں، ضرورت سے زیادہ کنویں کے چکر نہ لگائیں۔''

''میگیل کنواں نہیں ہے!''

''وہ تو بالکل ٹھیک ہے، لیکن ہم کو زیادہ ہاتھ پاؤں نہیں پھیلانے چاہییں — کچھ بھی سہی، وہ ایک بااصول آدمی ہے۔''

''اس صورت میں مَیں اماں سے کہتی ہوں کہ وہی بات کریں۔''

''نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ سب کچھ بگاڑ کر رکھ دیں گی! اور مکہ جانے کا موقع کھو بیٹھیں گی جو وہ انھیں پیش کرنے کی سوچ رہا ہے۔''

Scanned with CamScanner

یہ وہ شام تھی جب دونوں تنہا قریبی ساحلی شہر اصیلہ کے ایک چھوٹے سے خوشنما گھر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ عازل نے یہ بات چھیڑی۔

میگیل کو نہ تعجب ہوا نہ برا لگا۔ وہ اس قسم کی حیلہ بازیوں سے بخوبی واقف تھا۔ ان معاملات میں وہ اپنے احساسات کی پیروی کرنے کو ترجیح دیتا تھا، اب یہ جہاں چاہے اسے لے جائیں۔ اسے عازل کی چاہ تھی اور وہ اس کی کسی بات کو رد کرنے کا اہل نہیں تھا۔ تنہا خوف یہی تھا کہ کہیں اس کے ساتھ غداری اور فریب کاری نہ کی جائے، پیچھے سے وار نہ کیا جائے۔ وہ غداری کے حربوں اور تباہ کاریوں کی بابت گھنٹوں بے تکان بات کر سکتا تھا۔ اس نے ژاں ژینے (Jean Genet) کی نگارشات پڑھی تھیں اور اس پر حیران ہوا تھا کہ وہ اس فقرے کو کہنے کا کیوں اتنا دلدادہ تھا کہ طنجہ ''شہرِ خیانت'' ہے۔ میگیل کو عازل کی نگاہوں میں کچھ نظر آتا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل تھا، ایک طرح کی ساختہ مسکراہٹ، فریب و دغا کی ایک غیر تسلیم شدہ شکل کے اظہار کا مضمر انداز۔ تاہم وہ اپنے نوخیز عاشق کی کمزوریوں سے بھی پوری طرح آگاہ تھا: پیسہ، عورتیں، اور کیف۔ کنزہ سے شادی کر کے وہ گھر پر ایسا استحکام پیدا کرنے کا متمنی تھا جو عازل کو زیادہ فرمانبردار، زیادہ قابلِ اعتماد بنا دے۔

''لیکن ایک غیر مسلم مرد کو ایک مسلم عورت سے شادی کی اجازت کہاں ہے!'' اس نے عازل کی یاددہانی کرائی۔

''تو مشرف بہ اسلام ہونے کا ٹھیک یہی وقت ہے! شادی شدہ ہونے کی صورت میں بچے گود لینے کا امکان اور بڑھ جائے گا۔ ایک ہی ڈھیلے سے دو چڑیاں مار لو گے!''

''مسلمان کیسے بنا جاتا ہے؟''

''دو عدولوں سے جا کر ملا جاتا ہے، جو دین اور فقہ کے عالم ہوتے ہیں، اور کلمہ شہادت پڑھا جاتا ہے: یہی کہ میں تصدیق کرتا ہوں اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، اور محمد رسول خدا ہے۔''

''بس؟''

''تمھیں نام بھی بدلنا ہوگا اور . . .''

''اور کیا؟''

''ختنہ کرانا ہوگا!''

Scanned with CamScanner

''نہیں! میری جیسے عمر کے آدمی کے لیے مشکل کام ہے۔ وہ میرا معائنہ تھوڑی کریں گے۔''

''جب تم عدول سے ملنے جاؤ تو خاص خیال رکھنا کہ عام کپڑوں میں جاؤ: قفطان وفطان نہیں چلے گا۔ اس سے انھیں صدمہ ہوگا، اور ہو سکتا ہے بدک کر تمھارے خلاف ہو جائیں۔ مرجان کا ہار مت پہننا، اور نہ بہت زیادہ انگوٹھیاں۔ یہ روایتی لوگ ہوتے ہیں۔ اپنے پر تو جہ دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''میں مراکش سے اتنی ہی اچھی طرح واقف ہوں جتنے تم ہو اور میں جانتا ہوں کہ محتاط رہنا ہمیشہ سود مند ہوتا ہے۔ اور تمھارے لیے بھی ایک نصیحت ہے: ظاہر پر نہ جایا کرو، یہ دھوکا دے سکتا ہے!''

''ہاں، مجھے پتا ہے: ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ السنة تضحک والقلب یذبح...''

''یعنی؟''

''' لبوں پر تبسم اور دل میں قتل کر دینے کا خیال!' یہ میں نے فی البدیہہ گھڑ لیا ہے۔ گاہے گاہے مجھے ضرب الامثال دہرانا اچھا لگتا ہے۔ جب کوئی یاد نہیں آتی — تو خود بنا لیتا ہوں۔''

سو یوں، عازل کی محبت میں، میگیل نے کنزہ سے شادی کر لی اور اپنا نام 'منیر' رکھ لیا۔

# 15

## ملیکہ

جب سے ملیکہ نے ٹیلیوژن پر مردہ جسموں کو تیرتے ہوئے دیکھا تھا، اسے خواب آنے بند ہو گئے تھے۔ اس نے لاشوں کو گنا تھا، اور خود کو اس المیے کا شکار تصور کیا تھا۔ وہ پشت کے بل لیٹ جاتی، پیٹ پھلاتی، اور آنکھیں بند کر کے تیرنے لگتی۔ صبح کی دھند اس کے چہرے سے کھیلتی، اور اس کے ننھے سے جسم پر خنک پانی لہریں مارتا۔ اسے کچھ محسوس نہ ہوتا۔ وہ مرے ہوئے ہونے کا کھیل رچاتی، خود کو لہروں پر بہنے دیتی، کہ جہاں چاہیں بہا لے جائیں، دوسرے مردہ جسموں سے ٹکراتی، اور پھر دوبارہ

سمندر میں نکل جاتی۔ ایک بڑی سی موج نے اسے ریتیلے ساحل پر لا پھینکا۔ سمندری گھاس اس پر لپٹ گئی۔ پانی آ آ کے اس کے اوپر بہتا رہا، اسے ہلکورے دیتا رہا، جیسے وہ کسی لمبی نیند پر جا رہی ہو۔ لیکن یہ سحر کا وقت تھا، فجر کی نماز کا وقت؛ دادی وضو کر رہی تھی اور اس پر بالکل متوجہ نہیں تھی۔ نہ ملیکہ کو دکھائی دی نہ سنائی۔ وہ ایک ہی کمرے میں نہیں تھیں، نہ شاید ایک ہی ملک میں۔ ملیکہ نے اس سے بات کرنا چاہا، بلانا چاہا، لیکن حلق سے کوئی آواز نکل کر نہ دی۔ سو وہ بھی نماز پڑھنے لگی، لیکن حرکت کیے بغیر، وضو کیے بغیر۔ اس نے آسمان سے باتیں کیں، سمندر اور سمندری بگلوں سے گفتگو کی، اور یاد کیا کہ اس کے باپ نے ایک روز اس سے کہا تھا کہ اگر ان پرندوں کے پروں کا تیل خشک ہو جائے تو یہ ڈوب جاتے ہیں۔ اس نے ایک بگلے کو صابن لگا کر دھلانے کی کوشش کی تھی، لیکن جب اسے چھوڑا تو بے چارہ سطح کے نیچے چلا گیا تھا اور پھر ابھر کر نہ دیا۔ ملیکہ رو پڑی تھی؛ وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ باپ نے جھوٹ موٹ کہانی گھڑ لی ہے کیونکہ وہ وسعتِ تخیل کا مالک تھا۔ اب جب کبھی بھی اسے کوئی سمندری بگلا نظر آتا، تو بے اختیار وہ بگلا یاد میں گھوم جاتا جو اس کی غلطی سے مر گیا تھا۔ اس نے اس بگلے کا ایک نام بھی رکھ دیا تھا، زبیدہ، یعنی ''مکھن کی نان خطائی۔''

ملیکہ کی نیند ہلکی پڑ گئی اور افسردگی کی گہرائیوں پر منڈلانے لگی۔ اب وہ تنگنائے عبور کرنے کا خواب نہیں دیکھتی تھی، لیکن اس نے اپنی زندگی کو بدلنے کا خیال نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی بہن اس کا خیال رکھتی تھی، اس کی حمایت کرتی تھی، لیکن اس کا بہنوئی حکم چلاتا تھا، اگرچہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کی طرح ہے۔ چونکہ بدقت روزی کما پاتا تھا، اس کا مزاج اکثر خراب رہتا۔ بہرحال، جب تک وہ مچھیرا رہے گا، زندگی تنگی اور دشواری میں ہی گزرے گی۔ اور بیوی کے 'گرانڈ سوکو' کے دروازے پر جا کر روٹیاں بیچنے سے زندگی بدلنے والی نہیں تھی۔ اس نے عمر رسیدہ چچی سے ساجھا کر رکھا تھا۔ روٹیاں چچی پکاتی، اور روز جا کر بیچنے کا کام اس کے ذمے تھا، اور وہ بھی یوں کہ ملیکہ گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کر لیتی۔

جیسے ہی بہن گھر لوٹتی، ملیکہ باہر نکل جاتی تاکہ اپنی یومیہ گھنٹے بھر کی آزادی سے لطف اندوز ہو سکے۔ سڑکوں سے بھاگتی ہوئی 'بولوار پاستور' پہنچتی اور 'تیریس دے پاریسو' آ کر دم لیتی۔ سورج مکھی کے بھنے بیجوں کا پیکٹ خریدتی اور انھیں مزے سے کتر کتر کر کھاتے ہوئے بندرگاہ سے رخصت

Scanned with CamScanner

ہوتے ہوئے جہازوں کا نظارہ کرتی۔ اگر مرد اسے کسبی سمجھ کر جنسی کی خواہش ظاہر کرتے تو کبھی جواب نہ دیتی، بس بیچ ان پر تھوک دیتی یہاں تک کہ وہ اپنی راہ لیتے۔

اب وہ جہازوں کو بدلی ہوئی نظر سے دیکھنے لگی تھی۔ انھیں بڑی بڑی بوتلوں کی طرح پرسکون پانیوں پر روانی سے بہتے دیکھتی، اور ان میں صرف اپنے خواب بھیجنے پر قناعت کرتی۔ وہ ان خوابوں کو بڑے بڑے ورقوں پر لکھتی، پہلے چار اور پھر آٹھ تہوں میں موڑتی، ان پر نمبر لگاتی اور ایک نوٹ بک میں سنبھال کر رکھ دیتی۔

خواب نمبر ایک نیلا ہے۔ ایک سمندر، اور اس کے دور والے کنارے پر ایک کرسی آسمان اور زمین کے درمیان معلق۔ ملیکہ اس میں دھنس کر بیٹھ جاتی ہے اور اسے جھولے کی طرح چلا دیتی ہے۔ اس کا لباس بھی نیلا ہی ہے، ڈھیلا ڈھالا اور شفاف۔ اپنے جھولے کی بلندی پر اسے مراکش کا ساحل، طنجہ، عمودی چٹانیں، پہاڑ اور بندرگاہ کی جھلک نظر آ سکتی ہے۔ شام پڑنے پر وہاں روشنیاں نہیں جھلملاتیں۔ ہر شے اندھیری ہے۔ سو وہ اپنے جھولے کو پہلو کے رخ جھلاتی ہے اور مراکش کی طرف پیٹھ کر لیتی ہے۔

خواب نمبر دو سفید ہے۔ وہ اسکول میں ہے جہاں سب، کیا استاد اور کیا طالب علم، سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ تختۂ سیاہ سفید ہے اور چاک سیاہ۔ شاگردوں کو ستاروں کا درس دیا جا رہا ہے—ان کی حرکات اور مداروں کا۔ پھر وہ زمین پر اتر کر ایک جنگل میں داخل ہوتے ہیں جہاں درختوں پر سفیدی پھری ہوئی ہے۔ یہ سفیدی ملیکہ کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔ وہ ٹھہر جاتی ہے، ایک درخت پر چڑھتی ہے، اور دور فاصلے میں اسے اپنی بہن کے گھر کی ٹیرس نظر آتی ہے۔ یہ بہت چھوٹی سی ٹیرس ہے، جس میں بھیڑ کی کھالیں سکھانے کے لیے پھیلائی گئی ہیں۔ درختوں کی شاخوں سے سینکڑوں کتابیں لٹکی ہوئی ہیں، اور ان پر ہر رنگ کے گرد پوش ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ ہر کتاب کیا کہتی ہے، بس اسے کھولنے ہی کی دیر ہے۔ یہ جادوئی کتابیں ہیں اور طنجہ میں وجود نہیں رکھتیں۔ ملیکہ کو خواہش ہوتی ہے کہ اس ملک میں پہنچ جائے جہاں کتابوں کے جنگل اگتے ہیں۔

خواب نمبر تین ایک ریل گاڑی ہے جو تنگنائے جبرالٹر عبور کر رہی ہے۔ طریفہ اور طنجہ ایک پل کے ذریعے ملے ہوئے ہیں جو اتنا ہی خوشنما ہے جتنا وہ پل جو اس نے سیاحتی رسالوں میں دیکھا تھا۔

Scanned with CamScanner

سفر میں کوئی بیس منٹ لگتے ہیں۔ ملیکہ سب سے پہلے ڈبے میں بیٹھی ہے، اور عبور کے دوران ہر شے کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی ہے۔ جب گاڑی اسپین کے ساحل پر پہنچتی ہے، ایک استقبالی جماعت مسافروں کو خوش آمدید کہتی ہے، انھیں پھول، کھجوریں اور دودھ پیش کرتی ہے۔ ملیکہ کو کھجوریں بہت پسند ہیں۔ وہ تین عدد لیتی ہے اور جتنی جلدی ہو سکے ہڑپ کر جاتی ہے۔ استقبال کرنے والے اسپینی یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ملیکہ یہیں اسکول میں پڑھے، اور اپنی پڑھائی جس میں طنجہ چھوڑنے کی وجہ سے خلل پڑ گیا تھا، جاری رکھے۔ جب وہ مڑ کر دیکھتی ہے، گاڑی واپس جا چکی ہے، اور وہ پل بھی۔

خواب نمبر چار ایک صندوق ہے، ایک پرانا کتھئی رنگ کا صندوق۔ اس کے اندر ملیکہ نے اپنے محبوب کھلونے اور چیزیں چھپا رکھی ہیں۔ ہر طرح کی چیزیں: بال کاڑھنے کا برش، آئینے کا ایک ٹکڑا، پنسل تراش، مختلف رنگوں کے تین بٹن، ایک نوٹ بک جو ان خیالات سے بھری ہے جنھیں اس نے بڑی عجلت سے لکھ لیا تھا، ایک چاندی کا خمسہ [پنجہ] جو نانی نے دیا تھا، کاغذ کا تہہ کیا ہوا ایک زرد ایا ہوا ٹکڑا جس پر لال دھاگا بندھا ہوا تھا، مٹانے کا ربڑ، جڑاؤ پن، چند عدد کیلیں، اور ایک کتبیا جسے اس طرح بنایا گیا تھا کہ پاسپورٹ معلوم ہو، اسے کھولیں تو اس میں آپ کی تصویر ہو اور تمام ضروری معلومات جو ایک پاسپورٹ میں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر چیز ملیکہ کے لیے ایک خاص معنی رکھتی ہے، سربستہ راز جن سے صرف وہی واقف ہے۔ اس نے صندوق کی پشت پر کالی روشنائی سے صرف اتنا لکھا ہے: ''یہ میرا ہے۔''

# 16

## منیر

میگیل نے اسلام بڑی سنجیدگی سے قبول کیا۔ ظاہر ہے، وہ اس مذہب کے بارے میں پہلے سے کچھ نہ کچھ جانتا تھا، لیکن اب اسلامی ثقافت پر چند کتابیں، سیرت النبی، اور قرآن کا ایک نیا ترجمہ خرید لایا۔ اس نے بعض بعض پاروں کو پڑھا اور کئی بار پڑھا۔ اسے ہر بات دلچسپ لگی۔ وہ متجسس تھا، اور اس پر

خوش کہ اس نے ایسی دنیا میں چھلانگ لگائی ہے جو اس سے قریب ہے، ایسی دنیا جس کی بابت وہ غلطی سے یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ اسے جانتا ہے۔ اسے احساس ہوا کہ اسلام اگر عیسائیت سے واقعی مختلف تھا تو صرف مریم اور عیسیٰ کے معاملے میں۔ 'سورۃ النساء' پڑھتے وقت اس نے آیات 156، 157 اور 158 پر خاص دھیان دیا۔ ''اور بہ سبب ان کے اس قول کے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو مار ڈالا، جو مسیح اور اللہ کے پیمبر تھے، حالانکہ وہ نہ آپ کو مار ڈال سکے اور نہ آپ کو سولی ہی پر چڑھا پائے بلکہ ان پر شبہ ڈال دیا گیا اور یہ لوگ آپ کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں، وہ آپ کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، ان کے پاس کوئی علم (صحیح) تو ہے نہیں، ہاں بس گمان کی پیروی ہے، اور یقینی بات ہے کہ انھوں نے آپ کو مار نہیں ڈالا بلکہ آپ کو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے، اور اللہ بڑا قوت والا ہے۔'' تینوں توحیدی مذاہب ایک جیسی اقدار کے قیام کی جدوجہد کرتے ہیں۔ رہا اسلام، تو وہ دوسرے انبیا کو مانتا ہے اور مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ ان کو مانیں اور ان کا احترام کریں۔

میکیل محبت کی خاطر مذہب تبدیل کرنے کا آرزومند تھا، کیونکہ وہ اس کا قائل تھا کہ یہ محبت ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے یا جس کے فضل سے ہم اپنے اہم ترین کارناموں کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ بالکل بدیہی بات تھی، ایک مرکزی صداقت۔ میکیل جب پیچھے اپنی زندگی پر نظر ڈالتا تو وہ ایسے مراحل کا سلسلہ نظر آتی جن میں کوئی عارضی فریفتگی فیصلہ کن ثابت ہوئی ہوتی۔ ''آج عازل مجھے اسلام کی طرف لے جا رہا ہے!'' اس نے غور کیا۔ ''آہ، میرے پرانے کیتھولک دوست اگر اب مجھے دیکھیں! وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ میری عقل سنک گئی ہے، میرا قصہ پاک ہو گیا ہے، کہ عازل کی ماں نے مجھ پر جادو کر دیا ہے، کہ ہو نہ ہو مجھے گیدڑ یا لکڑ بگھے کا بھیجا کھلا دیا گیا ہے۔ وہ کبھی یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ میں نے کتنے شوق سے عازل کے گھر والوں کی پیشکش قبول کی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی میرا ارادہ نہیں بدل سکتی: میں شادی کروں گا، اور تو اور، طیبِ خاطر سے اور اصولوں کے مطابق کروں گا۔ اس شادی سے، جو خالص سہولت کی خاطر کی جا رہی ہے، ایک ضرورتمند انسان کو فائدہ پہنچے گا۔ میرا اپنا ذاتی مقصد صرف اتنا ہی ہوگا کہ اپنے محبوب کو اپنے سے قریب رکھ سکوں جو مجھے حوصلہ اور زندگی کی امنگ دلاتا ہے۔ آہ، میرے رفیقو، تم اپنے خوشنما گھروں میں مایوس بیٹھے ہوئے ہو، اپنی گزشتہ جوانی کی بازخوانی میں وقت گزار رہے ہو، تمھارے جسم جواب دینے لگے ہیں، تم یہ سوچ کر پاگل

Scanned with CamScanner

ہوئے جا رہے ہو کہ زندگی انصاف نہیں کرتی، اور بڈھے ٹھڈوں کے نرسنگ ہوم میں اپنے ہی جیسوں کے ساتھ بیٹھے موت کا انتظار کر رہے ہو! باقی رہا میں، تو میں نے اپنی راہ چن لی ہے۔ میں بڈھوں کی عزلت گاہ میں بھیج دیے جانے سے انکار کرتا ہوں! میں اب بھی اپنے عضو کو استادہ کر سکتا ہوں، اب بھی جفتی کی طاقت رکھتا ہوں۔ میرے آس پاس لوگ ہیں، بلکہ جو ہیں ان سے بھی زیادہ اکھٹے کروں گا۔ میرا اپنا خاندان ہوگا اور، انشاء اللہ، میرے ننھے منے توام بچے بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ میرے دوستو، میں مشرف بہ اسلام ہونے والا ہوں ... اور ایک دردانگیز یاد لوٹ آئی ہے ... میرا سب سے بڑا محبوب، پہلا بڑا محبوب: علی، بازی گر، 'سرکس عمار' کا تابندہ ستارہ، علی جو میرے ہوش و حواس اڑا دیتا تھا، جس کی خاطر میں مسلمان تک ہو جانے کو تیار تھا، تاکہ وہ میرے ساتھ رہ سکے، لیکن آہ — اسے حادثہ پیش آیا، اس نے سب کچھ تج دیا، بس غائب ہو گیا، اور میں آج تک اس کی خیر خبر معلوم نہیں کر سکا ہوں، اس کی حسرت ابھی تک میرے دل میں ایک زخم کی طرح سوزاں ہے۔ خدا کرے سب کام خوش اسلوبی سے ہو جائے، عدول کوئی الجھاوا نہ ڈال دیں، کہ وہ اس معاملے میں کشادہ ذہنی کا ثبوت دیں، اور کہ میں کلمہ پڑھنے میں غلطی نہ کر بیٹھوں — میں کل سے اس کی مشق کر رہا ہوں: 'اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ'... یہ آسان ہے، بس اسے ادا ہی کرنا ہوتا ہے اور آدمی مسلمان بن جاتا ہے، لیکن پوری صدق دلی سے دہرانا ہوتا ہے، کیونکہ اللہ آدمی کا اعتماد کرتا ہے؛ اگر جھوٹ موٹ یا مذاقاً ادا کیا جائے تو یہ اچھا نہیں، کیونکہ مسلمان ہونے کا مطلب دل کی گہرائیوں سے خدا کی وحدانیت پر ایمان لانا ہوتا ہے۔

میگیل انھی خیالات میں غرق تھا کہ یہ سلسلہ عازل اور کنزہ کے گھنٹی بجانے سے ٹوٹ گیا۔ وہ اور للّا زہرہ 'شارعِ صیاغین' کے پاس 'مندوبیہ' میں تین بجے عدول سے ملنے والے تھے۔ پہلے مذہب تبدیل ہوگا، پھر شادی۔

میگیل نے سفید کپڑے پہنے اور اوپر سے جلابیہ ڈال لیا۔

عازل نے ایک بار پھر اسے سادگی اختیار کرنے کے لیے کہا۔ میگیل نے جلابیہ اتار دیا۔ میگیل عام طور پر کریم وغیرہ استعمال کرتا تھا اور آنکھوں میں کحل لگاتا تھا۔ جب وہ نکل رہے تھے، عازل نے

Scanned with CamScanner

میک اَپ اتار دینے کے لیے بھی کہا۔

''تمھارا نام منیر ہے، تمھیں عورتوں سے رغبت ہے، اور تم مرد کی طرح نظر آتے ہو، سچ مچ کا مرد، رجولیت سے بھرپور اور صاف گو۔''

میگیل کو کچھ حیرت سی ہوئی کہ عازل ذمے داری سنبھال رہا تھا۔

مندوبیہ میں عدول ان کے منتظر تھے۔ انھیں حالات سے باخبر کر دیا گیا تھا اور درخواست کی گئی تھی کہ سوال نہ کھڑے کریں۔ انھیں خاطر خواہ عوضانہ ملے گا۔

عمر میں جو دونوں سے چھوٹا تھا اور کئی زبانیں بولتا تھا، اس نے بڑے تپاک سے میگیل کا خیر مقدم کیا۔ دوسرا خاموش رہا، بس ایک بڑا اسار جسٹر نکالا، اس میں تاریخ اور ساعت درج کی، پھر میگیل سے پوچھ لیا کہ وضو کر کے آیا ہے، کیونکہ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے نماز پڑھنا مستحسن تھا۔

''ظاہر ہے،'' میگیل نے جواب دیا۔ ''میں اس معاملے میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ دونوں وضو کر کے آیا ہوں، بڑا اور چھوٹا۔ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہوں۔''

کچھ عجیب سی خاموشی کے عالم میں میگیل نے کلمہ شہادت پڑھا، جسے اس کے پیچھے پیچھے سب نے دہرایا گویا اس کے عمل کی تائید کر رہے ہوں۔ میگیل بے حد متاثر ہوا۔ کنزہ، ہاتھ میں اپنا قومی شناختی کارڈ تھامے، مردوں کے عقب میں کھڑی انتظار کر رہی تھی۔

میگیل، عازل، اور عدول اٹھے اور 'شارع صیاغین' کے سرے پر مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔ اگرچہ میگیل مصر اور ترکی میں چند مسجدوں کی سیر کر چکا تھا، کسی مراکشی مسجد میں داخل ہونے کا اسے آج پہلی بار اتفاق ہوا تھا، جہاں غیر مسلموں کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ عازل، اپنے دوست کو دیکھ کر، جس کی حرکات وسکنات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جو کر رہا ہے اس پر ایمان بھی رکھتا ہے، ٹھٹھا مار کر ہنسنے سے بمشکل ہی خود کو باز رکھ سکا۔

مندوبیہ کے چھوٹے سے دفتر میں واپس پہنچ کر نوجوان عدل نے ایک عیسائی کے اسلام میں داخل ہونے کا رسمی اعلان پڑھا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ہم، محمد لعرایشی اور احمد الکونی، اصحاب قانون و دین، تصدیق کرتے ہیں کہ موسیو میگیل رومیرو لوپیز نے کلمہ شہادت پڑھا ہے اور اس طرح دو گواہوں کی

موجودگی میں مسلمان ہو گئے ہیں؛ انھوں نے اپنے پہلے نام کے لیے 'منیر' انتخاب کیا ہے۔ خدا ان کی حمایت کرے اور اپنی امان میں رکھے۔ ان پر واجب ہے کہ اپنا کیتھولک عقیدہ ترک کریں اور امتِ اسلامی میں داخل ہوں، جو انھیں خوش آمدید کہتی ہے تا کہ اس کی صفوں میں اضافہ ہو اور ان کے صدقِ ایمان اور نیتِ صالح سے مستفیض ہو۔

''ہمارے عزیز، منیر، اب تم ہمارے بھائی ہو، اسلام کی منور، اخوت سے بھرپور، اکرام، اور روحانی جلال کی دنیا میں آنا مبارک ہو۔ ہم تمھیں اسلام کے ارکانِ خمسہ کی تلقین کرتے ہیں: کلمۂ شہادت؛ یومیہ پانچ نمازیں، جن کا تعین سورج کے گرد زمین کی حرکت سے ہوتا ہے؛ رمضان کے روزے، جب مومنین انتیس یا تیس دن تک طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک کھانے، پینے، تمباکو نوشی اور جنسی اختلاط سے اجتناب کرتے ہیں؛ زکوٰۃ، یعنی اپنی استطاعت کے مطابق فقرا کو خیرات دینا؛ اور آخرا، اگر تمھاری جسمانی، ذہنی، اور مالی حالت اجازت دے تو، مکہ حج پر جانا۔''

اس کے بعد عدول نے قرآن کی اولین سورت، 'الفاتحہ'، کی بہ آوازِ بلند قرأت کی، اور یومِ حساب تک منیر کے صحت مند اور صالح رہنے کی دعا مانگی۔

انھوں نے شہادت نامہ تیار کیا، اس پر دستخط کیے اور اس پر بیس درہم کا سرکاری ٹکٹ چپکا دیا۔

عقد کی رسمیات کے شروع ہونے سے پہلے سبھوں نے کچھ دیر توقف کیا۔

ماں، جو اس عرصے میں ایک طرف کھڑی رہی تھی، اب کنزہ سے آملی۔ جب نکاح نامہ تیار ہو رہا تھا، بڑی عمر والے عدل نے مدھم آواز میں کنزہ سے کہا:

''اگرچہ اس نے ہمارا مذہب اختیار کر لیا ہے، یہ ایک اجنبی، ایک عیسائی ہی ہے، اور ٹھیک ہے کہ اس سے میرا کوئی سروکار نہیں، مگر تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس کے پیچھے جو کچھ ہے، سب جانتا ہوں۔''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے!'' کنزہ نے اتنی اونچی آواز میں جواب دیا کہ سبھوں کو سنائی دیا۔

میگیل کو اچانک محسوس ہوا جیسے اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے؛ وہ سب عربی میں بول رہے تھے اور وہ سمجھ نہ سکا کہ کیا پیش آ رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

کم عمر والے عدل نے میکیل کو اس کی وجہ بتائی کہ اسلام میں کیوں مسلمان عورت کو غیر مسلم سے شادی کرنے کی ممانعت ہے۔

''عورت آسانی سے اثر قبول کر لیتی ہے؛ اگر وہ عیسائی سے شادی کرے تو لامحالہ اس کے دینی عقیدے اپنا لے گی اور بعد میں اولاد بھی ماں کی پیروی کرنے لگے گی۔ اور ضروری ہے کہ تم یہ بھی جان لو کہ اسلام عورتوں کا تحفظ کرتا ہے۔ تمھاری ہونے والی بیوی کو نکاح نامے میں اپنی شرائط داخل کرانے کا حق حاصل ہے، جیسے اسے طلاق دینے، یا دوسری بیوی کرنے کی ممانعت۔''

''صاحب، میرے لیے تو ایک بھی کافی سے زیادہ ہے۔ اور سرے سے بیوی نہ ہو تو اور بھی اچھا— بہر حال، زندگی میں بیوی ہی سب کچھ نہیں!''

''مجھے لگ رہا ہے، موسیو منیر، کہ آپ عورتوں کو خاصا جانتے ہیں۔''

''کم از کم اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ازدواجی زندگی ہمیشہ مسرت کا گھر نہیں ہوتی؛ اور حقیقت میں یہی وجہ ہے جو میں اتنی دیر سے شادی کر رہا ہوں۔''

''آپ جانتے ہیں اسلام شادی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟''

''کیوں نہیں، بالکل۔ یہی کہ ہر اچھے مسلمان کا فرض زواج سے پورا ہوتا ہے۔''

''آہ، میں دیکھ سکتا ہوں کہ آپ محض خانہ پری نہیں کر رہے ہیں!''

کنزہ تناؤ کی کیفیت میں تھی۔ ماں بے صبری ہوئی جا رہی تھی اور خود ہی خود کچھ بڑبڑائے جا رہی تھی۔ عازل ایک طرف بیٹھا کارروائی دیکھ رہا تھا اور اس کا ذہن سہام کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ اس سے شادی کی بات کرنے سے عاجز تھا؛ اسے اپنی آزادی کچھ زیادہ ہی عزیز تھی اور وہ ذمے داریوں سے بھی دور بھاگتا تھا۔ سہام اور سمیہ اس کے تخیل میں گڈمڈ ہونے لگی تھیں، جس پر وہ مسکرا دیا۔

عدول کو صحیح صحیح جواب دینے کے بعد منیر اور کنزہ نے عقد نامے پر دستخط کیے، اور ہاتھوں میں ہاتھ دیے باقی سب سے پہلے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

میکیل نے گھر پر بڑے پر تکلف طعام کا انتظام کیا تھا۔ آخر وہ اپنی ساس کا پہلی مرتبہ وہاں استقبال کر رہا تھا، اور للاّ زہرہ گھر کی شان و شوکت اور نفاست کو دیکھ کر مرعوب ہوئی۔ لیکن ایک بات

Scanned with CamScanner

اس کی سمجھ میں نہیں آئی: آخر وہ پرانی دھرانی چیزیں کیوں جمع کرتا تھا— فرنیچر، زیورات، دھندلائی دھندلائی تصویریں (dark paintings) بے آب آئینے — اور اس نے میگیل کو اپنے ایک واقف دکاندار کے پاس لے جانے کی پیشکش بھی کی جو اسے بالکل نئے آئینے اور ٹھوس اور دیدہ زیب فرنیچر بیچ سکتا تھا۔ میگیل اس کی طرف دیکھ کر صرف مسکرا دیا۔

"یہ چیزیں میں نے اس لیے رکھی ہیں کہ میرے والدین اوران کے والدین کی میراث ہیں: یہ یادیں لوٹا لاتی ہیں!"

کھانے کے بعد، کنزہ اور ماں گھر چلی گئیں۔ للاّ زہرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس سے پہلے اس نے کسی دلہن کو سونے کے لیے اپنے میکے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

سب کے لیے یہ بڑا لمبا اور تھکا دینے والا دن ثابت ہوا تھا۔ بے چین اور بے کیف، عازل میگیل کو تنہا چھوڑ کر غائب ہو گیا۔

# 17

## عبدالسلام

عبدالسلام کو گھر کے باہر کی ٹیرس پر سفید چادر بچھا کر خوابوں میں بہہ جانا بہت مرغوب تھا۔ ملک چھوڑنے کی اسے کوئی خواہش نہیں تھی۔ بس اس کے لیے یہ تصور کرنا ہی کافی تھا کہ مہاجرت میں اس کی زندگی کا کیا حشر ہوتا۔ اپنے بھائی نورالدین کے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کے بعد سے اس نے اپنے سارے منصوبے طاق پر رکھ دیے تھے اور دین کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اب وہ روز نماز پڑھتا کیونکہ وہ اُس کشتی پر بھائی کو قسمت آزمانے کا حوصلہ دلانے کا خود کو مجرم سمجھتا تھا۔ اس نے بھائی کو تنگنائے عبور کرانے والے، العافیہ، کے لیے اپنے اندوختے کا اچھا خاصا حصہ دیا تھا۔ عازل کو معلوم تھا کہ یہ سب کس طرح انجام پایا تھا، کیونکہ وہ کارروائی کے دوران وہیں موجود تھا۔

"سنو، مجھے اطمینان دلاؤ کہ کشتی کوئی کباڑ نہیں ہے، ٹھیک ہے نا؟"

Scanned with CamScanner

''بالکل، نہیں!''

''اس میں کتنے آدمی لادو گے؟''

''جتنوں کی اجازت ہے: نہ کم نہ زیادہ۔ تم اتنا شک وشبہ کیوں کر رہے ہو؟''

''اس لیے کہ ان دنوں بہت سے لوگ ڈوب گئے ہیں۔''

''میں ایک پیشہ ور آدمی ہوں، کوئی بیوہ ساز نہیں۔ میں یہ کام محلے والوں کی مدد کے لیے کرتا ہوں۔ اس پھٹکل برابر پیسے سے میں کوئی امیر کبیر نہیں بن جاؤں گا۔''

''پھٹکل برابر ہے یا نہیں،'' عبدالسلام نے کہا، ''اسے جمع کرنے میں ہمارے دانتوں تلے پسینہ آ گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اپنے گوشت کا ایک ٹکڑا تمھارے حوالے کر رہا ہوں۔ بس یہی سب میری جمع پونجی ہے۔ سو بہتر ہو گا تم پکا کر لو کہ سب ٹھیک ٹھاک رہے گا اور ہماری 'پھٹکل' کی کچھ نہ کچھ حیثیت ہے۔''

''سنو، اگر مجھ پر شک شبہ کرنے اور دھمکیاں دینے سے باز نہیں آتے تو اپنی رقم واپس لو اور دفان ہو جاؤ۔''

نورالدین نے اسے ٹھنڈا کیا، اور معاملہ طے ہو گیا۔

عبدالسلام معمار تھا۔ اسے تعمیر کا کام پسند تھا، ایک کے بعد ایک پتھر چننا اور پھر اپنے سے کہنا کہ یہ سب اس کے ہاتھوں کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں کسی صناع کی روح تھی۔ بعضے گھر جن کی اس نے مرمت کی تھی، ان کی قدر و قیمت بڑھ گئی تھی۔ کام اگر خوش اسلوبی سے انجام پائے تو اسے خوشی ہوتی تھی، اور کام پر دیر سے پہنچنے سے نفرت تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے پرانے روایتی گھروں میں نئی گنجائشیں پیدا کرنا اچھا لگتا تھا۔ بعض یورپی خاص اسی کو کام پر رکھتے تھے، اور اس سے اسے بڑی تسکین ہوتی اور وہ خود اپنے اور اپنے کارندوں سے زیادہ محنت طلب کرتا۔

کشتی پر سوار ہوتے وقت نورالدین بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا، اور یہی پیکر اس دن سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ عبدالسلام نے تنگنائے عبور کرنے کی ان چوری چھپے کی حرکتوں کے خلاف ایک انجمن قائم کی تھی اور ایسے کئی خاندانوں کو اس میں ملا لیا تھا جن کے پیارے جان سے جاتے رہے

Scanned with CamScanner

تھے۔ یہ لوگ ساتھ نماز پڑھنے باقاعدگی سے مسجد میں جمع ہوتے۔ زیادہ ٹھوس طریقے پر، یہ لوگ اربابِ اختیار سے مسئلے کی بابت کچھ نہ کچھ کرنے کا مطالبہ کرتے۔ یہاں تک کہ ہمت کر کے براہ راست شاہ کو بھی لکھا تھا، اور درخواست کی تھی کہ وہ اس خونیں بہاؤ کو کسی طور ختم کرائے۔ انھیں اس پر کافی حیرانی ہوئی کہ بجائے عام رمی سے جملوں پر ٹرخانے کے، شاہ کے مشیروں میں سے ایک نے بڑے لطف وعنایت سے انھیں جواب دیا۔ اس نے بڑے انسانی جذبے کے ساتھ انھیں مطلع کیا کہ شاہ عنقریب قانون سازی کے لیے ایک کمیشن مقرر کرنے والا ہے تاکہ اس مسئلے کو پارلیمانی مباحث کے لیے پیش کیا جائے۔ اور یہ بھی کہ انھیں اس صورتِ حال پر جو مغرب کے لیے الم انگیز ہے اور باہر اس کی عزت کو بٹا لگاتی ہے، صدق دلی سے افسوس ہے۔

عبدالسلام کو اس پر فخر محسوس ہوا کیونکہ شاہ کو خط لکھنے کا خیال اسی کو آیا تھا۔ اس نے خط لکھنے کے لیے عازل کو کمرے میں تنہا بٹھا دیا تھا۔ رہا عازل، تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں تھا کہ اس کا کوئی نتیجہ نکلے گا۔

''تم سمجھتے ہو کہ شاہ کو تمھارا خط پڑھنے کے علاوہ کوئی کام نہیں؟ اور اگر معجزاتی طور پر یہ اس تک پہنچ بھی جائے تو کیا تمھارے خیال میں وہ کچھ کرے گا بھی، تمھیں جواب دے گا؟ خیالی پلاؤ پکائے جاؤ! اس کے اردگرد اتنے لوگوں کا ازدحام ہے کہ کھڑکی کے باہر تک نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اسے حقیقت سے نظریں چار کرنے سے باز رکھتے ہیں، اور صرف اس لیے کہ یہ لوگ اپنا مرتبہ کھودینے سے خائف ہیں، ہر روز اسے یہی بتاتے ہیں کہ سب کچھ ایکدم ٹھیک ٹھاک ہے۔ عزت مآب، آپ کسی چیز کی فکر نہ کریں۔ عزت مآب ان محلّوں کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں جہاں سے لوگ خفیہ طور پر مہاجرت کرتے ہیں، 'بنی مکادہ'، یا 'الادریسیہ'، یا 'حی صدام'؟ عزت مآب، ہم آپ کے حکم سے ادارۂ امن کے ذریعے اس کا انتظام کروا رہے ہیں... پھر وہ اسے چند دن انتظار کرنے دیتے ہیں اور اس اثنا میں ان علاقوں کی ٹیپ ٹاپ کرواتے ہیں، دیواروں پر نیا رنگ پھرواتے ہیں، ناپسندیدہ عناصر کو باہر نکلواتے ہیں، ہر نکڑ پر ایک سپاہی کھڑا کردیتے ہیں، وغیرہ، وغیرہ۔''

اس طرح عبدالسلام مہاجرت دشمن تشدد پسند بن گیا، اور خود کو تنگنائے عبور کرانے والوں کی مخالفت کے لیے وقف کر دیا۔ وہ ہر جگہ جا پہنچتا اور ایسے لوگوں سے جو اس پار جانے کی تیاری کر رہے

Scanned with CamScanner

ہوتے، کہتا کہ ان کے یورپ کے ساحلوں تک صحیح سلامت پہنچ جانے کا امکان دس میں ایک سے زیادہ نہیں۔ اس نے بعض قہوہ خانوں میں شاہ کے خط کی نقول بھی تقسیم کیں۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا جب وہ اسے اس قسم کا جواب دیتے:

''دس میں سے ایک امکان؟ کچھ نہ ہونے سے بہرحال بہتر ہے! ایک جوکھم، دور کی کوڑی۔ دوسری طرف، اگر ہم یہاں اس قہوہ خانے میں دہی جمائے بیٹھے رہیں تو ہماری قسمت سدھرنے سے رہی، بالکل، اور ہم دس سال بعد بھی یہیں ہوں گے، اور یہی نیم گرم دودھ پڑا قہوہ پی رہے ہوں گے، کیف کے کش لگا رہے ہوں گے، اور کسی معجزے کا انتظار کر رہے ہوں گے! دوسرے لفظوں میں: معجزہ اگر کچھ ہے تو کام کاج ہے، شائستہ کام — جس میں اجرت بھی اچھی ملتی ہو، عزت بھی کی جاتی ہو، سلامتی بھی ہو، اور وقار بھی۔۔۔''

عبدالسلام کا بس چلتا تو وہ معجزے بھی کر دکھاتا، لیکن وہ تو صرف ایک معمار تھا، ایک آدمی جو اپنے بھائی سے محروم ہو گیا تھا اور اس محرومی پر دن رات غم کاٹ رہا تھا۔

جب بھی وہ جوابی حجت کی کوشش کرتا تو ہکلانے لگتا، اور لوگ اس کا مذاق اڑاتے۔

''اے لو، وہ آ پہنچا۔ تم ہمیں پھر 'اپنا ملک اپنے بچوں کا محتاج ہے' والا لیکچر دینے آ گئے، ملک جو ہمیں نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ اگر سب باہر چلے گئے تو ملک کہاں رہ جائے گا۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ہم ملک سے محبت کرتے ہیں، لیکن ملک ہم سے کب محبت کرتا ہے! کون ہمیں یہاں رہنے کی وجہ مہیا کرنے کے لیے انگلی بھی اٹھا رہا ہے — نہیں دیکھ رہے کہ یہاں کیا ماجرا ہے؟ تمھارے پاس پیسہ ہے، تم کھلاتے ہو، رشوت دیتے ہو، لوگوں کی جیبیں بھرتے ہو، ظاہر کرتے ہو کہ مرنجان مرنج ہو، اور پھر دیکھو! جب تک یہ حال ہے، تم ہم سے یہ توقع کیسے کر سکتے ہو کہ ملک سے محبت کریں؟''

''لیکن تم سمجھتے نہیں، ملک ہم ہیں، ہمارے بچے ہیں، اور ان کے بچے!''

ایک بار جب بحث اس مقام پر پہنچی تو عازل نے مداخلت کی تھی۔ اس وقت عبدالسلام کا چہرہ مارے غصے کے سرخ پڑ گیا تھا اور لوگوں کی نگاہوں میں جو کچھ تھا اس نے عازل کو مضطرب کر دیا تھا۔ قہوہ خانے کے ان لوگوں کی نظر میں عازل کامیاب آدمی تھا، لیکن اس کامیابی کی اسے بڑی شرمناک قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ عازل نے سب کو اپنے حساب میں شراب پلوائی اور کہا:

Scanned with CamScanner

''میں نے مراکشیوں کو وہاں بڑی بری حالت میں دیکھا ہے۔ بھیک مانگتے ہیں، سڑکوں پر آوارہ گھومتے پھرتے ہیں، اور چھوٹے موٹے غیر قانونی سودوں پر زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ کوئی خوش آئند تصور نہیں۔ تھوڑا سا انتظار کرو: مجھے معلوم ہوا ہے کہ عنقریب یورپ کو لکھو کھا مہاجروں کی ضرورت پڑنے والی ہے۔ چند دن کی بات ہے، یورپی خود تمھیں لینے آئیں گے۔ پھر تم وہاں فخر کے ساتھ جا سکو گے اور جان بھی خطرے میں نہیں پڑے گی۔''

''صرف اس وقت جب ہماری تھوتھنی بھی تم جتنی من موہنی ہو!'' کسی نے آوازہ بلند کیا۔

''کام میں ہاتھ استعمال نہ ہو رہے ہوں تو آدمی اسی طرح تقریر جھاڑتا ہے۔۔۔'' ایک اور نے ہاں میں ہاں ملائی۔

عازل ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کر چل دیا، جلد ہی عبدالسلام بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اُس شام عازل نے اپنے دوست سے رازداری کے ساتھ اعتراف کیا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں شرمسار ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ اگر موقع ملتا تو وہ بھی یہی کرتے۔ ان دنوں حالات میرے لیے پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ میگیل نے ابھی ابھی کنزہ سے شادی کر ڈالی ہے، کم از کم کاغذی، تاکہ اسے ویزا مل جائے اور طنجہ سے نکلے۔ وہ بارسیلونا میں ہمارے ساتھ رہے گی، یہاں تک کہ اس کی ملازمت اور رہائش کا انتظام ہو جائے۔ ماں بھی کسی نہ کسی دن ہمارے پاس آ جانے کی توقع کر رہی ہے! تم تصور کر سکتے ہو؟ یہ نرا پاگل پن ہے! ایک بات بتاؤں؟ میرا حال اچھا نہیں۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس تمام بکھیڑے میں آخر میرا کیا مقام ہے، کیا حیثیت ہے۔ جعلساز، پرلے درجے کا بہروپیا، جو ڈھونگ رچانے اور فرار میں دن گزار رہا ہے — مجھے صرف سہام کی قربت میں ہی اطمینان محسوس ہوتا ہے، لیکن اسے مرنے تک کی فرصت نہیں، اور پھر وہ بارسیلونا میں رہتی بھی نہیں!''

عبدالسلام خاموشی سے سنتا رہا۔ ایک سوال ضرور تھا جو وہ پوچھنا چاہتا تھا، سوال جسے لفظوں میں ادا کرنا مشکل تھا۔

''تمھیں وہ دن یاد ہیں جب ہم سیر کرنے پہاڑ جاتے تھے، اور کبھی ساتھ لڑکیاں نہیں ہوتی تھیں؟ اور جب ہم کھا پی لیتے تو قادر سامی کے ساتھ غائب ہو جاتا تھا، وہ چھوٹا گول مٹول سا لڑکا؟

Scanned with CamScanner

واپس آ کر کہتا، لو اب تمھاری باری ہے، اور ہم جاتے اور سامی کو پیٹ کے بل پڑا ہوا اپنا منتظر پاتے۔۔۔''

''یہ سب مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو؟''

''صرف یہ یاد دلانے کے لیے کہ ہمیں لونڈوں کا تجربہ ہو چکا ہے! سو اب میں جو جاننا چاہتا ہوں وہ یہ ہے: تم اور تمھارے اسپینی کے درمیان کیا پیش آتا ہے؟ اور پر کون ہوتا ہے؟''

''میں مرد ہوں، زامل نہیں!''

''مجھے اسی کا یقین تھا! خیر، پتا ہے، ننھے سامی نے شادی کی اور اب اس کے دو بچے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بات ہمیشہ کے لیے یقینی یا طے نہیں ہوتی ہے۔ اگر تم اس سے ملاقات کرنا چاہو تو وہ وزارتِ اقتصاد میں اہم عہدے پر فائز ہے، پورے شعبے کا سربراہ ہے، جہاں اس کی میزوں کے نیچے بڑا مال ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا رہتا ہے۔ بہر حال، لوگ کہتے ہیں وہ اس مقام پر خود کو جنسی طور پر پیش کر کے پہنچا ہے، اور کہ وہ دوہری زندگی گزار رہا ہے، کہ اس کی بیوی اس سے باخبر ہے لیکن فضیحتے کے خوف سے چپ رہتی ہے۔ تو دیکھا، معاملات ہمیشہ اتنے سیدھے سادے نہیں ہوتے! ہمارے ملک میں زامل دوسرا ہوتا ہے، یورپی سیاح، مراکشی کبھی نہیں، اور گو اس کے بارے میں بات نہیں کی جاتی، لیکن یہ درست نہیں، ہم تمام دوسرے ملکوں کی طرح ہی ہیں، بس ہم ان معاملات کے بارے میں خاموش رہتے ہیں۔ ہم ان میں سے نہیں جو جا کر ٹیلیوژن پر اعتراف کرتے پھریں کہ ہمیں مرد پسند ہیں!''

ایک لمحے کے لیے عازل اپنے دوست کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا، پھر پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟

''میں، میں مکان تعمیر کرتا ہوں، کمرے بناتا ہوں، عاشقوں کے گھونسلے۔ شادی نہیں کی ہے کیونکہ مجھے لونڈے پسند ہیں۔ کسی کو اس کا پتا نہیں، لیکن میں تمھیں بتا سکتا ہوں۔''

''تم امرد پرست ہو!''

''نہیں۔ میں ادل بدل کرتا رہتا ہوں، کبھی مرد، کبھی عورت۔ اس کا انحصار موسم پر ہے!''

''موسم پر؟ کیوں؟''

Scanned with CamScanner

''اس لیے کہ گرمیوں میں لونڈیاں بڑی شہوت میں ہوتی ہیں، اور لونڈے، تو میں انھیں سردیوں میں ترجیح دیتا ہوں۔تم میرے دوست ہو، ہو نا؟ سو کچھ بھی کرو، بس کسی سے کہنا نہیں . . . ''

# 18

## سہام

عازل نے ریل گاڑی سے بارسلونا لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ ماربیا ٹھہر کر اس نے سہام کو فون کیا۔ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی: بچی نے ابھی ابھی ایش ٹرے اس کے منھ پر پھینک دی تھی، اور بچی کے ماں باپ جنوبی فرانس کے ایک اسپا (spa) گئے ہوئے تھے۔ سہام کو چوٹ خاصی تکلیف دے رہی تھی، لیکن اس سے بھی زیادہ حوصلہ شکن یہ آگہی تھی کہ معذور بچی کی دیکھ بھال کی اہلیت اس میں نہیں تھی۔ سہام لڑکی کا حتی المقدور خیال رکھتی اور کبھی کوئی شکایت نہ کرتی، لیکن اس معاملے میں کوئی پیشرفت ہوتی نہ دیکھ کر اس کی ہمت ٹوٹنے لگی تھی۔ سو وہ بڑی بے قراری سے رات کو وداد کے سو جانے کا انتظار کرتی۔ صرف اسی وقت اسے کچھ آرام کا موقع ملتا تھا۔ تھکن سے چور وہ عام طور پر ٹیلیوژن کے سامنے بیٹھ جاتی اور جو بھی اس پر دکھایا جا رہا ہوتا، بس دیکھے جاتی۔ کبھی کبھی سوچتی کہ اگر طنجہ میں ہوتی تو اس کی زندگی کا کیا طور ہوتا۔

وہاں، اس کا طرزِ عمل چار و ناچار وہی ہوتا جو دوسروں کا تھا۔ کسی دعوت، یا دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر جانے کا موقع ہاتھ سے نہ نکلنے دیتی۔ دوسری لڑکیوں کے حالات بھی وہی تھے جو اس کے تھے۔ یوں اپنے باس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے (جس سے، بمشکل، گزر اوقات بھر روزی مل پاتی)، وہ اس امید میں اس کی داشتہ بن جاتی کہ کسی دن اس کی بیوی بھی بن جائے گی۔ وہ ہر دام میں آئی ہوتی، ہر پیش پا افتادہ فقرہ دہرایا ہوتا، ہر غیر ممکن کا خواب دیکھا ہوتا۔ مشرقِ بعید سے درآمد کیے ہوئے پارچے خریدے ہوتے، ان سے قفطان بنائے ہوتے، جنھیں سال میں ایک ہی بار پہنا ہوتا، ماں کو مولائی عبدالسلام کے سالانہ عرس میں شرکت کے لیے لے گئی ہوتی: اور رفتہ رفتہ اپنے سارے خوابوں

Scanned with CamScanner

سے دستبردار ہو کر آخر میں کسی رنڈوے سے شادی کر لی ہوتی جو اپنی جوانی سے، بہت دور نکل چکا ہوتا، اور اس کے بچوں کی مصیبتیں اٹھاتی... بایں ہمہ، جب ان باتوں پر غور کیا تو اسے اپنی موجودہ صورتِ حال وہاں ملک میں اپنی عم زادیوں اور سہیلیوں کی حالت کے مقابلے میں قابلِ ترجیح نظر آئی۔ اس نے اپنی سہیلی وفا سے سنا تھا، جو ہائی اسکول کی طالبہ تھی، کہ اس کے حمل ٹھہر گیا ہے۔ وہ ایک مکمل کابوس میں آ پھنسی تھی۔ اور جس نے یہ کارنامہ کر دکھایا تھا، وہ صرف ہنسا اور وفا کی چھٹی کر دی۔

''مجھے پریشان مت کرو۔ سترہ سال کی جو لڑکی پہلے مڈ بھیڑ ہونے والے کے ساتھ ہمبستری کرتی ہے، طوائف ہوتی ہے، سو اب تم جانو اور تمھارا کام جانے! جاؤ جا کر حمام کی منتظمہ سے ملو: وہ تمھیں کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس بھیج دے گی — دو تین آدمیوں کے ساتھ سو سلاؤ، اور تمھاری پریشانیاں رفو چکر ہو جائیں گی...''

وہ کسی ڈرامے کے اداکار کی طرح لگ رہا تھا۔ وفا کو چپ لگ گئی۔ ایک دن وہ اس کے گھر جا پہنچی اور اس کی بیوی سے ملنے کے لیے کہا، اور اس کو اپنی رام کہانی سنائی۔ اور یہ وہ بیوی تھی جس کے ساتھ شوہر نے دھوکا کیا تھا جس نے وفا کے لیے ایک محفوظ اسقاط کا انتظام کروایا۔

''میں اس کی عادی ہو چلی ہوں،'' وہ بولی۔ ''ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا ہے۔ میرا شوہر واقعی جنس کا دھتی ہے — صرف مباشرت ہی نہیں کرتا، بلکہ عضو تو عضو، خصیے تک گھسیڑ دیتا ہے، گھامڑ۔ میں صرف پانچ بچوں کی خاطر اسے برداشت کر رہی ہوں۔ جب بڑے ہو جائیں گے، لات مار کر اسے باہر کر دوں گی!''

عازل لونگ روم میں بیٹھا وِداد کے سو جانے کا انتظار کرتا رہا تا کہ بالآخر سہام اس کے پاس آئے۔ اس نے کمرے کے طرزِ آرائش پر غور کیا۔ مستشرقی انداز کی درجنوں تصویریں تھیں، سب کی سب نقلی، یا بلکہ خاصی اچھی نقلیں۔ گھر میں نقلی تصویر لٹکانے کی آخر کیا تک تھی؟ تا کہ اصل کی بازخوانی کرے؟ خالی جگہ بھرے؟ یہ دکھانے کے لیے کہ آدمی کو جس انداز میں انیسویں صدی کے مصوروں نے ہمارا تصور کیا تھا اس سے دلچسپی ہے؟ میگیل کے گھر میں کوئی نقلی مال نہیں تھا، سب چیزیں اصلی تھیں۔

سہام نے کھانا تیار کیا، عازل نے شراب کی بوتل نکالی، اور دونوں نے پرلطف ماحول میں کھانا کھایا۔ سہام نے کہا کہ اس نے مالکہ کو عازل کے بارے میں بتا دیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ عازل

Scanned with CamScanner

اس کی عدم موجودگی میں وہاں آ سکتا ہے۔ بس اس نے ایک ہی چیز کی ممانعت کی ہے، کہ شراب نہ پی جائے۔ بہر حال، اس شام یہ کوئی مسئلہ نہیں، کیونکہ اس کے لوٹنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ انھوں نے مجامعت نہیں کی، لیکن رات بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ عازل صوفے پر سویا، سہام اپنے کمرے میں۔

سہام نے بالآخر اس کلاس میں شامل ہونے کی درخواست دے دی تھی جو ہفتہ وار مالاگا کے معذوروں کے مرکز میں منعقد ہوتی تھی۔ وہ پیر کی صبح نکلتی اور شام کے ختم ہونے پر لوٹتی۔ ایک دن اس نے عازل کو رات کے کھانے پر اور بعد میں ہوٹل کے اس کمرے میں مدعو کیا جو وداد کا باپ ہمیشہ اس کے لیے بک کراتا تھا۔ عازل اچھے موڈ میں نہیں تھا۔ جھلایا ہوا اور کچھ مضطرب سا تھا، سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا اور کسی چیز پر ارتکاز نہیں کر پا رہا تھا۔ پہلی بار اس نے ڈاکٹر، یا شاید کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔

''میری طبیعت بھی بھر گئی ہے: میں خوش نہیں، جونک کی سی زندگی گزار رہا ہوں، اور پھر معاملات میں پیچیدگی بھی آ گئی ہے — کنزہ کو کسی نہ کسی قسم کی ملازمت تلاش کرنی ہوگی، اور مجھے سوانگ رچاتے رہنا ہوگا، جبکہ مجھے زندگی میں استحکام کی ضرورت ہے، وضاحت کی . . . ''

''تمھارے نزدیک میگیل کی کیا حیثیت ہے؟''

''میرے لیے اہمیت رکھتا ہے، مجھے بہت زیادہ پسند ہے؛ اس نے میری اعانت کی ہے، ہمارے گھر والوں کی مدد بھی کر رہا ہے، لیکن آدمی کب تک بیٹھا دوسرے کی روٹیاں توڑ سکتا ہے! میگیل کہتا ہے کہ وہ مجھے چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے، وہ چاہتا ہے، لیکن میں — مجھے اس سے کہاں محبت ہے، کبھی کبھی تو اس کا چھونا تک مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اب تو میرا عضو بھی کھڑے ہونے سے جواب دے جاتا ہے۔ اگلے دن کیا ہوا کہ اس نے مجھ سے ایک نیلے رنگ کی گولی نگلنے کو کہا، 'ویاگرا' وغیرہ، یقین کر سکتی ہو؟ میری عمر میں؟ میں ایک طوائف بن گیا ہوں، ہاں، بس طوائف، یا کم از کم محسوس یہی کرتا ہوں۔''

سہام نے معاملے کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس کے عضو کو سہلانے لگی، لیکن وہ

Scanned with CamScanner

تیار ہو کر نہ دیا۔
''خواہش نہیں ہو رہی؟''
''نہیں، یہ خواہش کی بات نہیں، بس مضطرب اور دباؤ میں ہوں، اس لیے استادہ نہیں ہو رہا!''
''عارضی بات ہے، دباؤ کا نتیجہ، اور میرے بارے میں متفکر نہ ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم مرد ہو اور مجھے تمھارے جفتی کرنے سے عشق ہے۔ اپنے خیالات کو یکسو کرو اور اپنے سے سچے رہو، یہی اہم بات ہے۔''
''مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہی ہوگا۔''
''اگر ہم طنجہ میں ہوتے، تو میں تمھیں الحاج مبارک کے پاس لے جاتی۔ باصلاحیت آدمی ہے۔ تم 'محصور' ہو گئے ہو۔ کسی عورت کا کیا دھرا ہے، اس نے جادو کر دیا ہے!''
''یہ بکواس بند کرو، تم جانتی ہو جادو وادو کا کوئی وجود نہیں۔''
بہت رات گزرنے پر عازل ریل گاڑی کے ڈبے میں کسی مردے کی طرح سویا ہوا تھا۔

# 19

## کنزہ

تین ماہ کے بعد کنزہ بارسلونا میں کسی سچ مچ کی شہزادی کی طرح وارد ہوئی۔ میگیل ہوائی اڈے پر خیر مقدم کے لیے موجود تھا اور گلابوں کے گلدستے کے پیچھے تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔ کنزہ کے ہاتھ اور پاؤں مہندی سے سجے ہوئے تھے، اور وہ جذبات کی یورش سے اتنی مغلوب ہو گئی تھی کہ ڈگمگا کر تقریباً گر پڑی۔
میگیل نے اسے مہمانوں کے کمرے میں رکھا۔ اپنے بقیہ سامان کے ساتھ وہ مختلف کھانے کی چیزوں کا ایک پورا کھوکھا لائی تھی جنھیں للا زہرہ نے خود تیار کیا تھا۔ عازل کچھ خجل سا ہو گیا اور مسکرانے کی کوشش کی، یہ ظاہر کرنے کی کہ وہ اس کی آمد سے خوش ہوا ہے۔ مراکش اپنے پکوانوں کے ساتھ

اسپین میں داخل ہو رہا تھا: مرغ کا زیتون اور سکھائے لیموں پڑا طاجن، میٹھے ٹکڑے، عرق بادام کی قرون الغزال پیسٹریاں، رمضان کے لیے شہد بھرے کیک، مختلف مسالے، خشک پودینہ، پسا دھنیا، لوبان، اور بھرنے کے لیے کاغذوں کا ایک دفتر جس پر جلی حروف میں 'للّا زہرہ' کا لیبل چسپاں تھا۔

عازل نے آنکھیں بند کر لیں۔ میگیل ترچھی نگاہوں سے اس کی حرکات وسکنات کا مراقبہ کرتا رہا۔

''میگیل، معاف کرنا — میں سیر بھر صبر خریدنے بازار جا رہا ہوں۔''

''اور یہ کس بازار میں بکتا ہے؟''

''جیزوئٹس (Jesuits) کے ہاں!''

''درست کہا۔ مجھے یہ خیال کبھی نہ آیا ہوتا۔ خیر، اہم یہ ہے کہ واپسی میں دیر نہ لگانا۔''

کنزہ اپنی نئی جگہ سے جلد مانوس ہو گئی۔ وہ اسپینی زبان سے واقف تھی، اس سے ملازمت تلاش کرنے میں سہولت ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسی ملازمت مل جائے جس کا تعلق اجتماعی امور سے ہو، مثلاً، حکومت اور مہاجرت کرنے والوں کے درمیان رابطے کا کام۔ اس نے اپنا راستہ آپ تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اور پکا ارادہ کہ وہ میگیل پر ایک نیا بوجھ نہیں بنے گی۔ میگیل نے اسے چند سفارشی خط لکھ کر دے دیے تھے اور اس کے لیے اِدھر اُدھر کچھ فون بھی کیے تھے۔ مہینہ بھر ہی گزرا تھا کہ اسے ریڈ کراس میں کام مل گیا۔

جب کنزہ نے خاموشی سے باورچی خانے کے کام میں مدد دینے کی کوشش کی تو کارمن نے دوٹوک انداز میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔ میگیل کنزہ کو 'سرابی بیوی' کہتا تھا اور فوراً ہی اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ کنزہ کی توانائی، اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنے کا مضبوط ارادہ، اور کشادہ ذہنی — میگیل اس کی ان خوبیوں کو بڑی تحسین کی نظر سے دیکھتا تھا۔

''تم آنے والی کل کا مراکش ہو،'' اس نے کنزہ کو مستعدی سے کام کرتے دیکھ کر کہا۔ ''اس ملک کو عورتیں ہی کچھ بنائیں گی۔ یہ بڑی زبردست ہیں۔ اور میں تو یہاں تک اعتراف کروں گا کہ تمھاری نسل کی عورتیں میری کمزوری ہیں۔ یہ مجھے پسند آتی ہیں، اور میں ان پر بھروسا کرتا ہوں۔''

رہا عازل، تو وہ بہن کے ساتھ تنہا ہونے سے احتراز کرتا اور ہمیشہ برہم سا رہنے لگا تھا۔ جب

Scanned with CamScanner

میڈرڈ کی گیلری کا منتظم بیمار ہوا تو عازل کو اس کی جگہ بھیجا گیا، لیکن میگیل کو جلد ہی پتا چلا کہ گیلری اوقاتِ کار میں اکثر بند رہنے لگی ہے۔ عازل پارٹی بازی کرتا، پھر سہ پہر ہونے تک پڑا سوتا رہتا۔ میگیل جانتا تھا کہ اس سے اس سلسلے میں کچھ کہنا بے سود ہوگا۔ عازل دن بدن اکھڑ اور خودسر ہوتا جا رہا تھا اور، اہم یہ کہ، بڑے خطرناک طور پر دباؤ کے عالم میں رہنے لگا تھا۔ اس سے رنجیدہ ہو کر، میگیل نے ایک پرانے دوست سے اس کا ذکر کیا، جس نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''تمھارا دوست عازل اس قسم کی زندگی کے لیے نہیں بنا۔ اگر تم اسے کسی تعمیراتی جگہ پر ایک ادنیٰ مزدور کی طرح لگا دیتے تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بہت خوش رہتا، کیونکہ اس وقت وہ اپنے جیسے ہزاروں دوسرے ہم وطنوں ہی کی طرح ایک مہاجر ہوتا۔ اس کے بجائے تم نے اسے ایک پاشا بنا رکھا ہے، خرچ کرنے کے لیے بے حساب پیسہ دے رکھا ہے، ہر چیز کسی مشقت کے بغیر میسر ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ امرد پرست بھی نہیں ہے! اس کے خاندان والوں کو اپنا 'سانتا کلاز' مل گیا ہے۔ بس دیکھتے جاؤ، میرے پیارے، جلد ہی تمھارا پتّا ہونے والا ہے۔ بیٹے اور بیٹی کے بعد، ماں اور نانی بھی، اگر موجود ہے، تم پر لدنے والی ہیں۔ یہ لوگ، بس کسی سادہ لوح کے ہتھے چڑھ جانے کی دیر ہے اور یہ اسے چوس کر رکھ دیتے ہیں!''

''ان باتوں سے نسل پرستی چھلک رہی ہے!''

''نہیں، بلکہ تجربہ بول رہا ہے۔ احمد یاد ہے؟ وہ پرکشش، آسمانی مخلوق احمد؟ وہ مجھے کیسے کیسے عذاب نہ دیتا تھا۔ اس نے مجھے لوٹ لیا، بڑی بے شرمی کے ساتھ مجھ سے فائدہ اٹھایا۔ سادہ سی بات تھی: اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے عضو کے زور پر مجھ سے سب کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ میں اس کی موجودگی میں موم کی طرح پگھل جاتا، اس کی کسی خواہش سے انکار کرنا میرے بس میں نہ رہتا۔ پھر وہ بہت سارا مال سمیٹ کر چلتا بنا۔ وہ مجھے بلیک میل کر رہا تھا، میرے دونوں بچوں سے بھانڈا پھوڑنے کی دھمکیاں دیتا تھا، جن سے میرے تعلقات پہلے ہی نرم گرم ہیں، کیونکہ ان کی ماں انھیں ہمیشہ میرے خلاف ورغلاتی رہتی ہے۔ فضیحتے سے گریز کی خاطر میں اپنی زبان بند کیے رہا۔ نتیجہ: جو کچھ ہاتھ لگا، لے کر چمپت ہو گیا۔ معلوم ہے اب کیا بن گیا ہے؟ بین الاقوامی دھوکے باز، اور بڈھے ٹھڈوں کو پھانسنے میں اختصاص رکھتا ہے۔ میور کا اس کا اڈا ہے، کہ دولتمند جرمن امرد پرست وہیں کا قصد کرتے ہیں۔ قحبہ

Scanned with CamScanner

ہے، اعلیٰ درجے کی طوائف۔ اب اگر بھولے سے بھی اس سے ٹکرا گیا تو بعید نہیں کہ اس کا قصہ ہی پاک کردوں۔''

''جانتا ہوں، اس نے اپنے بڈھوں کے تجربے سے بڑی دولت بٹور لی ہے۔ لیکن کبھی نہ کبھی ٹھوکر کھا کر رہے گا اور چاروں شانے چت کسی زنگ آلود پھل پر جا پڑے گا جو اس کی آنتیں تک نکال کر رکھ دے گا۔''

''یہ تم میری تسکین کی خاطر کہہ رہے ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے فن میں پہنچا ہوا ہے، اور تو اور، اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، رمضان کے روزے رکھنے کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ان دنوں قانون سے بھاگا ہوا ہے، مختلف ملکوں کی پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ بظاہر اس پر ایک بڑے نامی گرامی امریکی وکیل کی موت کا الزام ہے جسے اس نے ایسی گولی کھلوادی تھی جو قلب کے مریض کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔ متوفی کے بیٹوں میں سے ایک نے میورکا کی پولیس سے تفتیش کرنے کے لیے کہا ہے، کیونکہ اسے یقین ہے کہ اس کے باپ کو قتل کیا گیا ہے۔ احمد بالکل یہ کرسکتا ہے؛ ایک دن جب ہم پیسے کے معاملے میں تکرار کر رہے تھے، تو اس نے مجھے بھی وہی گولی کھلا دینے کی دھمکی دی تھی۔ پرلے درجے کا عیبی آدمی ہے۔ خدا کرے ایک دن اپنے کیے کا خمیازہ بھگتے۔ ایسے آدمیوں میں سے ہے جن کا خاتمہ ٹھیک سر کے پیچھے گولی داغنے سے ہوتا ہے، اور جنھیں مار کر پارکنگ لاٹ میں دو کاروں کے بیچ میں ڈال دیا جاتا ہے۔''

''عازل ایسا نہیں۔ وہ بس پوری طرح ماؤف ہو گیا ہے، میری کمائی کھانے پر خجل، خاص طور پر جب سے بہن یہاں آئی ہے اور ملازمت کر رہی ہے۔''

''پیارے، جب آدمی ساٹھ کے پیٹے میں آجاتا ہے تو ترغیب ایک مشکوک مسئلہ بن جاتی ہے۔''

''آہ زندگی، یہ کتنی حسین ہے!''

''ہاں، پیارے، کتنی حسین!''

Scanned with CamScanner

# 20

## موحا

موحا، بڈھا موحا، مجنون موحا، عقلمند موحا، جگمگاتی آنکھوں اور گھنے بالوں سمیت اپنے پیڑ سے اترا اور 'کاسابراتا' کی طرف بھاگا، ایک قہوہ خانے کی طرف جہاں غیر قانونی مہاجرت کرنے والوں اور انھیں چوری چھپے تنگنائے عبور کرانے والوں کے درمیان سودے طے ہوتے ہیں۔

مول تول کا گھر، جو کاسابراتا کی کچی آبادی ہوا کرتا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ غریبوں کا جونا بازار بن گیا تھا جہاں بوسیدہ جوتوں سے لے کر ٹیلیوژن سیٹ تک ہر متصورہ شے مل جاتی تھی۔ چین کی بنی ہوئی مصنوعات اور جعلی اشیا نے رفتہ رفتہ غلبہ پالیا تھا۔ لیکن کاسابراتا میں موحا کی دلچسپی کسی اور ہی چیز سے تھی، یہ وہ لوگ تھے جو وہاں بیٹھے چائے پی رہے ہوتے یا کیف کی چلمیں۔

موحا نے میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھایا، بیرے سے اپنی گمبھیر آواز میں سگریٹ لائٹر لانے کے لیے کہا، اندر دو آدمیوں کو گھور کر دیکھا جو بظاہر کیف پی پی کر مدہوش ہو گئے تھے، اخبار کو ہوا میں لہرایا، اور اسے آگ دکھا دی۔

مجھے بھی آگ لگی ہوئی ہے۔ میں بھی اس اخبار کی طرح جل رہا ہوں جو سچ نہیں بولتا، یہ کہتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے، کہ حکومت ہمارے نوجوانوں کو کام دلانے کے لیے سب کچھ کر رہی ہے، اور جو تنگنائے عبور کرتے ہیں، انھوں نے خود کو مایوسی کے سپرد کر دیا ہے۔ اور ہاں، ساری امید تج دینے کی معقول وجہ بھی ہے، لیکن زندگی، زندگی آگے بڑھے جاتی ہے اور ہمیں حاشیے پر ڈال دیتی ہے (کاہے کا حاشیہ، خود معلوم کرو، میں نہیں بتاتا!)۔ بس زندگی اسی کا نام ہے، لیکن کون سی زندگی — وہ جو ہمیں کچل دیتی ہے، ہمارے چیتھڑے اڑا دیتی ہے؟ لو، ان خبروں کی راکھ سمیٹ لو جنھیں میں نے ابھی ابھی جلایا ہے: بہت ساری ہیں، جھوٹی خبریں، مثلاً یہ عورت جو 'دل سے دل تک،' آمنے سامنے، میرا چہرہ تمھارا چہرہ، والے کالم میں پوچھتی ہے کہ کیا وہ اپنے شوہر کو دہانِ فرج کی چوما چاٹی کرنے

دے۔ اور دوسری پوچھتی ہے کہ کیا ہمارے مذہب میں شوہر کے عضو کو منھ میں لینا جائز ہے... لیکن یہ کیا دیوانگی ہے؟ لگتا ہے ان خطوط کا کہیں وجود نہیں، بس کوئی شخص جو فرطِ تخیل سے پھٹا پڑ رہا ہے انھیں لکھ کر اخبار کو بھیج دیتا ہے، سو اب یہ بائیں بازو کا اخبار دھڑا دھڑ پیسہ بنا رہا ہے—یہ دیوانگی نہیں تو کیا ہے کہ ہر شخص یہ جاننے کے لیے مرا جا رہا ہے کہ دوسرے لوگ اپنی جنسی زندگی سے کیسے معاملہ کرتے ہیں! ٹھیک ہے، میں یہاں وعظ کرنے نہیں آیا ہوں: اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے ساتھ سونا چاہتی ہے تو سوئے، اخباروں میں ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ اچھا تو یہ لگ رہا ہے کہ تم اڑن چھو ہونا چاہتے ہو، رخصت ہونا، ملک سے مہاجرت کر جانا، یورپیوں کے یہاں جا رہنا چاہتے ہو، لیکن وہ تمھاری راہ نہیں دیکھ رہے ہیں، بلکہ یوں کہو کہ وہ اپنے کتوں، جرمن شیپرڈوں، ہتھکڑیوں، اور چوتڑوں پر پڑنے والی لات کے ساتھ تمھارے منتظر ہیں، اور تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ وہاں کام وام ملے گا، راحت ملے گی، شائستگی اور حسن۔ لیکن میرے بیچارے دوستو، وہاں صرف اداسی، تنہائی، اور براوقت ہی تمھارا منتظر ہے—اور ہاں، پیسہ بھی ہے، لیکن ان کے لیے نہیں جو وہاں بن بلائے پہنچ جاتے ہیں! ٹھیک ہے نا؟ تم خوب جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں: کتنے گئے اور ڈوب کر ختم نہیں ہوئے؟ کتنے گئے اور انھیں واپس نہیں بھیج دیا گیا؟ کتنے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئے اور کوئی نہیں جانتا کہ زندہ بھی ہیں—ان کے گھر والوں کو کوئی خیر خبر نہیں ملی، لیکن میں، میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں: یہیں ہیں، میری بغل میں، ایک دوسرے پر ڈھیر، چوراچکوں کی طرح چھپے بیٹھے ہیں، اور باہر نکلنے کے لیے اجالے کا انتظار کر رہے ہیں، اور یہ کوئی زندگی نہیں۔ اے تم! موٹے آدمی جس کی ٹوپی پیشانی کے نیچے تک آ رہی ہے! تم خود کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو، پیسہ اینٹھ کر انھیں موت کی راہ لگا دیتے ہو، لیکن ایک نہ ایک دن یہ تمھیں کھا جائیں گے، تمھیں ڈھونڈتے ہوئے تمھارے بستر تک پہنچ جائیں گے اور تمھارا دل، جگر، حتیٰ کہ خصیے تک چبا ڈالیں گے۔ بس دیکھتے رہو، ذرا پوچھ کر دیکھو کہ سیف کا کیا حشر ہوا، وہی جس نے اپنا نام حسام رکھ لیا تھا، کیونکہ وہ تلوار کو بھی ریوالور کی سی مہارت سے استعمال کرتا تھا: مُردوں نے اس کا حلق چیر کے رکھ دیا تھا، ہاں، سینکڑوں لاشے اسے ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے اور اس سے حساب بیباق کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے اور جب اس نے اپنی تلوار نکالی تو وہ مُردوں کی پتھرائی ہوئی نگاہوں سے پگھل کر رہ گئی تھی، اور قصائی کی چھری جیسے کاٹ دار ہاتھوں نے اس کے جسم

Scanned with CamScanner

کے لیرے لیرے کر دیے تھے۔ کوچ، ہاں کیوں نہیں؟ میں بھی کوچ کرنا چاہتا ہوں، اچھا تو سنو، میں مخالف سمت میں سفر کروں گا، ریگستان عبور کروں گا، ہوا کی طرح صحارا پار کروں گا، سرعت سے، آنکھوں سے اوجھل، پیچھے نہ نام ونشان نہ اپنی مہک چھوڑ جاؤں گا—— موحا وہاں سے کسی کی توجہ میں آئے بغیر گزر جائے گا۔ لیکن موحا، تم جا کہاں رہے ہو؟ میں افریقہ کی سمت میں جا رہا ہوں، ہمارے پرکھوں کی سرزمین، وسیع وعریض افریقہ، جہاں لوگوں کے پاس زندگی پر غور کرنے کا وقت ہے، اس کے باوجود کہ زندگی نے ان کے ساتھ فیاضی سے کام نہیں لیا ہے، جہاں لوگوں کے پاس بے غرضی سے کام کرنے کے لیے ایک لمحہ ہے: افریقہ، جس نے آسمان کی لعنتیں سہی ہیں، افریقہ، ٹائی لگائے ہوے کالوں نے جس کا سب کچھ لوٹ لیا ہے، اور ٹائی لگائے ہوے سفیدوں نے، ٹکسیڈو (tuxedo) پہنے ہوے بندروں نے، حتیٰ کہ ایسے لوگوں نے بھی جو قطعی غیر مرئی ہیں، لیکن افریقیوں کو اس کا علم ہے، وہ اس انتظار میں نہیں بیٹھے ہوے ہیں کہ کوئی آ کر انھیں بتائے کہ کیا ہو رہا ہے—— میں افریقہ کا قصہ یوں لے بیٹھا ہوں کیونکہ اس کے لوگ یہاں آنے کے لیے دن رات چلتے رہے ہیں، یہاں طنجہ آنے کے لیے، کیونکہ انھوں نے سنا ہے کہ طنجہ یورپ کا دروازہ ہے: یہاں یورپ کی مہک آتی ہے، یہاں سے یورپ اور اس کی روشنیاں نظر آتی ہیں، یہاں آدمی اپنی انگلیوں کی پوروں سے یورپ کو چھو سکتا ہے، اور اس کی خوشبو بڑی دل آویز ہے، یہ تمھارا منتظر ہے، بس آٹھ نو میل کی مختصر سی مسافت ہی تو ہے، اس کے بعد تم اس سے اور قریب آ جاتے ہو، یا سبتہ چلے جاؤ تو وہاں یوں محسوس ہوتا ہے کہ آدمی واقعی یورپ پہنچ گیا ہے، ہاں، سبتہ اور ملیلہ یورپی شہر ہیں، جہاں بس خاردار تار کی روک کو پھلانگنا ہوتا ہے—— ساحلی پولیس کہاں ہر چیز پر پہرہ دے سکتی ہے، بعض اوقات وہ ہجوم پر گولی چلا دیتی ہے، سو تنگنا ے کے یخ بستہ پانیوں میں مرنا یا سرحد کے کوتار پر، اس کا انتخاب تم کرو، میرے دوستو، افریقہ یہاں ہے، اور وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ کی حد طنجہ میں ہے، بندرگاہ پر، سوکو چیکو میں، یہاں اس بدبخت قہوہ خانے میں، اور وہ لرزتے سایوں کی طرح یہاں پہنچتے ہیں، غیر یقینی کی حالت میں، خلقت جس کا سارا جوہر نکل گیا ہے، جو سڑکوں پر ماری ماری پھرتی رہتی ہے، قبرستانوں میں جا کر سو رہتی ہے، بلیاں کھاتی ہے، ہاں، افواہ تو یہی ہے، مجھے اس پر یقین ہے، ایک فضول، گندی حرکت، افریقی اپنی روح کا کچھ اور حصہ کھو رہے ہیں، جبکہ ہم، سفید عرب

Scanned with CamScanner

(خیر، چلو بادامی، یا زیتونی یا دارچینی جلد والے کہہ لیتے ہیں)، ہم خود کو برتر سمجھتے ہیں، احمقانہ حد تک برتر، کہ ہمیں بالآخران کی صورت میں گھٹیا سمجھنے کے قابل مخلوق مل گئی ہے، لامحالہ ہماری نسلی برتری کو اپنی مشق اور نمائش کی ضرورت ہے، حالانکہ ہم تو پہلے ہی سے ناداروں کے ساتھ برا سلوک کرتے آئے ہیں، لیکن اگر نادار کالا بھجنگ افریقی ہو تو ہم آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، ہم انھیں حقارت سے دیکھنے پر خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں، ہم بعضے یورپی سیاستدانوں کا وطیرہ اختیار کرتے ہیں، جو تمھیں حقارت سے دیکھتے ہیں جبکہ حقیقت میں تمھیں دیکھ بھی نہیں رہے ہوتے... آہا، یہ رہا کنگ پن (kingpin)، سپاہیوں کا گرو گھنٹال، لیکن یہ چوری چھپے تنگنائے پار کرانے والوں کو نہیں پکڑتا، تم سرگرداں ہو کہ آخر انھیں کیوں چھوڑ دیتا ہے، واہ، یہ کون سی ایسی پراسرار بات ہے، لیکن بس اتنا ہی کافی ہے، آگے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا، منھ بند کر لوں گا، میرے ہونٹ سل گئے ہیں، اور اگر اس کے باوجود بھی تمھیں لفظ سنائی دیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خود بخود نکلے چلے آرہے ہیں، کھلے سمندر کی طرف جارہے ہیں، فرار ہو رہے ہیں، حقیقت بیان کر رہے ہیں — اچھا، مجھے پانی کا ایک گلاس دو، ننھی ملیکہ کو میری ضرورت ہے، وہ کھانس رہی ہے، ٹھنڈ میں جھینگے چھیلنے سے اسے نمونیا ہو گیا ہے، اسے دوا دلانی ہوگی، اس کے والد خریدنے کے اہل نہیں، میں چندہ جمع کرتا ہوں، ہمیں اسے بچانا ہے، وہ بڑی پیاری بچی ہے اور زندہ رہنے کی مستحق ہے، ہنسنے، رقص کرنے کی، اور پہاڑ پر چڑھ کر ستاروں سے باتیں کرنے کی...

''کوچ! کوچ! جس طرح بھی اتفاق ہو، کوچ، کسی بھی قیمت پر، غرقاب ہو کر، پانی پر بہتے ہوئے، پیٹ پھولا ہوا، چہرہ سمندری نمک کا چاٹا ہوا، آنکھیں مفقود... کوچ! بس تم یہی حل پیدا کر سکے ہو۔ سمندر پر نگاہ کرو: اپنے چمچماتے لباس میں یہ کس قدر حسین لگ رہا ہے، اس سے کیسی لطیف مہکیں اٹھ رہی ہیں، لیکن سمندر تمھیں ہڑپ کر جاتا ہے اور تمھیں پارہ پارہ کر کے اگل دیتا ہے...

''اب میں چلتا ہوں، ملیکہ میرا انتظار کر رہی ہے۔''

---

10_kingpin، جرائم پیشہ لوگوں کا سرغنہ یا سردار۔

Scanned with CamScanner

# 21

## عازل

کارمن بالکل مطمئن نہیں تھی۔ اس کا میگیل اپنے ہوش و حواس کھوتا جا رہا تھا۔ اس طفیلی —— وہ عازل کو یہی کہتی تھی —— کی بہن سے اس شادی نے اسے سخت برافروختہ کر دیا تھا۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کے مالک سے مطلب نکالا اور ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، کہ وہ ان سے اتفاق کیے جا رہا ہے اور کچھ سننے کا روادار نہیں۔ بوڑھے جپسی جوتشی اور افسوں ساز ماریا سے مشورہ کرنے کے بعد کارمن اس صورتِ حال کا خاتمہ کرنے کے مستحکم ارادے کے ساتھ گھر لوٹی۔ اس نے گھر میں لوبان کی دھونی دی اور مخصوص جگہوں پر لونگ کے دانے رکھ دیے۔ ماریا کے مطابق، اس حربے کی اثر پذیری میں کچھ وقت درکار تھا: بس صبر اور دعا کی ضرورت تھی۔

میگیل کو لونگ کی بو سے سخت نفرت تھی، جو اسے دنداں ساز کے کلینک کی یاد دلا دیتی تھی۔ اس نے کنزہ سے پوچھا کہ کہیں وہ تو یہ خوشبو نہیں استعمال کر رہی جو کوہِ اطلس کے دہقانوں کو مرغوب تھی۔ کنزہ بھونچکی رہ گئی اور خود بھی اس سگندھ کے منبعے کو تلاش کرنے لگی۔ اسے کارمن پر شبہ تھا، جسے کنزہ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی، لیکن اس نے اپنے گمان کو اپنی ذات تک ہی رکھا۔ میگیل کی بیوی اور گھر کی مالکہ ہونے کی حیثیت سے کنزہ کو ظاہر ہے فوقیت حاصل تھی، لیکن اس کا اولین سروکار اس سے تھا کہ معاملے کو خوش اسلوبی سے رفع دفع کر دیا جائے، اس لیے اس نے کچھ نہ کرنے کو ہی ترجیح دی۔ گھر بتدریج ایک ایسے تھیٹر میں بدلتا جا رہا تھا جس میں نہایت ردّی کھیل دکھایا جا رہا ہو۔

کنزہ نے ریڈ کراس کی عمارت کے کمرے میں رہائش اختیار کرنے اور بھائی کو اپنی روش بدلنے کی کوشش کرنے کا تہیہ کیا۔ اگرچہ وہ ہنوز اپنے اقامتی اور روزگاری اجازت ناموں کی منتظر تھی، جن سے اسے اسپین میں پورے اطمینان سے رہنے کا موقع مل جاتا، وہ خوب جانتی تھی کہ سارا مسئلہ عازل تھا، جو اب کم سے کم دکھائی دینے لگا تھا اور جس پر اس کا کوئی زور بھی نہیں چلتا تھا۔ بھائی سے جنسی معاملے میں بات کرنے سے اسے شرم آتی تھی؛ مراکشی خاندانوں کے معاشرتی طور طریق میں

ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔ اسے معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے، لیکن وہ اسے لفظوں میں کیسے ادا کر سکتی تھی؟ ایک دن اس نے یہ ذکر بمشکل چھیڑا ہی تھا کہ عازل بری طرح بپھر کر چلّانے لگا تھا اور ہر بات سے صاف منکر ہو گیا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہو، آخر مجھے سمجھتی کیا ہو؟ میں کوئی ذلیل طوائف نہیں، بھکاری نہیں، اور میگیل میرا دوست ہے، ایک پورے کنبے کو بچانے کے لیے خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ، ایک شریف اور سخی آدمی۔ تو تم کنایوں میں کیوں کہہ رہی ہو کہ اس کی سخاوت کے پیچھے کوئی مصلحت چھپی بیٹھی ہے؟ میری زندگی، میری اصلی زندگی کے بارے میں تمھیں خاک معلوم نہیں۔ بس حکم لگاتی پھرتی ہو اور برہم ہونا جانتی ہو۔ لیکن کیا یہ بھی معلوم ہے کہ میں خوش ہوں یا نہیں، اچھی زندگی گزار رہا ہوں یا بری، نفسیاتی طور پر آسودہ ہوں یا ناآسودہ، گولی مار کر بھیجا اڑا دینے کو تو جی نہیں چاہتا، نظروں سے اوجھل ہو جانے کو، روئے زمین سے معدوم ہو جانے کو تو جی نہیں چاہتا؟ یہ سب اپنے سے پوچھو اور یہ سوچنا بند کرو کہ میں یہاں صرف ناگفتنی چیزوں کی چاہت میں پڑا ہوا ہوں! تم مجھ پر شبہ کرتی ہو، لیکن تمھیں اپنی بقا سے بھی زیادہ اپنی ذات اور اپنی عزت کی پروا ہے، اور ہاں، میں زندہ رہنے کی پوری کوشش کرتا ہوں، چیزوں سے لطف اٹھانے کی، میں نہ کوئی سورما ہوں نہ عفریت، میں اپنی کمزوریوں کا شکار آدمی ہوں، مجھے مال و دولت سے عشق ہے، آسان زندگی سے الفت ہے، لیکن اب مجھے پتا چل رہا ہے کہ اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اور میں تمھیں نہیں بتاؤں گا کہ وہ کیا قیمت ہے، اور یہ تو ہرگز نہیں کہ میں اسے کس طرح ادا کر رہا ہوں!

''میں چاہتا تو عام راستہ اختیار کر سکتا تھا، اپنی تعلیم مکمل کر کے ملازمت ڈھونڈ سکتا تھا، باعزت کام، جس سے معاشرے میں میری آبرو ہوتی، جس نے میری ڈھارس بندھائی ہوتی اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا ہوتا، میں نے بڑے بڑے کام انجام دیے ہوتے، ایک راست باز آدمی بنتا جو اپنے خوابوں کی اب بھی پرورش کر رہا ہوتا لیکن پاؤں حقیقت میں جمے ہوتے، کارآمد اور مستعد۔ لیکن نہیں: میں ٹوٹ گیا تھا، اور صرف میں ہی نہیں، آیا تمھاری سمجھ میں؟ ہم جیسے ہزاروں نوجوان ہیں جن کا مستقبل مسدود اور تاریک ہے، افق پر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، جو ہر صبح اٹھ کر وہی کل والا دن گزارتے ہیں، تکرار میں جیتے ہیں، اسی بدبختی کو دہراتے رہتے ہیں، اور ان سے توقع یہ کی جاتی ہے

Scanned with CamScanner

کہ مایوسی کو پاس نہ پھٹکنے دیں، ترغیبات کے جال میں نہ آئیں، مدد کے لیے بڑھے ہاتھ کو ٹھکرا دیں کیونکہ وہ اتفاق سے کسی قابلِ شرم شے سے جڑا ہوا ہے! ہر صبح اسی قہوہ خانے میں جانا، ایک ہی جیسے لوگوں کو دیکھنا، اور جو کچھ انھوں نے گزشتہ رات ٹی وی پر دیکھا ہوتا اس پر ان کا وہی گھسا پٹا تبصرہ سننا، دو پڑھے لکھوں کو اس پر بحث کرتے سننا کہ اِس مرسیڈیز کا انجن اُس بی ایم ڈبلیو کار کے انجن سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے، کہ طنجہ میں جائیداد کی قیمت بڑھے گی یا گرے گی، کہ گرمیوں میں حبس ہوگا، کہ اسپین موروں پر اپنی سرحدیں بند کر دے گا، وہی دودھ پڑا قہوہ اور کالے بازار سے خریدی ہوئی امریکی سگریٹیں پینا، محسوس کرنا کہ وقت گزر کر نہیں دیتا، بس سستی سے گھسٹ رہا ہے، گھنٹے ہیں کہ گزرنے میں ناقابلِ بیان وقت لے رہے ہیں، اور آدمی کا حال یہ ہے کہ خلا میں تک رہا ہے، جو کچھ دماغ میں آتا ہے بک رہا ہے، جھوٹ موٹ کی دلچسپی لے رہا ہے، جی چاہ رہا ہے کہ ہر شے کو جہنم رسید کرے، میز کو لات مار کر الٹ دے، اس بوجھ بجھکو کی چمکتی سفید قمیص پر اپنا دودھ والا قہوہ انڈیل دے جو مسلسل ٹرائے جا رہا ہے، تو آدمی پتے کھیلنے لگتا ہے، ڈومینو کھیلنے لگتا ہے، اور اس طرح وقت کو فراموش کر دیتا ہے، وقت جو کسی جونک کی طرح ہمارے اندر اپنا راستہ بنا رہا ہے، ہماری توانائی چوسے جا رہا ہے، لیکن اس توانائی کو جو ہمیں دائروں میں دوڑا رہی ہے، ہم صَرف کریں تو کہاں؟ سو ہم عورتوں کی باتیں کرنے لگتے ہیں، وہ جن کا وجود ہے، اور وہ بھی جو ہمارے تخیل کی پیداوار ہیں، ہم ان کی فرجوں کی باتیں کرتے ہیں، ان کی چھاتیوں کی، اپنی گھٹن نکالتے ہیں، اور ہمیں خود پر فخر نہیں، نہیں، مجھے اپنے پر فخر نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہمیں تمیز سے رہنے کا سبق دیا جاتا ہے، قطار میں رہنے کا، ظاہری رکھ رکھاؤ کا، لیکن میری پیاری بڑی بہن، غربت قطار میں کہاں رہنے دیتی ہے، یہ آدمی کو ایک ہی جگہ منجمد کر دیتی ہے، لڑکھڑاتی کرسی پر بٹھا کر ہلنے جلنے سے روک دیتی ہے، کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتی، نہ جا کر یہ دیکھنے کی کہ آسمان کسی اور جگہ زیادہ خوشگوار ہے۔ نہیں، غربت ایک لعنت ہے اور تنہا میں ہی اس کی اذیتیں نہیں برداشت کر رہا ہوں: اس کا شکار تو تم بھی ہو، تم اس جعل سے بہتر کی مستحق ہو، کاغذات حاصل کرنے کی خاطر یہ جھوٹ موٹ کی شادی، کہ ہمارے برے دن جھاڑ لے جائے، ہماری تلخی، ہاں، تنہا میں ہی نہیں، میکسیکو جا کر دیکھو، ہاں بالکل، میکسیکو اور امریکہ کی درمیانی سرحد پر — لوگ کس طرح چوری چھپے اسے پار کر رہے ہیں۔ یہ خطرناک معاملہ ہے، اپنا ملک

Scanned with CamScanner

چھوڑنا اور جا کر اس ملک میں قسمت آزمانا جہاں پیسہ بادشاہ ہے... ہر جگہ لوگ اپنی بیخ کنی کے آرزومند ہیں، رخصت ہو جانے کے، جیسے کوئی وبا پھیلی ہو اور وہ بیماری سے بھاگ رہے ہوں، ہاں، غربت ایک بیماری ہے، ذرا افریقی عورتوں کی طرف دیکھو جو خود کو ذرا سی قیمت پر بیچ رہی ہیں، مراکشی مرد جو گاوٗدیوں کی طرح اسمگلنگ میں لگے ہوئے ہیں، اور جس دن پکڑے جاتے ہیں، اسپینیوں کو نسل پرستی کا الزام دیتے ہیں، کہ انھیں موروں سے نفرت ہے، سو یہ ہے ان کی جائے پناہ — جب سب دلیلیں ختم ہو جائیں تو نسل پرستی کا الزام بہرحال باقی رہتا ہے۔ ہاں، ہم مور ہیں اور ہم اچھے لوگ نہیں ہیں، ہم نے اپنا وقار کھو دیا ہے! آہ، اگر تم دیکھ سکتیں، میری بہن، کہ اس شہر کی کچی آبادیوں میں کیا ہو رہا ہے، اس ملک کے پچھواڑے، تو تمھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا! اگر تم دیکھتیں کہ وہ — las espaldas mojadas، 'بھیگی پیٹھ والوں'[11] — کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، ہم جو کسی نہ کسی طرح کسمسا کر جال سے نکل آئے ہیں، اور وہ اس میں حق بجانب ہیں، صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمارے کندھے پانی سے تر ہیں، ہم ابھی ابھی پانی سے نکلے ہیں اور کھارا پانی ہماری جان نہیں چھوڑتا، خشک نہیں ہوتا، یہ ہماری کھال اور کپڑوں سے چپک جاتا ہے: Las espaldas mojadas ہم یہی ہیں، اور ہم سے پہلے — ہم سے بہت پہلے — اطالویوں کو wops اور اسپینیوں کو dagos (بدیسی) کہا جاتا تھا، یہودیوں کو yids یا جو کچھ بھی... اور یہ شعار بدلا نہیں ہے، ہم los moros ہیں، بھیگی پشت والے عرب، ہم سمندر سے بھوت پریت یا عفریتوں کی طرح لشتم پشتم برآمد ہوتے ہیں!... اور اب میں جاتا ہوں!"

اس رات میگیل نے کنزہ کو بلایا۔

"مجھے فکر کھائے جا رہی ہے۔ عازل کا کہیں نام و نشان نہیں۔ اس کا فون بند پڑا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اسے کچھ ہو نہ گیا ہو۔"

کنزہ نے میگیل کو اطمینان دلانے کی اپنی سی کوشش کی، لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ بے سود ہے، کہ اس کا بھائی اس صورتِ حال کو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ کنزہ واقعی بہت پریشان ہو گئی تھی۔ عازل یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، خود کو خطرناک جھمیلوں میں الجھانے کا

---

11۔ غیر قانونی مہاجرت کرنے والے۔

Scanned with CamScanner

پوری طرح اہل تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ان دنوں مراکشی نتھو خیروں میں اٹھنے بیٹھنے لگا ہے جو غیر قانونی اشیا کے چھوٹے موٹے کاروبار سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان کے طرزِ زندگی سے اپنی ناپسندیدگی کے باوجود وہ اکثر ان میں جا شامل ہوتا تھا اور ان کے رنگ میں رنگ جاتا تھا، گویا اسے اس نکبت زدہ زندگی میں کچھ دیر کے لیے لوٹ جانے کی حاجت ہو جو پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ انھیں لوگوں میں کوئی عباس نام کا تھا — نہ اس کے پاس کاغذات تھے، نہ مستقل جائے رہائش، نہ کام دھندا... جو ہر ایک کو جُل دینے کا مدعی تھا: ساحلی پولیس، محافظتی عملہ، دفترِ مہاجرت، مخبر، خفیہ پولیس، مغربی قونصل خانہ، اشتراکی اور غیر اشتراکی اسپین...

کنزہ میگیل سے کارلوس کی پیشکش کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ کارلوس میگیل کے دوستوں میں سے تھا اور وہ اس سے میگیل کے یہاں مل چکی تھی۔ اس نے کنزہ کو ہفتے کی دو تین شامیں اپنے ریستوراں میں آ کر رقص کرنے کی دعوت دی تھی جس سے کچھ پیسہ کما سکے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کارلوس اور اس کی پیشکش کا ذکر چھیڑا۔

''یہ تو بڑا عمدہ خیال ہے، جانِ من، خاص طور پر اس لیے کہ یہ ریستوراں بے حد مقبول ہے، کوئی نائٹ کلب نہیں۔ ضرور قبول کر لو، میں پہلی صف میں موجود ہوں گا، تم بڑا شاندار رقص کرتی ہو۔''

## 22

## عباس

عباس کے پاس اسپین کی شکایتوں کا غیر مختتم ذخیرہ تھا۔ پستہ قد، کالا بجھنگ، تیز طرار آنکھیں جو اکثر ہر قسم کی منشیات کے استعمال سے سرخ رہتیں، وہ اوائلِ جوانی میں ایک مال بردار ٹرک میں چھپ کر اس ملک میں وارد ہوا تھا۔ سفر کے دوران دم گھٹنے سے مرتے مرتے بچا تھا اور اس بات پر قدرے فخر کرتا تھا۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اسپین سے مریضانہ حد تک بغض للہی تھا، کیونکہ اس پہلی بار اسے یہاں سے نکال دیا گیا تھا اور جب دوبارہ اسپین میں چوری چھپے داخل ہو رہا تھا تو گرفتار کر کے مراکشی

ارباب اختیار کے حوالے کردیا گیا تھا۔

''میں ان اسپانیولوں سے خوب واقف ہوں: ٹٹ پونجیے جو مالدار ہو گئے اور بھول گئے کہ کبھی کنگال ہوا کرتے تھے۔ میرا باپ کہتا تھا کہ یہ اسپانیولی ہمارے ملک میں چیتھڑے پہنے بھکاریوں کی طرح آیا کرتے تھے، سڑکیں صاف کرتے تھے، حجامتیں بناتے تھے، ہماری بسیں چلاتے تھے — ہم سے بھی بدتر حالت میں تھے، اور اگرچہ ہمارے پاس بھی کچھ نہیں تھا، لیکن کم از کم اپنے گھر میں تو تھے۔ لیکن ان کا دماغ پھر بھی آسمان پر تھا۔ خود کو ہم سے افضل سمجھتے تھے، کیا تم تصور کر سکتے ہو! اسپانیا، پیوند لگی پتلونوں، بوسیدہ، ادھڑے ہوے کالروں، اور بدبودار اوڈی کلونوں کا ملک۔ خیر، مراکش میں یہ لوگ شاہانہ ٹھاٹ سے رہ رہے تھے، اپنے کو ہم سے برتر سمجھ رہے تھے: میرے باپ نے بتایا تھا کہ جب مراکش آزاد ہوا تو ان کا پیشاب خطا ہو گیا، اس ڈر سے کہ ہم بھی اسی طرح ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے جس طرح الجزائر والوں نے کیا تھا: ہمارے گاؤں میں ان کے خوف کا یہ عالم تھا کہ گرجے میں جا چھپے تھے! تبھی جا کر انھیں احساس ہوا کہ ہم اچھے لوگ ہیں، جو انھیں ذبح نہیں کریں گے۔ برسوں بعد، احسان لوٹانے کے ارادے سے — مطلب کہ ان کے یہاں جا کر ملاقات کرنے — میں قونصل خانے گیا، سورج کی تپش میں گھنٹوں قطار میں کھڑا رہا، فارم بھرے جن میں ایسی ایسی تفصیلیں پوچھی گئی تھیں کہ یوں سمجھ لو میں کوئی مطلوبہ مجرم ہوں، اور اس ساری بھاگ دوڑ کے بعد نتیجہ کیا نکلا؟ 'والو' [کچھ نہیں]، صفر، کوئی ویزا نہیں، کوئی 'ہم سے ملنے آؤ' نہیں۔ بس اس کے بعد میں تنگ آ گیا، میں نے عہد کیا کہ کاغذ کی ایک چندی بغیر ان کے ملک میں داخل ہوں گا، گمنام، سپرمین کی طرح؛ میرا پیراشوٹ سے اترنے کا ارادہ نہیں تھا، میں نے تخلیقی سوچ کے گھوڑے دوڑائے: سوچا کہ یہ یورپی ہیں جنھوں نے ان کا دماغ بگاڑ دیا ہے، ان کی طرف خوب پیسے اچھالے ہیں، اور یہ تو جمہوریت پسند تک ہو گئے ہیں — اور یہ حوان کارلوس کے صدقے، مجھے یہ بادشاہ آدمی پسند ہے — اگر میں براہِ راست اس سے درخواست کروں تو یقیناً مجھے کسی مشکل کا سامنا نہیں ہوگا: اسی نے تو اسپانیولوں کے سر میں جمہوریت داخل کی ہے، ہوشیار آدمی ہے۔ پھر وہ وزیرِ اعظم بھی تو ہے، فیلیپی، میں نے تو ایک بار اسے پودینے کی چائے بھی پیش کی تھی، جب 'کیفے ڈ پاری' میں بیراگیری کرتا تھا۔ ٹھیک ہے، میں پہلے وہاں جوتے چمکاتا تھا، میرا اپنا ڈبا تھا جس میں مختلف پالش تھے، نیلا ایپرن تھا،

لیکن ایک دن آیا کہ چرمی جوتے ناپید ہو گئے، اور میرا کام دھندا بھی لپٹ گیا، سو میں وردی بدل کر بیرا بن گیا— ایسا کچھ برا نہیں تھا— پھر میں جہاز پر جا چڑھا، لیکن سواری کی اجرت دیے بغیر، وہ ایسے کہ نظر بچا کر عملے میں شامل ہو گیا۔ سو ہم الجسیر اس جا پہنچے، جہاں انھوں نے بندوقوں سے میرا استقبال کیا— 'ہاتھ سر کے اوپر کرو،' اور وہی سب بکواس، ناقابلِ یقین، میں دیکھتے دیکھتے بڑا اہم آدمی بن گیا تھا! جب میں نے کہا، 'مطمئن رہو، میرے پاس کوئی ہتھیار و تیار نہیں ہے، کوئی کاغذات نہیں ہیں، حتیٰ کہ تمھارا دل پگھلانے کے لیے دام دمڑی بھی نہیں،' تو انھوں نے مجھے جہاز کے کپتان کے حوالے کر دیا، وہ تخمِ خنزیر جس نے تین دن اور تین راتیں مجھے نچلے مال خانے میں بند رکھا، اور صرف پانی کی ایک بوتل تھما دی، وہ بھی نلکے کے پانی کی، بازار سے خریدے ہوئے کی نہیں، کنجوس مکھی چوس— میں چلاتا رہا، دروازے پر مکے اور لاتیں مارتا رہا، آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں، اس حرامزادے نے مجھے وہ جانور بنا دیا تھا شکاری جس کا پیچھا کر رہے ہوں، اور جب میرا دوبارہ اس سے آمنا سامنا ہوا تو بولا، 'نہیں، میں تمھیں بھولا نہیں تھا، بس تمھیں تمھارے لہو میں اونٹا رہا تھا تاکہ تم بھول کر پھر کبھی اسپین کا خواب نہ دیکھ سکو۔ (وہ سو فی صد اسپانیولی نہیں ہوگا، اس میں کچھ نہ کچھ عرب خون کی آمیزش ہوگی: اس میں یقیناً ہم جیسی کوئی بات تھی، کیونکہ اس کا چہرہ بالکل سفید نہیں تھا، وہ جنرل اوفقیر [12] سے ملتا جلتا تھا، خیر، یہ طے ہے، اتنا کمینہ ہونے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے سے غیر مطمئن ہو۔ شاید اسے اپنے چہرے سے نفرت تھی، اسی لیے انتقام لے رہا تھا، مجھے قیدی بنائے ہوئے تھا)۔ ایک رات، جب جہاز ابھی الجیسیر اس کی بندرگاہ ہی میں تھا، بحری عملے کے ایک کارکن نے مجھے رہا کر دیا، 'بھاگو، اور مبارکباد!' سو اب میں یہاں ہوں، اور یہاں سے نکلنے والا نہیں۔ میں انھیں خوب جانتا ہوں، ان اسپانیولیوں کو، یہ اندلس میں عربوں کے دورِ زریں سے ابھی تک تلملا رہے ہیں، یہ ان کے لیے ناقابلِ قبول ہے: موروس ہمارے ملک کے جنوبی حصے پر قابض تھے؟ ناممکن! لوس موروس (los moros) [مسلمانو] اور لوس خودیوس (los judios)، [یہودیو] سب باہر نکلو، ورنہ ہم تمھیں زندہ جلاتے ہیں! میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم مور آج دوبارہ انھیں فتح کرنے

---

12۔ جنرل محمد اوفقیر، یہ مراکشی پولیس کا نہایت سفاک سربراہ تھا جس نے 1972 میں حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا اور مار دیا گیا۔

Scanned with CamScanner

نکلے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ہمیں دوبارہ اپنی سرحد پر ٹوہ لیتے ہوئے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے، یہ ان کا اضطراری ردعمل ہے: کسی مور پر نظر پڑتے ہی وہ ایکدم چوکنے ہو جاتے ہیں، انھیں بدبختی اور کالک ہی نظر آتی ہے۔ تو ہم پرست لوگ ہیں، اور یہ ان کے حق میں ہے کہ ہماری طرف سے ہوشیار رہیں، کیونکہ ہم غیر آرام دہ لوگ ہیں، اور میں سمجھ بوجھ کے یہ کہہ رہا ہوں، تم جانو، اسپانیولی شکی تو خیر ہیں ہی، لیکن اس سے زیادہ سادہ لوح ہیں: یہ سارے مسلمان جو چلے آرہے ہیں، یقیناً ان کی نیت اُسی شے کی بازیافت ہے جو ان کے اسلاف کے ہاتھ سے جاتی رہی — اب ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ کچھ زیادہ ہی مبالغے سے کام لے رہے ہیں، بازیافت کے لیے بچا ہی کیا ہے! ہاں ا، دھر ادھر کچھ آڈیو کیسٹیں ضرور گھومتی پھر رہی ہیں جن میں اس قسم کا ذکر ہوتا ہے۔ میں تو اس کا قائل نہیں کہ کسی دن صورتِ حال پھٹ پڑے گی؟ کیونکہ ملک بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے، یورپ اسے شمال میں گھسیٹ رہا ہے، ہم سے دور، اس کے باوجود کہ ہم کبھی سوچتے تھے کہ ہم اور یہ ایک دوسرے سے قریب ہیں، میرا مطلب ہے پڑوسی ہیں، صرف ساڑھے آٹھ میل دور، مختصر سے ساڑھے آٹھ میل، نحوست مارے ساڑھے آٹھ میل، لیکن حقیقت میں ان کے اور ہمارے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ حائل ہے۔ جبکہ ان کی دانست میں مراکشی کا مطلب مسلمان ہے اور ان کا گرجا مسلمانوں کے بارے میں جو کہتا ہے وہ انھیں خوب یاد ہے (اور یہ کوئی ایسا خوش آئند قول نہیں، ماننا پڑے گا)۔ تو — ہم مسلمان ہیں، قلاش ہیں، کاغذات کے بغیر ہیں، اس لیے خطرناک ہیں۔ اور ہمارا ان سے بار بار یہ کہنا کہ ہر روز زیادہ سے زیادہ عیسائی مسلمان ہو رہے ہیں فضول بات ہے، اس سے ان کا خوف اور بڑھ جاتا ہے... میں انھیں جانتا ہوں، جو کچھ وہ سوچتے ہیں مجھے معلوم ہے اور میں انھیں سمجھتا ہوں۔ ہم ان کے لیے کوئی آسمانی تحفہ نہیں۔ تم خود بے روزگاروں کے اس جمِ غفیر کو دیکھ سکتے ہو جو بس اور ٹرین کے اسٹیشنوں اور چوکوں میں پھرتا رہتا ہے، جنھوں نے 'باریو چینو' کو ایک سوق اور 'باریو گوتیکو' کو ایک غلیظ شہر بنا دیا ہے: ان کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں، بس انتظار کرتے ہیں، اِدھر اُدھر کوئی چھٹکل کام کر لیتے ہیں، اور، بہرحال، میں بھی انھی میں سے ہوں، لیکن میں؟ میں ان سے زیادہ عیار ہوں، پھسل کر نکل جاتا ہوں، اور جب جال کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھتا ہوں، پھٹ سے اڑن چھو ہو جاتا ہوں، جا کر کسی مسجد میں سو رہتا ہوں اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہوں... آدمی کو ہر وقت

Scanned with CamScanner

چوکنا رہنا چاہیے۔ گھر، پیارے گھر، تیری طرف لوٹنے کی میری کوئی نیت نہیں، بالکل نہیں۔ یہاں وہاں کوئی کام کر لیتا ہوں، اچھی طرح کھاتا ہوں، مزے سے پیتا ہوں، تھوڑی بہت تمبا کونوشی بھی کرتا ہوں، اور زندگی بڑی حسین ہے، واقعی حسین! ٹھیک ہے نا، عزالعرب؟ کیا تمھیں یہاں سعادت نصیب نہیں ہوئی؟ کیا بات ہے، تم کچھ اینٹھے اینٹھے سے نظر آتے ہو؟ اس بڈھے کی لینے میں مزہ نہیں آتا؟ لیکن وہ تمھیں بھر بھر کے مال دے رہا ہے، تمھیں تو خوش ہونا چاہیے۔ میں نے یہ نسخہ آزمانے کی کوشش کی تھی، لیکن میرا پالا کسی مکھی چوس سے پڑ گیا اور وہیں آناً فاناً میری ساری استادگی چمپت ہو گئی، سوائے چوتڑ اوپر اٹھائے ہی چھوڑ کر چلتا بنا۔ چلتے چلتے اس کی گھڑی، سچ مچ کی رولیکس، سونے اور چاندی کی، اٹھالی اور ایک عرب کے ہاتھ بیچ دی جو یہاں سے گزر رہا تھا، اور دو ماہ تک اس رقم سے کھاتا پیتا رہا، اور اس کے بعد اس کنجوس مکھی چوس نے میرے محلے کے پاس پھٹکنے کی کبھی ہمت نہ کی ——وہ سیاست میں تھا، نام پر بٹا لگنے سے ڈرتا تھا، پھر یہ بھی کہ بیوی بچوں والا تھا... تو بھئی، اس طرح بھنانے سے کام نہیں چلے گا—— زندگی کو ایسے ہی قبول کرو جیسی ہے، اس ملک میں اپنی جگہ بناؤ اور آگے بڑھو، نہ کوئی ندامت ہو نہ کوئی حسرت۔ میرے جیسے بن جاؤ: میں چوری چکاری کرتا ہوں، غیر قانونی لین دین، بہت بڑی چیز کا نہیں، میں اسکولوں کے پھاٹکوں پر منشیات نہیں بیچتا، نہیں، اس قسم کی چیزوں سے مجھے گھن آتی ہے، بلکہ سیل فون جن کے سم کارڈ جعلی ہوتے ہیں، لڑکے لڑکیاں مفت کال کر سکتے ہیں، برا نہیں، کیا خیال ہے؟ فون چند دن کام کرتا ہے، پھر بگڑ جاتا ہے اور میں اسے بدلنے کے لیے وہاں موجود ہوتا ہوں۔ پھر میں ایسے کارڈ بھی بیچتا ہوں جن کے ذریعے آدمی دنیا کا ہر چینل دیکھ سکتا ہے، سو یوں ساری دنیا کوڑیوں کے مول اس کی پہنچ میں آ جاتی ہے، بس ایک چینل بکس پاس ہونا چاہیے، خریدار بننے اور ہر ماہ پیسے اگلنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ نہیں، ان مسروقہ کارڈوں کے طفیل میری زندگی بڑی اچھی گزر رہی ہے۔ یہ نشانِ خاطر رہے، یہ کام جو شخص کر رہا ہے وہ میں نہیں ہوں، میں ان معاملات میں بالکل نکھٹو ہوں، نہیں، یہ تو ایک پاکستانی ہے، نمبری چور اچکا، وہی میرے لیے یہ کام کرتا ہے۔ کہتا ہے، اس طرح ہم بدلہ لے رہے ہیں، کیونکہ ہم ان سے زیادہ گاؤدی نہیں ہیں۔ غریب ہونے کا مطلب احمق ہونا نہیں! یہ آدمی مجھے پسند ہے، کم آمیز ہے، محنتی ہے۔ اور جب میں اپنی سابقہ زندگی کو یاد کرتا ہوں تو یہاں ہونے پر مجھے کوئی الجھن نہیں ہوتی، اب اگر یہاں زندگی

Scanned with CamScanner

جنتِ فردوس نہیں تو کیا ہوا؟ بہتر ہوگا کہ پیچھے ملک والے اس قسم کی اول فول باتیں کرنا بند کردیں: اسپین خوابوں کی دنیا ہے، ایک ارضی بہشت، پیسہ کمانا آسان، اور لڑکیاں، بس ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے اور یہ حاضر ہیں، سوشل سکیورٹی، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مجھے اندازہ ہے کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ صداقت سے آگاہ ہیں، وہ بہر حال ٹیلیوژن تو دیکھتے ہی ہیں، صاف دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے ساتھ یہاں کیا سلوک کیا جارہا ہے، انھیں معلوم ہے کہ یہ کوئی بہشت وہشت نہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں، بہشت ہے کہاں؟ زمین پر کہاں ہے جنت؟ تمھیں معلوم ہے؟ خیر، مجھے معلوم ہے: جنت یہ ہے کہ میں تنہا اپنے بستر میں پڑا گانجے وغیرہ کے کش لگا رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اگر ملک سے نہ نکلا ہوتا تو آج میرا کیا حشر ہو رہا ہوتا، پھر شراب کے ایک دو جام چڑھاتا ہوں اور خود کو خیالوں میں بھٹکنے دیتا ہوں، خوش وخرم اور مطمئن۔ بہت زیادہ کی طلب نہیں کرتا، مزے سے سوتا ہوں اور زندہ رنگوں میں خواب دیکھتا ہوں، عربی اور اسپینی میں، اس طرح کہ قزح رنگ مچھلیاں میرے سر میں رقص کر رہی ہوتی ہیں، اس موسیقی کی دھن پر جو دنیا کی حسین ترین عورت بجا رہی ہوتی ہے، میری ماں۔"

❋

جب عباس اپنی تقریر جھاڑ رہا تھا، چھوٹی سی دکان کے عقبی حصے میں چٹائی پر بیٹھا ہوا ایک آدمی دو چار بار کھانسا تھا۔ عازل نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

"ارے یہ، یہ حامو ہے۔ اس نے تنگنائے کی مسافت کچھ کشتی سے اور کچھ تیر کر پار کی تھی۔ اس سے اسے نمونیا یا ایسا ہی کچھ ہو گیا تھا۔ بس کھانستا رہتا ہے، اور بڑا ہولناک بلغم نکالتا ہے۔ اسے ایسے ڈاکٹر کی ضرورت ہے جو اسے پولیس کے حوالے نہ کردے۔ تمھارا دوست، وہ اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست تو کرسکتا ہوگا، نہیں؟"

عازل میگیل کو اس قسم کی حرکتوں میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"میں اس کی دوا دارو کے لیے کچھ پیسہ جمع کرسکتا ہوں..."

"نہیں، جانے دو، میرا خیال ہے کہ 'اخوان' اس کا انتظام کرلیں گے۔ وہ اس قسم کی حالت میں مدد کرنا پسند کرتے ہیں۔"

عازل کو اندازہ ہو گیا کہ یہ 'اخوان' اسلامی ہیں۔ اس نے کچھ کہا نہیں، لیکن اس کے چہرے کا

Scanned with CamScanner

تاثر عباس کی توجہ میں آ گیا۔

''ٹھیک ہے، میں جانتا ہوں کہ اخوان کوئی کام مفت میں نہیں کرتے، بعد میں بدلے میں اپنا کام بھی کرواتے ہیں۔ میں نے ابھی تک ان سے مدد نہیں مانگی تھی؛ اسی لیے تمھارے دوست کی بات کی، لیکن اگر یہ ناممکن ہے تو پھر میرے پاس ان کی مدد قبول کرنے کے علاوہ چارہ نہیں۔ ان کے پاس ڈاکٹر ہیں، وکیل ہیں۔ وہ باوسیلہ لوگ ہیں، اور بے حد منظم — مجھے کبھی گمان بھی نہیں تھا کہ مسلمان اتنے منظم ہو سکتے ہیں۔''

''تم واقعی نسل پرست ہو!''

''آدمی اپنے لوگوں کے خلاف نسل پرست نہیں ہو سکتا؛ یہ نسل پرستی نہیں، یہ حقیقت سے آنکھیں چار کرنا ہے۔ میں پڑھا لکھا نہیں، میں اپنا راستہ خود بناتا ہوں، اور زندگی کی درس گاہ نے مجھے کافی کچھ سکھایا ہے، مثلاً، اگر تم آگے بڑھنا چاہتے ہو، تو تمھیں اپنی جماعت کے بارے میں چند ناگوار باتیں سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں یہ باتیں تم سے کہہ رہا ہوں، لیکن کسی اسپانیولی کے سامنے میں قذافی سے بھی زیادہ عرب ہوں۔''

''اس لیے کہ تم قذافی کو عربیت کا مرجع سمجھتے ہو؟''

''نہیں، بلکہ وہ ہمیں ضرر پہنچا رہا ہے، پھر بھی ہم میں سے ایک ہے۔''

''نہیں، وہ نہیں ہے۔ جانتے ہو وہ کروڑ پتی ہے — ڈالروں میں؟''

''تو؟ اور میں یوروز (Euros) میں قلاش ہوں!''

عباس ہنس پڑا اور عازل کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''تم پڑھے لکھے ہو۔''

''ہاں، لیکن اس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا...''

''سچ پوچھو تو میں اونچی اونچی باتیں کرتا ہوں، لیکن، خیر، بعض بعض وقت میں اپنے ڈربے میں اکیلا پڑا رونے لگتا ہوں، ہاں، میں کبھی کبھی اپنی زندگی پر سسکیاں لیتا ہوں، اپنی حالتِ زار پر؛ مجھے ماں بہت یاد آتی ہے۔ میں اس سے فون پر بات کرتا ہوں، لیکن جا کر مل نہیں سکتا۔ میرے پاس اب ایک دستاویز بھی نہیں رہی، نہ مراکشی پاسپورٹ ہے، نہ قومی شناختی کارڈ، نہ سکونت کا پروانہ۔ سو یہاں

Scanned with CamScanner

سے جاتا ہوں تو ہتھکڑیاں پہنے جاؤں گا اور کسی کی لات چوتڑوں پر ہوگی۔ تم اسے زندگی سمجھتے ہو؟ میں غیر قانونی اقامت کا جامع الاوصاف سورما ہوں: میں نظر نہ آنے کے لیے خود کو رات کی طرح سیاہ کر لیتا ہوں، اور توجہ میں آئے بغیر گزر جانے کے لیے فجر یا کہرے کی طرح دھندلا۔ میں اجاڑ جگہوں کے قریب نہیں پھٹکتا، کسی بھی لمحے بھاگنے کے لیے تیار رہتا ہوں، اور میں نے تمام مقامی گرجوں کے صدر دروازے ذہن نشیں کر لیے ہیں تاکہ پلک جھپکتے میں پادری کی بانہوں میں جا پڑوں — اس طرح وہ مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اور ایسا ایک بار پہلے ہو بھی چکا ہے، ایک کرسمس پر انھوں نے میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیا اور میں نے ساری چھٹیاں پادریوں کے ساتھ گزاریں۔ یہ بڑی اچھی زندگی گزارتے ہیں، میں نے ان کے ساتھ کچھ دعائیں بھی پڑھیں۔ میں ہر موقعے سے فائدہ اٹھاتا ہوں، ہمیشہ، گھل مل جانے کا ماہر! ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے ساتھ کام کروں، قصد یہ تھا کہ مجھے عیسائی بنا دیں، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا: میں اچھا مسلمان نہیں، میں شراب پیتا ہوں، ہمیشہ نیک کام نہیں کرتا، نماز نہیں پڑھتا، لیکن مطلب براری کے لیے مذہب بدلنا، یہ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال میرے کچھ اصول ہیں۔''

عازل نے اسے شراب خرید کر پلائی، اور کہا کہ دونوں مل کر خوب کام کر سکتے ہیں۔

عباس نے عازل کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ وہ اسے پسند تھا، لیکن وہ اسے کوئی ایسا شخص سمجھتا تھا جس کی نیا پہلے ہی پار ہو چکی تھی۔

عازل کو اس پر رشک آیا کہ عباس اپنی زندگی، اپنے مصائب کی بارے میں اتنی آسانی سے بات کر سکتا ہے، اور اپنے رازوں میں دوسروں کو شریک کر سکتا ہے، جس کی عازل کبھی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دکان میں جو سیل فون تھے وہ بیشتر غیر قانونی طور پر درآمدہ مال تھا، اور عازل کو اس جگہ میں اس وجہ سے کشش نظر آئی کہ یہاں ہر شے پُرخطر اور غیر قانونی تھی۔ دکان ایک مراکشی کی ملکیت تھی جسے حشیش کے ممنوعہ لین دین کے الزام میں ڈھونڈا جا رہا تھا، اور عباس اس کی واپسی تک دکان چلا رہا تھا۔ باقی رہے پولیس والے، تو انھوں نے اس امید میں رسی ڈھیلی چھوڑ دی تھی کہ کچھ ایسے سراغ مل جائیں جو انھیں بھگوڑے تک پہنچا دیں۔ پانی سے سر اونچا رکھنے کے لیے عباس نے کچھ اپنے دھندے بھی کر رکھے تھے، یہاں تک کہ چند مخبروں کی جیب بھی گرم کر دی تھی جو اسے بچائے رکھتے تھے۔ اس

کے باوجود کہ عازل کے پاس یہاں ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی، دل پھر بھی یہی چاہتا تھا کہ دکان کے اردگرد منڈلاتا رہے، خاص طور پر جب طبیعت بھاری ہوتی۔ جب طبیعت بیٹھنے لگتی تو اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیتا، ڈاڑھی مونڈنا بند کر دیتا، اور بہت زیادہ سگریٹیں پھونکتا۔

# 23
## ناظم

ناظم کے والدین نے اس کا نام ترکی کے شاعر ناظم حکمت کے احترام میں رکھا تھا۔ دراز قامت، آبنوسی رنگ، روشن آنکھوں اور گھنی مونچھوں والا یہ نوجوان 'ریستوراں کباب' نام کی ایک مراکشی طعام گاہ میں بیرے کا کام کرتا تھا۔ یہ اس کے ایک دور کے کُردی عزیز کی ملکیت تھا جو دس سال پہلے بارسیلونا آیا تھا۔ رہا ناظم تو اس نے گول مول سے حالات میں ملک چھوڑا تھا، اور اس کی وجہ، اپنے موڈ کے مطابق، کبھی گھریلو، کبھی سیاسی بتاتا تا——اور یہ صحیح صورتِ حال کو پوشیدہ رکھنے کے لیے۔

کنزہ بعض اوقات اپنی ریڈ کراس کی سہیلیوں کے ساتھ اس ریستوراں میں کھانے کے لیے آتی تھی۔ سہیلیوں نے جلد ہی اسے ناظم کی مسکراہٹ اور حسین آنکھوں کے سحر میں آ جانے پر چھیڑنا شروع کر دیا، لیکن اس پر کنزہ صرف ہنس دیتی۔

ایک شام جب وہ ریڈ کراس کی عمارت سے نکلی تو ناظم سے مڈبھیڑ ہو گئی، جس نے کہا کہ بس ایسے ہی یہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے قہوہ پینے کی دعوت دی، کنزہ نے انکار کر دیا کیونکہ اس وقت وہ کارلوس کے ریستوراں میں رقص کرنے جا رہی تھی۔ لیکن ناظم اصرار کرتا رہا۔ چنانچہ کنزہ نے کہا، وہ جلد ہی 'کباب' لوٹے گی اور پھر وہ کہیں جانے کا طے کریں گے۔

ناظم اس کے پیچھے لگ لیا۔ جب وہ ریستوراں میں داخل ہوئی تو ناظم کو یقین ہو گیا کہ کوئی وہاں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دروازے کو دھکا دے کر اندر گیا اور یوں اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا جیسے کسی دوست کی تلاش میں ہو جس سے یہاں ملنے کا طے کیا ہو۔ بیرے نے اسے پیچھے کی ایک میز پر لے جا کر بٹھا دیا۔

Scanned with CamScanner

''جب تک انتظار کر رہے ہو،'' وہ بولا، ''تماشے سے لطف اٹھاؤ! ہم استریلا کو پیش کر رہے ہیں، اور ینٹ [مشرق] کی بہترین رقاصہ۔''

بیس منٹ بعد کنزہ نمودار ہوئی، خوب میک اَپ کیے اور مختلف رنگ کے نقاب پہنے ہوے۔ اس نے بڑی لطافت اور وقار سے رقص کیا۔ گاہکوں نے دل کھول کر داد دی، اور بعضوں نے تو اس کی پیٹی میں نوٹ بھی اڑس دیے۔ وہ اپنے شاہانہ حسن کے ساتھ مکملاً موسیقی اور رقص میں محو تھی، اپنے جسم کے ہر حصے کو جس قدر نزاکت سے ممکن ہو، حرکت دینے پر مرتکز تھی۔ کندھوں اور کولھوں کو ایک قدم اٹھائے بغیر بیک وقت تھر کانے کا اس کا بے نظیر انداز تھا: وہ وہاں کھڑی ہوئی ہنوز محوِ رقص تھی، یوں لگتا تھا جیسے اس کا پورا جسم لرز رہا ہو۔ ناظم بمشکل اسے پہچان سکا۔ اس کا رقص پورے پندرہ منٹ جاری رہا۔ اس کے بعد ایک ایشیائی رقاصہ کی باری آئی، اور اس درمیانی وقفے سے فائدہ اٹھا کر ناظم وہاں سے سرک گیا۔

جب کنزہ اس رات دیر سے نمودار ہوئی تو میگیل نے گرمجوشی کے ساتھ سینے سے لگا کر استقبال کیا۔ وہ اس سے ملنے پر خوش تھا اور خاص طور پر عازل کے بارے میں اس سے دوبارہ بات کرنے کی امید کر رہا تھا۔ وہ عازل کے بارے میں بے حد فکر مند ہو چلا تھا۔

''مجھے بے حد افسوس ہے، میں تمھارا رقص دیکھنے آنا چاہتا تھا، لیکن نیویارک فون پر بات طول پکڑ گئی۔ بہر حال، اب تم یہاں ہو اور تمھیں دیکھ کر واقعی بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ تم تازہ دم ہونا چاہتی ہو، شاور وغیرہ؟ یہاں، تم اپنے گھر ہی پر ہو!''

انھوں نے لونگ روم ہی میں کھانا کھایا، تنہا۔ زندگی میں پہلی بار کنزہ نے شراب کا جام پیا، 1995 کی ریوخا (Rioja) وائن۔ یہ بڑا اچھا سال تھا، میگیل نے بتایا، اور نفیس شرابوں سے اپنی شدید لگن کا ذکر کرنے لگا، فطرت کے اس تحفے کی خوبیوں کی وضاحت کرتا رہا۔ کنزہ اشتیاق سے سنتی رہی، اس کی ماہرانہ سوجھ بوجھ پر وہ سحر زدہ رہ گئی تھی، اور خاص طور پر جس انداز میں یہ سلیقہ مند آدمی ایک ایسی چیز کے گن گا رہا تھا جسے وہ ابھی تک گناہ اور فسق و فجور کا قریں سمجھتی تھی۔

''اگر میں نے شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا،'' اس نے بتایا، ''تو اس لیے کہ وہاں وطن میں،

Scanned with CamScanner

جب لوگ پیتے ہیں تو حد سے گزر جاتے ہیں، نہیں جانتے کہ کب بس کرنا چاہیے، یہاں تک کہ پی پی کر توازن اور ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں۔ وہاں لوگ چسکیاں نہیں لیتے، نشے میں آجاتے ہیں۔''

سچ پوچھیں تو وہ ریوخا کے اس جام کی بابت گومگو کی حالت میں تھی، یہ اس کے منھ میں ایک عجیب ذائقہ چھوڑ گئی تھی، اور وہ بخوشی دوسرا جام بھی پی لیتی۔ وہ خود کو سبک دل محسوس کر رہی تھی، سرشار، اور اسے اس پر افسوس ہو رہا تھا کہ میگیل بیٹھا اس کے بھائی کے برتاؤ پر اتنا فکرمند ہے۔

میگیل کو یکدم یاد آ گیا کہ وہ مسلمان ہے۔

''تم بس یہی کہنے والی ہو کہ میں برا مسلمان ہوں کیونکہ شراب پیتا ہوں، لیکن سنو: میں نے اس مسئلے کی بڑی گہری چھان بین کی ہے، اور شراب سے متعلق آیات کی بڑی متضاد تفسیریں ملتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسلام مدہوشی کا قائل نہیں، کیونکہ اس سے آدمی اپنے وقار سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اردگرد جو ہو رہا ہے اس سے غافل ہو جاتا ہے، خاص طور پر اوقاتِ نماز سے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے، تو تمام مذاہب اس پر متفق ہیں: آدمی کو جب اپنے پر قابو نہ رہے تو اس حالت میں خدا کو مخاطب نہیں کرنا چاہیے، یہ بالکل واضح بات ہے۔ میں لطف اٹھانے کے لیے پیتا ہوں، بقول تمھارے، توازن کھونے کے لیے نہیں۔

''کیا تم نے دیکھا ہے کہ وہی لوگ جو پی کر نشے میں آجاتے ہیں، سؤر کھانے سے انکار کرتے ہیں؟ وہ اسے رد کرتے ہیں، حالانکہ ہیم نہ ان کے توازن کے لیے مضر ہے نہ وقار کے لیے۔ عجیب بات ہے، ہے نا؟

''آہ، لیکن بہت زیادہ ہیم کھانے میں کولسٹرول بڑھ جانے کا خطرہ ہے، لیکن مجھے تو شک ہے کہ مے نوش مسلمانوں کے سؤر نہ کھانے کی یہ اصل وجہ ہو۔ عازل تو یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اس گوشت سے اسے الرجی ہے۔ یہ بڑی دورخی بات ہے!''

کھانے کے بعد میگیل کنزہ کو اس کی اقامت گاہ پہنچا آیا۔ راستے میں اس نے ان مسائل کا ذکر کیا جو اسے عازل اور میڈرڈ والی گیلری کے باب میں پیش آ رہے تھے۔ اسے ابھی ابھی معلوم ہوا تھا کہ تنخواہ اور تمام خرچہ ملنے کے باوجود عازل گلّے سے چوری کرنے لگا ہے۔

''عازل مجھے کوئی ژاں ژینے (Jean Genet) سمجھتا ہے — وہ فرانسیسی ادیب جو اکثر

طنجہ آیا کرتا تھا، ایک باغی، ایک عظیم شاعر، ایک ہم جنس پرست جو چوری کے الزام میں جیل جا چکا تھا؛ اپنے عاشقوں کے ہاتھوں خود کو لٹوانے میں اسے مزہ آتا تھا، ایک غداری جو اسے بڑی اطمینان بخش لگتی تھی، یا ہیجان خیز۔ عجیب بات ہے، اگرچہ مجھے یقین ہے کہ عازل نے ژینے کو نہیں پڑھا ہے، لیکن وہ شاید یہی سوچتا ہے کہ سڑک کا کچرا بن کر مجھے مسرت پہنچا رہا ہے۔''

کنزہ کو یہ سن کر دھچکا لگا کہ میگیل اس کے بھائی کو''سڑک کا کچرا'' کہہ رہا تھا، اگرچہ وہ یقیناً یہ جانتی تھی کہ عازل حد سے زیادہ بد اطواری سے پیش آنے پر آمادہ تھا، جو دل میں آئے کرنے اور ہر کس و ناکس کو مایوس کرنے پر۔ بعد میں اس نے عازل سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ ٹھیک اسی شام اسے ماں کا فون آیا، جو سخت پریشان تھی۔ للا زہرہ نے ریڈیو پر سنا تھا کہ ہسپانوی پولیس نے چند مراکشیوں کو حراست میں لے لیا ہے جن پر دہشت پسند تنظیموں میں شامل ہونے کا شبہ ہے۔ جب کنزہ نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ ماں ان دہشت پسندوں اور عازل کے درمیان کسی ممکنہ ربط کی بو بھی سونگھ سکتی ہے، تو للا زہرہ نے فوراً اصرار کے ساتھ کہا کہ اس کا بیٹا ہرگز اس قسم کی باتوں میں ملوث نہیں ہو سکتا! اب کنزہ کو جو ہو رہا تھا اس کو معلوم کرنے کی واقعی فکر لگ گئی، لیکن عازل کا اتا پتا کہاں تھا؟

یہ ایک لمبی، بے خوابی کی رات تھی۔ قبیح اور آزردہ کن پیکر بڑی بے رحمی سے کنزہ کے دماغ میں جمگھٹا لگاتے رہے۔ سفید قمیص پر خون، پارہ پارہ سر، تن سے جدا ہاتھ، چاروں طرف پولیس پھیلی ہوئی، عربی فقرے، ہسپانوی لفظ، رات میں حرکت کرتے ہوئے نامعلوم چہرے، جلاد کی طرف منت سے دیکھتا ہوا عازل، قرآن کی تلاوت کرتی ہوئی ایک گھٹی گھٹی آواز، متروکہ بچوں پر کدکڑے مارتی ہوئی کالی بلی، سائے جو دیواروں میں سوراخ کر رہے تھے، ایک جاں گسل تشویش جو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

نیند ناممکن تھی۔ وہ شاور سے نہائی، کپڑے بدلے، اور باہر گھومنے سڑک پر نکل گئی۔

سپیدہ سحر کی آمد پر بارسیلونا کی چبھ جانے والی سختی نرم پڑ جاتی ہے، اور شہر ایسے فیاض خواب میں بدل جاتا ہے جس میں سب بخیر و عافیت ہو۔ سڑکیں صاف ستھری، گھر دھند میں ڈوبے ہوئے، جو بیدار ہوتے ہوئے شہر کی اکا دکا روشنیوں کو لپیٹے ہوتی ہے۔ رات کا لبادہ اتار کر بارسیلونا اولین راہگیروں کو خوش آمدید کہتا ہے، کیوسک اپنا اپنا مال آراستہ اور بیسٹر وفٹ پاتھ پر اپنی میزوں کو مرتب کرنے لگتے ہیں۔ قہوے اور ٹوسٹ کی مہک فضا میں بھر جاتی ہے۔ شہر دن کی اولین جھلملاہٹوں کا گجرا

سج سج پہن لیتا ہے۔ شادمانی کے پرسکون احساس سے معمور کنزہ نے اپنے ڈراؤنے خوابوں کو اپنے سے دور کردیا اور، اچانک، اپنی چشم تصور میں ناظم کو دیکھا۔ وہ اسے بھیڑ میں نظر آیا۔ وہ مسکرا دی، جس طرح امریکی فلموں میں ابھی ابھی مڈبھیڑ ہونے والے مرد اور عورت مسکرا کر ایک دلپذیر رومان کی اداکاری کرتے ہیں، ایسا رومان جس کا وجود صرف فلموں میں ہوتا ہے۔ کنزہ خود کو اتنا زندہ دل محسوس کر رہی تھی کہ اس نے یقین کرلیا کہ گھر سے نکلتے ہوئے کیمرا اس کی فلم اتار رہا ہے۔ ایک آواز اس سے کہہ رہی تھی، ''کچھ بھی سہی، تم اس شہر میں خوش و خرم ہو، تم نے ٹھیک کیا کہ اپنی قسمت خود اپنے ہاتھوں میں لی اور طنجہ، گھر والوں، اور ان بوجھل شب و روز کو چھوڑ کر یہاں چلی آئیں؛ تم حسین ہو، حاضر ہو، اور خوش قسمت ہو کہ میگیل سے ملاقات ہوئی جو ایک شریف آدمی ہے۔ سو تم جو بھی کرو، اب رکنا مت، آگے بڑھتی جاؤ! تم خود سے مطمئن ہو، تم اپنے بھائی کی ذمے دار نہیں اور نہ ان تمام حماقتوں کی مجرم ہو جن کا وہ مرتکب ہو۔ کنزہ، میں تم سے بول رہی ہوں، وہ دوسری کنزہ، جس نے تمھیں ہمیشہ سیدھے آگے بڑھنے کے لیے دھکیلا ہے، جدوجہد کرنے کے لیے، ہاتھ پاؤں ڈال دینے کی مزاحمت کرنے کے لیے اکسایا ہے۔ میں وہ ہوں جس نے تمھیں ایک آزاد دوشیزہ بنایا ہے، سو اپنی ماں کے کہے پر بہت زیادہ کان نہ دھرو، وہ تمھیں ہڑپ کر جائے گی۔ اپنی ذات پر توجہ دو، اپنی زندگی پر، اور قسمت وسمت کے چکر میں نہ جا پھنسنا؛ سر اٹھا کر مہاجرت کرنے والے پرندوں کو دیکھو جو اوپر بارسیلونا کے آسمان کے اس حصے میں مل رہے ہیں: غور سے دیکھو، وہ کتنی مہارت سے اس بیلے کے آہنگ پر رقص کر رہے ہیں جو اس صبح خاص تمھارے لیے پیش کرنے آئے ہیں، تمھاری آنکھوں کے سامنے جو روشنی کی اتنی پیاسی ہیں۔ زندگی پھر بھی خوبصورت ہے، ان بے شمار احمقوں کے باوجود جو تباہی پیدا کرتے اور پھیلاتے ہیں۔ تم محفوظ ہو، ان کی پہنچ سے دور۔ دوڑو بھاگو، زندہ رہو، ہنسو ہنساؤ۔۔۔''

کنزہ ایک قہوہ خانے کی میز پر جا بیٹھی اور قہوے اور ملبا ٹوسٹ کا آڈر دیا۔ ایک لمحے کی لطف اندوزی، ایک لمحے کی فرحت انگیز خلوت۔ پھر شہر کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں اور جلد ہی روزمرہ کی گہما گہمی صبح کی اس ساعت پر قابض ہوگئی۔ ریڈ کراس کام پر جانے کا سوچنا چاہیے۔

اس شام کنزہ نے اپنی سہیلیوں کو کھانے پر 'کباب' میں مدعو کیا۔ اس نے ناظم کی تلاش میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ شاید یہ اس کی چھٹی کا دن تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ چھپا ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

اسے علم ہوا تھا کہ ملازموں کے کاغذات کی جانچ پڑتال کرنے والے انسپکٹر وہاں آنے والے ہیں۔ چلتے وقت کنزہ اس کے نام ایک رقعہ لکھ کر چھوڑ آئی: ''ہم تین عورتیں تمھاری راہ تک رہی ہیں ۔۔۔ اور تمھارے بغیر 'کباب' بے لطف ہے!''

کچھ دیر بعد، یہ محسوس کر کے کہ رقعہ کچھ زیادہ ہی بے باک ہے، کنزہ نے واپس جا کر اسے پھاڑ دینے کا فیصلہ کیا، لیکن ایک آخری ہچکچاہٹ کے بعد رہنے دیا: چیزوں کو اپنا راستہ خود اختیار کرنے دو۔ بعد میں کارلوس کے ریستوراں کے راستے میں اسے اپنے پیچھے قدموں کی بتدریج قریب آتی ہوئی چاپ سنائی دی: یہ ناظم تھا۔ اس نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہی نستعلیق مکتبی فرانسیسی میں ریستوراں میں اپنی غیر موجودگی پر معذرت کی۔

''صرف ایک جام، ایک چھوٹا سا جام، یا مسالے دار چائے، تمھارے گھر لوٹنے سے پہلے ۔۔۔''

اس نے بڑی منت سے درخواست کی، لیکن وہ قبول کرنے سے عاجز تھی، اور اس سے بھی زیادہ عاجز یہ بتانے پر کہ وہ ایک بڑے طرحدار ریستوراں میں رقص کرنے جا رہی ہے۔

''کل۔ اس وقت میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ 'کباب' میں، نو بجے۔ وعدہ رہا۔''

جب وہ رقص کا لباس درست کر رہی تھی تو اسے اسٹیج کے خوف کی ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی اور وہ ناظم کا تصور کرنے لگی۔ پھر وہ ستاروں کے بھیجے ہوئے کسی فرشتے کی طرح میزوں کے بیچ سے راستہ بناتی ہوئی اسٹیج پر آئی۔ مصری موسیقی لاجواب تھی۔ اس نے آنکھیں موند کر جسم کو تال کی پیروی پر چھوڑ دیا، اور تصور کیا کہ وطن ہی میں کسی شادی کی تقریب میں ہے۔ ناظرین نے دل کھول کر داد دی، خاص طور پر اس لمحے جب اس کا پورا جسم نزاکت سے تھرتھرا رہا تھا۔ وہ تعظیماً جھکی، اپنے نقاب اپنے قدردانوں کی طرف اچھال دیے، اور اسٹیج سے رخصت ہو گئی۔ بغلی حصے میں بڑی تیزی سے کپڑے تبدیل کیے، ایک کاغذ کے پرزے پر، جو بیرے نے لا کر دیا تھا، دستخط کیے، اور باہر رات میں نکل پڑی۔

اگلے دن 'کباب' پہنچنے میں اسے کچھ دیر ہو گئی۔ ناظم اس کے انتظار میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی ناظم بولا، ''ذرا سنو کہ ناظم حکمت اس ملک کے بارے میں کیا لکھتا ہے:

اسپین، ایک خون آلود گلاب جو ہمارے سینوں پر کھل رہا ہے
اسپین، موت کے جھٹ پٹے میں ہماری دوستی
اسپین، ہماری منھ زور امید کی روشنی میں ہماری دوستی
اور زیتون کے قدیم درخت، پاش پاش، زرد زمین اور سرخ زمین، سرتاسر چھلنی

وہ 1939 کے اسپین کی بات کر رہا ہے۔ اس کا آج کی شاندار جمہوریت سے کوئی علاقہ نہیں۔ لوگ بدل گئے ہیں، ان کے اندازِ فکر میں کسی قدر عصری روح آ گئی ہے۔ بس ایک مشکل باقی ہے: بعض اسپینیوں کو مُور کچھ زیادہ پسند نہیں۔ اس معاملے میں کوئی مجھ پر سبقت نہیں لے جا سکتا — یہاں، لوگ اکثر مجھے مُور سمجھتے ہیں۔ جب میں بتاتا ہوں کہ ترک ہوں تو ان کی سمجھ میں کہنے کو بس یہی آتا ہے کہ ترک یقیناً مُوروں کے ماہر ہوں گے۔ ایک دن میں نے ہمارے عظیم شاعر کے یہ شعر ایک اندلسی زمیندار کو سنائے جس سے ریل گاڑی میں ملاقات ہوئی تھی:

میرے داخل میں ایک پیڑ ہے، ایک پودا جو میں آفتاب سے لایا تھا؛
اس کے پتے، ملتہب مچھلیاں، ہولے ہولے جھولتے ہیں،
اس کے پھل پرندوں کی طرح چہچہاتے ہیں

وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا، اور خود بھی دہرایا، 'چہچہاتے ہیں...' پھر ہاتھ بڑھایا اور بولا، 'تم، تم مُور نہیں ہو سکتے!' اپنی دانست میں وہ میری تعریف کر رہا تھا۔''

''عربوں سے اتنی نفرت میری سمجھ میں کبھی نہیں آتی۔''

جب کنزہ ناظم کے ہر ہر لفظ کو غور سے سن رہی تھی، اسے اپنے ساری تھکن زائل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اب گھر لوٹنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ باہر رات کی فضا معتدل تھی: وہ ہاتھوں میں ہاتھ دیے گھومنے لگے۔ ناظم اسے اندلس میں موروں کے دور کی بابت بتانے لگا، وہ دور جس میں مسلمان اور یہودی بڑے دل آویز بھائی چارے کے ساتھ شعر کہتے تھے، موسیقی تخلیق کرتے تھے۔

Scanned with CamScanner

# 24
## کنزہ اور ناظم

پیر کے دن 'کباب' ریستوراں بند رہتا تھا۔ کنزہ نے اپنے سپروائزر سے ایک دن کی چھٹی لی اور ٹرین اسٹیشن کے ایک قہوہ خانے میں ناظم سے ملنے گئی۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ وہ دن بارسیلونا سے کوئی آدھے گھنٹے کی مسافت پر ایک چھوٹے سے قریے میں گزاریں گے، تاکہ ایک دوسرے سے بہتر طور پر واقف ہوسکیں، دباؤ اور جلد بازی سے آزاد فضا میں گفتگو کریں، اور ایک نوع کی تعطیلاتی کیفیت سے لطف اندوز ہوں۔ ناظم پرکشش اور نفاست پسند تھا۔ وہ وقت سے ذرا پہلے پہنچ گیا اور مسافروں کا مشاہدہ کرنے لگا: عجیب بات ہے، یہ سب ایک عجیب انداز میں ایک دوسرے کا عکس معلوم ہوتے تھے: ایک ہی طرح اِدھر اُدھر لپک جھپک رہے تھے، ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، اور سبھی کا دھیان بٹا ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے ایک افریقی کنبہ ابھی ابھی ریل گاڑی سے اترا تھا، اور اسٹیشن کی بے کیف سراسیمگی میں ان کی رنگین موجودگی سے گویا بادِ صحرا کا جھونکا آ گیا تھا، شگفتگی کی فضا، ایک موسیقی جو آدمی کو بے اختیار رقص کرنے پر اکسائے۔ انتظار کے دوران ناظم مسافروں کی اس بہجت انگیز ٹولی کے پاس آیا، ان کے یہاں ہونے پر از حد مسرور۔ یہ مالی کے لوگ تھے، اور مراکش سے ہوتے ہوئے آرہے تھے، اور یہ مہاجرت کرنے والے نہیں تھے، نہ حملہ آور، جیسا کہ کنبے کے سربراہ نے ناظم کو بتایا۔

''مجھے اپنا تعارف کرانے کی اجازت دیں: میں پروفیسر محمد تورہ ہوں، ہڈیوں کا معالج، بارسیلونا کے طبی کالج کے ڈین نے مجھے چند لیکچر دینے بلایا ہے۔ میری بیوی بچوں کی ڈاکٹر ہیں، اور یہاں اس پروگرام کے سلسلے میں آئی ہیں جو ریڈ کراس کی تنظیم مغربی افریقہ کے لیے تیار کر رہی ہے۔ ہمارے بچے ہمارے دوروں پر اکثر ساتھ ہوتے ہیں۔ دو ماہ قبل ہم سب پرنسٹن میں تھے، اور وہاں ہمارا قیام بے حد دلچسپ رہا۔ بس واحد مشکل یہ تھی کہ سب انگریزی بولتے تھے، جو میں سمجھ تو لیتا ہوں لیکن بول نہیں سکتا۔ اس کے برخلاف، میں نے قشتالی اسپینی ایک زمانہ پہلے اسکول میں پڑھی تھی۔ اور

Scanned with CamScanner

آپ، آپ کیا کرتے ہیں؟''

ناظم ابھی اپنا تعارف کرا ہی رہا تھا کہ کنزہ نظر آئی جو اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ موسیو تورہ نے اسے اپنا کارڈ دیا، اور کہا، 'اگر کبھی مالی آنا ہو تو مجھے فون ضرور کریں، چاہے آپ کو مالشی علاج کی ضرورت ہو یا نہ ہو!' پھر اس کنبے کے چمچماتے رنگ اسٹیشن کے مرکزی کشادہ حصے سے اوجھل ہو گئے۔ اور کنزہ بھی غائب ہو گئی تھی۔ ہجوم پہلے سے بھی زیادہ گنجان اور سرمئی نظر آ رہا تھا، یا کم از کم ناظم کو دنیا اب ایسی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ کیا یہ توہم کی فسوں کاری تھی یا وہ محض بے کیفی اور مایوسی محسوس کر رہا تھا؟ تاہم اسے کامل یقین تھا کہ اسے ایک لمحہ پہلے کنزہ کی جھلک نظر آئی تھی، وہ وحشت زدہ سا ہو کر تیزی سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ قہوہ خانے لوٹ کر اس نے بلبلے دار پانی کا آرڈر دیا۔

اچانک کنزہ پھول دار ڈریس پہنے نمودار ہوئی، جیسے کسی جادوگر کے ڈبے سے کود کر نکل آئی ہو۔ وہ ناظم پر جھکی اور گنگنا کر بولی، ''چلو وقت ضائع نہ کریں۔''

وہ گاڑی میں آمنے سامنے بیٹھ گئے، ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، کچھ نہ بولے۔ کنزہ کو لگا کہ وہ کچھ پریشان سا ہے، اور سوچا کہ آخر کیوں۔ ہو سکتا ہے وہ اس کی بے باکی سے بھونچکا رہ گیا ہو... جب ناظم نے اس کی طرف دیکھا تو ایک عجیب سی شیرینی آہستگی سے اس کے وجود میں گھل گئی۔ اس کے ہاتھ بڑے حسین تھے — بڑے لیکن خوش وضع۔ کنزہ نے اس کے بھرے بھرے ہونٹوں کو دیکھا اور تصور کیا کہ وہ انھیں دانتوں سے دبا رہی ہے۔ وہ ہنس دی۔ ناظم نے پوچھا کہ کیوں۔ ''آہ، میرے دوست، کاش تم جانتے!'' کنزہ کا مدعا اس کی سمجھ میں نہ آیا اور اس کی متناسب چھاتیوں، متبسم بھوری آنکھوں، لمبی لمبی سیاہ لٹوں، اس کی ٹانگوں اور منھ کو دیکھنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔

اسپین آنے کے بعد سے ناظم صرف دو عورتوں سے ملا تھا۔ پہلی اس کی ہم وطن تھی اور یہ سوچے بیٹھی تھی کہ اسے ناظم میں اپنا شوہر مل گیا ہے اور اس بچے کا باپ جس کی وہ تنہا پرورش کر رہی تھی۔ ان کا تعلق مختصر اور بڑا ہیجانی رہا۔ دوسری کیوبا کی تھی، ایک دفتری کارکن۔ یہ ایک اسپینی پروفیسر کی محبت میں گرفتار ہو کر، جو ہوانا یونیورسٹی میں لیکچر دینے آیا تھا، ملک چھوڑ چھاڑ کر یہاں چلی آئی تھی۔ جب اس کے ویزا کی میعاد ختم ہو گئی تو اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور مراکش اور لاطینی امریکہ کے ہزاروں مہاجروں کی طرح غیر قانونی اجنبی کی طرح رہنے لگی۔ ناظم اور اس کا رشتہ خالص جنسی تھا، اور

Scanned with CamScanner

چند ماہ بعد وہ کسی بے لطفی کے بغیر جدا ہو گئے۔ اس کے بعد سے ناظم ایسی عورت کی تلاش میں تھا جو اس کی ثقافت سے نسبتاً زیادہ مانوس ہو۔ اسے ترکی زبان، یا کم از کم عربی، سننے کی حاجت تھی، اور وہ اپنے ملک کی موسیقی سے حظ اٹھانے، اپنے خیالات اور محسوسات میں کسی کو شریک کرنے کا خواہشمند تھا۔

کنزہ وہ سب کچھ تھی جو وہ چاہتا تھا۔ اگرچہ وہ دیکھنے میں جنوبی یورپ کی لگتی تھی، لیکن تھی عرب ہی، آزاد، حسین، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسپین کی قانونی اقامت گزیں۔ دل ہی دل میں ناظم خود اپنی صورتِ حال کو سلجھانے کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے یہ احتیاط کی کہ ایسی کسی بات کا کنزہ سے کوئی ذکر نہیں کیا، وہ اپنے کو خود غرض اور نپٹ موقع پرست ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جب وہ سبادیل کے چھوٹے سے اسٹیشن پہنچے تو دیکھا کہ پولیس والے لوگوں کے شناختی کاغذات کی چھان بین کر رہے ہیں، اور بغیر امتیاز کے ہر جپسی، کالے افریقی، اور شمالی افریقی عرب کو روک رہے ہیں۔ اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر کنزہ بڑی خود اعتمادی سے آگے بڑھی۔ ایک ثانیے کے لیے ناظم خوف کھا گیا، لیکن کنزہ کو غایت درجہ مطمئن پا کر اس نے اس کا ہاتھ زور سے دبایا، جیسے شکریہ ادا کر رہا ہو۔

فٹ پاتھ پر دونوں نے ایک دوسرے کو چوما۔ ناظم کو ایک گونہ شرمندگی سی محسوس ہوئی، لیکن کنزہ کو بالکل نہیں۔ اسی نے ناظم کو اپنی طرف کھینچا تھا اور اپنے لب اس کے لبوں سے چپکا دیے تھے۔ اس سے جذبات میں آ کر اور خوش ہو کر، وہ کسی نوخیز کی طرح شرم سے گلابی ہو گیا، اور کہیں چل کر دودھ والی کافی پینے کی صلاح دی، لیکن کنزہ نے انکار کیا اور کہا کہ وہ یخ و یا تیز قہوہ پینے کی شائق ہے۔

پھر کنزہ نے خود قیادت کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک آزاد — اور مضبوط ارادہ — عورت، وہ کھڑی ہوئی اور کہا، "میرے ساتھ آؤ، ہم دن 'بریستول' میں گزاریں گے، ایک چھوٹا سا خوشنما ہوٹل ہے، تم دیکھو گے۔"

کنزہ کو کسی مرد کو چھوئے سال ہو رہا تھا۔ اس نے خود ہی ناظم کے کپڑے اس کے تن سے جدا کیے، اس کے جسم کو چاٹنے لگی اور یوں سونگھنے لگی جیسے کوئی پھول ہو، سونگھنے اور سہلانے اور چومنے لگی۔ ناظم نے اسے اپنی مرضی کرنے دی، اور سوچنے لگا کہ اپنے اختیار کی بازیافت کب کرے۔ جب وہ بالآخر اس کے اوپر آ پڑا تو کنزہ نے اپنے پورے زور سے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا، "مجھے کچل

ڈالو، میں تمھارا سارا وزن اپنے اوپر محسوس کرنا چاہتی ہوں— تمھارے جسم کے کسی حصے سے محروم نہیں رہنا چاہتی۔ میں اسے اپنے اندر چاہتی ہوں۔ جتنا گہرا جا سکے اور جتنا بھرپور۔"

انھوں نے اس طرح جفتی کی جیسے زمانوں سے اس کے بھوکے ہوں۔ وہ اس سے طنجہ کی عربی بول رہی تھی، اور وہ اسے ترکی میں جواب دے رہا تھا۔ اپنی اپنی زبانوں کے ترنم نے ان کی شہوت کو اور بھڑکا دیا تھا۔ غسلخانے میں جاتے ہی کنزہ گنگناتے ہوئے رقص کرنے لگی۔ ناظم اس کی ماہرانہ رقاصی دیکھ چکا تھا، جو اس کی موہوم سے موہوم جنبش کو بھی ایک دبی دبی سی ہوس انگیزی سے بھر دیتی تھی، اور کنزہ نے یہی لمحہ اس اعتراف کے لیے چنا کہ وہ ہفتے میں دو مرتبہ 'لویل ڈلیف' ریستوراں میں رقص پیش کرتی ہے۔ ناظم نے اسے بتا دینا چاہا ہوتا کہ وہ اسے وہاں رقص کرتا ہوا دیکھ چکا ہے، لیکن پھر کیسے اور کیوں کی وضاحت کرنی پڑ جاتی، اس لیے باز رہا۔

واپسی کے سفر کے دوران انھوں بمشکل کوئی بات کی، کیونکہ دونوں ایک لذیذ تھکن کے غبار میں لپٹے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کے احساس میں مکملاً جذب۔

# 25

# عازل

عازل طمانچے کی ضرب سے لڑکھڑا کر گرا اور ہکا بکا رہ گیا۔ اسے بھول کر بھی گمان نہیں ہوا تھا کہ میگیل کبھی اسے مار بھی سکتا ہے۔ اور چند لمحوں تک سمجھ ہی نہیں پایا کہ کیا ہو رہا ہے۔ جب وہ بالآخر فرش سے کھڑا ہوا، کارمن نے اسے اس کا سوٹ کیس لا کر تھما دیا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ میگیل کو کئی بار متنبہ کر چکی تھی کہ اس کا متوسل کیا گل کھلا رہا ہے، لیکن اب تک اس کا آقا بے بسی کا اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر رہ جاتا۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب اسے ابھی تک عازل سے محبت تھی۔

عازل سمجھ گیا کہ اس بار محض باتوں کے ذریعے جان نہیں چھوٹنے والی۔ وہ حد سے بہت زیادہ تجاوز کر گیا تھا، خود اپنے قول سے پھر گیا تھا اور جو سزا مل رہی تھی اس کا مستحق تھا۔ چنانچہ وہ کوئی احتجاج

Scanned with CamScanner

کیے بغیر یہ بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا کہ سوٹ کیس بعد میں آ کر لے جائے گا۔ کارمن نے گھر کی چابیاں واپس لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ چند لمحوں کے تذبذب کے بعد عازل جیب کھنگالنے لگا اور چابیوں کا دستہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اچانک اس کی نگاہوں میں ایسی یاس تیر گئی جس پر آدمی کو ترس آ جائے، لیکن کارمن نے بس سر کو جنبش دی اور الٹے قدموں یوں لوٹ گئی جیسے وہ جا چکا ہو۔ میگیل اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا؛ وہ ہائپر ریئلسٹ پینٹر کلودیو برافو کے کام کی ایک اہم نمائش کی تیاری کے لیے میڈرڈ کے لیے بس نکلنے ہی والا تھا۔ پندرہ سال میں اس مصور کی اپنے وطن اسپین میں یہ پہلی نمائش تھی۔ میگیل اس انتظار میں تھا کہ پہلے عازل یہاں سے نکلے تو وہ سفر پر جائے۔ اسے دوبدو کے جھگڑے نمٹنے سے نفرت تھی، اور اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ایسے موقعوں سے نمٹنے کی ساری ذمے داری اس نے کارمن کے سر ہی ڈالی تھی۔ اپنی بزدلی کے جواز میں خود سے کہتا کہ اپنے عاشق سے ایک اور بحث کی بھی تو اس سے کچھ بدلنے کا نہیں۔ ان کا آخری جھگڑا تقریباً گھناؤنی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جب کوئی بات آڑے آ جاتی تو میگیل بالکل سوقیانہ پن اور کمینگی پر اتر آتا۔ ایسے لمحات میں اس کی شخصیت کا وہ رخ جس میں بارسلونا کی سڑکوں کی سخت گیری تھی — جو اسے سخت ناپسند تھا اور جسے وہ مستقل دبائے رکھتا — اچانک عود کر آتا۔ پھر جو سب سے پہلی دھار دار چیز اس کے ہاتھ لگتی، اٹھا کر غنیم پر دے مارتا۔ اور عازل کا رویہ عین ایسا ہی تھا جو اسے اس تشدد پر اکسا دیتا۔

عازل دن بدن زیادہ گم صم رہنے لگا تھا، اس نے خود کو ایک خیالی دنیا میں محصور کر لیا تھا، تقدیر اور پیش آگاہ کرنے والے خوابوں پر یقین کرنے لگا تھا، اور جسے وہ ''عطرِ مرگ کی مہک'' کہتا تھا اس کی قیادت میں چلا جا رہا تھا۔ اب وہ خالص پیشہ ور دروغ گو بن گیا تھا، ایک اداکار جسے بدترین صورتِ حال کو اپنے لیے نفع بخش بنا دینے کا گر آتا ہو۔ اپنی لمبی لمبی پلکوں اور سیاہ متبسم آنکھوں پر انحصار کرنے لگا تھا۔ ماں نے کہا تھا کہ وہ طنجہ کا جمیل ترین لڑکا ہے؛ اب وہ بالآخر ماں کے کہے پر یقین اور اسی حساب سے عمل کرنے لگا تھا۔

عازل نے ایک سگریٹ سلگائی۔ بارسلونا کے اہم ترین ہم جنسوں کے اڈے 'لاس رامبلاس' کے لیے نکلتے ہوئے اسے اندازہ تھا کہ وہ 'ایبا مپل' کے رہائشی محلے کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

آسمان ملکوتی روشنی سے بھرا ہوا تھالیکن عازل کا دل مجروح اور کسی اجنبی ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور کڑوے ذائقے سے بھرا منھ خشک ہو گیا تھا۔ سگریٹ کی وجہ سے، اس نے خود سے کہا، اور اس رڈی شراب کی وجہ سے جو گزشتہ رات پی تھی۔ وہ سر جھکائے چلا جارہا تھا۔ اسے کسی سے بات کرنے کی خواہش محسوس ہو رہی تھی نہ کچھ سوچنے کی۔ اس کے باوجود اسے 'پاسیاج دی گراسیا' سے انس تھا، وہ کشادہ شاہراہ جس پر آدمی ساری عمر چلتا جا سکتا تھا۔ لیکن آج صبح کوئی چیز حسب معمول نہیں تھی۔ وہ جن لوگوں کے پاس سے گزرا وہ سایوں جیسے معلوم ہوئے، شفاف جسم جو کسی عنقریب رونما ہونے والی بدبختی کے پیامبر تھے۔ اسے لگا جیسے کسی خطرناک پہاڑی کی ڈھلان پر سرپٹ دوڑا جارہا ہو۔ گاہے بگاہے کسی پیڑ سے ٹیک لگانے کے لیے ایک لمحہ رک جاتا۔ اچانک شہر کی آوازیں تیز تر ہو کر سنائی دینے لگیں، اور کسی ڈراؤنے خواب کی طاقت سے دماغ میں کھڑکھڑانے لگیں۔

'باریو گوتیکو'، قدیم بارسلونا کا قرونِ وسطیٰ کی بھول بھلیوں کا سلسلہ، لاس رمبلاس کی انتہا پر شروع ہوتا ہے۔ یہاں عازل کو چند جانے پہچانے چہرے نظر آئے، مراکشی، چھوٹے موٹے خوردہ فروش یا کاہل الوجود نکمے نوجوان جو نت نئی چالبازیوں اور مہم جوئیوں کی تلاش میں سارا دن مارے مارے پھرتے رہتے تھے۔ آج صبح عازل ان سے بات چیت نہیں کرنا چاہتا تھا؛ بلکہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ان کی زبان، طور طریق، اور ان کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اسے ان پر تاسف ہوا۔ اس نے اس خیال سے اپنی رفتار تیز کر دی کہ کہیں کوئی آ کر کچھ بیچنے یا چٹکی بھر کیف کے عوض کچھ دینے کے لیے نہ روک لے۔

اس نے بغیر شکر کا قہوہ پیا، زمین پر تھوکا، اور اس دن کو کوسا جب اس ملک میں قدم رکھا تھا۔ ایک جنگلی بلی تیزی سے لپک کر سڑک پار کر گئی۔ عازل کو بلی کی آزادی پر رشک آیا۔

غلیظ، بے ترشی ڈاڑھی، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے، عازل نے اس حالت میں کنزہ کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ وہ مسلسل راتوں کی ڈیوٹی ادا کر کے آرام کی خاطر گہری نیند سو رہی تھی، اس نے عازل کو اندر داخل ہونے سے منع کر دیا اور کہا کہ بعد میں آئے۔ لیکن وہ دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنے

Scanned with CamScanner

گیا۔ ناظم، جس نے رات کنزہ کے یہاں گزاری تھی، اس شور شغب کا خاتمہ کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا، ایک مکا ٹھیک اس کی ٹھوڑی پر آ کر لگا۔

''یہ کیکے (kike)[13] یہاں کیا کر رہا ہے؟ کیا یہ خور وطو ہے، ان تیسری دنیا کے نکھٹوؤں میں سے ایک جو باعزت لڑکیاں شکار کرتے ہیں۔۔۔''

لباس سے تقریباً عاری کنزہ نے ناظم سے کہا کہ وہ بیچ میں نہ پڑے، اس معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، اور پھر وہ عازل پر پھٹ پڑی۔

''یہ نہ کیکے ہے نہ خور وطو! اس آدمی کا ذاتی نام ہے، خاندانی نام ہے، ملک ہے، اور ملازمت کرتا ہے — ہے نا تعجب کی بات!''

''ارے اچھا؟ تو تم نے اس کے بارے میں کچھ بتایا کیوں نہیں؟ کہاں سے آیا ہے؟''

''اس کا نام ناظم ہے، اور یہ ترک ہے۔''

''تو میں نے اور کیا کہا تھا، خور وطو!''

''خبردار! جو اس قسم کے کلمے میرے سامنے نکالے۔ تم بہت مایوس کن ہو، عازل، کسی طرح سدھر کر نہیں دیتے، سب کچھ بگاڑ کر رکھ دیتے ہو۔''

''ٹھیک ہے، لیکن میں برداشت نہیں کر سکتا کہ یہ تمھیں چھوئے۔''

''تم برداشت کرنے یا نہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟ تم جو چاہے سو چا کرو، میری بلا سے! ذرا اپنی طرف تو دیکھو! کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔''

''مجھے ترک پسند نہیں۔ ان کی زبان پسند نہیں۔ مجھے ان کی لقوم مٹھائی پسند نہیں، اور ان کا دوسروں کو دیکھنے کا انداز پسند نہیں۔''

''تم نسل پرست ہو!''

''تو کیا ہوا؟ مجھے ترکوں کو ناپسند کرنے کا حق ہے، یا یونانیوں کو۔۔۔ کم از کم وہ مرد جو تمھیں چھوتے ہیں۔ میں یہ نہیں سہہ سکتا کہ تم ان کی بنو۔۔۔''

''چاہو تو عربوں، یہودیوں اور افریقیوں کی بھی اس فہرست میں شامل کر لو!''

---

13۔ kike: مہاجرت کرنے والے یہودی کے لیے امریکی امیگریشن کے افسروں کا گھڑا ہوا تضحیک آمیز لفظ۔

''عرب؟ مجھے ان سے نفرت ہے۔ میں وہ عرب ہوں جو خود کو ناپسند کرتا ہے۔ ٹھیک۔ چلو بات صاف ہوگئی۔ ٹھیک ہے۔ یہ لو، میں چل دیا: تم بدچلن ہوتی جا رہی ہو، طوائف بن رہی ہو، اور تم اماں کو تکلیف پہنچا رہی ہو۔''

''بس اسی کی کسر رہ گئی تھی کہ اماں کو بھی بیچ میں گھسیٹ لاؤ! مجھے کم از کم ایک ماں کا ضرور معلوم ہے جس کا دل اپنے لاڈلے کا یہ حال دیکھ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔''

''یہ سارا تمھارا قصور ہے! ہم ایک ہاتھ کی انگلیوں کی طرح ساتھ ساتھ رہ سکتے تھے، لیکن تم، تم نے ملک اور گھر والوں کو چھوڑ کر چلے جانے کی یہ ترکیب لڑائی اور اب اپنا بیڑا غرق کر رہی ہو! ایک ترک میری بہن کے ساتھ جفتی کر رہا ہے — تم کیسے توقع کرتی ہو کہ یہ مجھ سے برداشت ہوگا؟''

عازل نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ایک بار میں رک کر ایک کے بعد ایک وہسکی کے جام چڑھائے۔ جب خوب چڑھ گئی تو ٹیکسی لے کر میکیل کی قیام گاہ واپس پہنچا۔

پیش کمرے میں داخل ہوتے ہی وہاں قے کر ڈالی۔ کارمن نے اس کا سوٹ کیس اٹھا کر باہر فٹ پاتھ پر ڈال دیا اور حکم دیا کہ ہرگز کبھی واپس نہ آئے۔ اس دھچکے سے اس کے ہوش و حواس اچانک بحال ہو گئے اور صورتِ حال پوری وضاحت سے نظر آنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ خاتمہ آ پہنچا ہے۔ وہ آخری بار اس گھر کی دہلیز پھلانگ رہا ہے۔ پھر اسے بڑی دل افزا راحت سے ملتی جلتی کسی کیفیت کا احساس ہوا: آخرکار اب وہ آزاد ہو گیا ہے، جا کر کیف سے لطف اٹھائے، سستی شراب پیے، سڑکوں پر وقت گزارے، اپنے یاروں سے ملتا پھرے، وہ یار جن کی مایوسیاں اس کی جیسی تھیں۔ اس محلے تک پیدل پہنچنے میں کافی وقت لگا، جہاں اس کا دوست عباس ایک مقامی بااثر ہستی تھا۔

''میں آزاد ہوں، بالآخر آزاد!'' اس نے عباس کے نظر میں آتے ہی نعرہ لگایا۔ ''اب مجھے مناسب روزگار کے لیے کسی مرد کی لینے کی ضرورت نہیں!''

# 25

## ملیکہ

ملیکہ کو رات سے خوف آتا تھا۔ کھانسی بھی سب سے زیادہ اسی وقت آتی تھی۔ کبھی کبھی تو اتنا کھانستی کہ دم گھٹنے کو آجاتا، اور پھیپھڑوں سے بلغم نکالنے کی جدوجہد میں آنسو نکل آتے۔ وہ چمچہ بھر بھر کے شہد نگلتی؛ اس سے لمحہ بھر کے لیے حلق کو پہنچنے والی تسکین اچھی لگتی تھی، لیکن جیسے ہی دوبارہ لیٹتی، کھانسی کسی اضطراری پھڑکن کی طرح پھر لوٹ آتی۔ اس کی بہن کا شوہر شکایت کرتا کہ ملیکہ کے لگاتار کھانسنے سے اس کی نیند کھل جاتی ہے۔ یہ ملیکہ کی بہن ہی تھی جو اسے بالآخر 'قرطبی ہسپتال' لے گئی جو گھر سے بمشکل ایک منٹ کی مسافت پر تھا۔ اگر ان کے پاس مرودزس کی مٹھی گرم کرنے کے لیے پچاس درہم ہوتے تو ڈاکٹر سے ملاقات پہلے ہو جاتی۔ لیکن جو حال تھا اس میں ساری صبح انتظار کرنا پڑا۔ ڈاکٹر نوعمر تھا اور کام کی زیادتی سے مغلوب ہوتا نظر آرہا تھا۔ مریضوں کی بہتات تھی اور ذرائع ناکافی۔ بہتر زندگی کی جستجو میں یہ ڈاکٹر بھی دوسروں کی طرح وسطِ شہر میں جا پہنچنے کے خواب دیکھتا تھا۔ شاید کسی پرائیویٹ کلینک میں کام مل جائے یا، مثلاً، اوسلو کے کسی ہسپتال میں۔ ناروے میں ڈاکٹروں کی کمی تھی اور وہاں کے لیے ابھی حال ہی میں چند مشرقی افریقی عرب بھرتی کیے گئے تھے جنھیں یخ آب و ہوا کا خوف نہیں تھا۔ لیکن فی الوقت ڈاکٹر کو اپنی سرکاری طبی خدمت عوامی ہسپتال میں بہرحال پوری کرنی تھی جس کا قیام چالیس سال پہلے ٹھیک آزادی ملنے کے فوراً بعد عمل میں آیا تھا۔ اس ادارے میں ہر چیز ابتری کا شکار تھی —— دیواریں، کمرے، عملے کے ملازمین، انٹرنز (interns)[14] آوارہ بلّیاں اور کتے۔ افزائش ہوئی تھی تو صرف درختوں کی جو بڑی شاندار صحت کے عالم میں دکھائی دیتے تھے۔

ڈاکٹر نے ملیکہ پر بمشکل ایک نظر ڈالی تھی کہ پکار اٹھا، ''اُن جھینگوں کا ایک اور شکار!''

اس ہسپتال میں شہر کے غریب غربا ہی آتے تھے اور ظاہر ہے انھی کے بچے جھینگا فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ ملیکہ ڈر کے مارے سسکیاں لے رہی تھی۔ ڈاکٹر نے یقین دلایا کہ وہ اسے تکلیف

---

14۔ intern: ڈاکٹر جو ڈگری ملنے کے بعد ایک معینہ مدت تک کسی آزمودہ کار ڈاکٹر کے زیرِ نگرانی کام کرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

نہیں پہنچائے گا، لیکن ملیکہ کو معائنے سے خوف نہیں آرہا تھا، بلکہ موت سے، اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیے بغیر دنیا سے رخصت ہوجانے سے، ملک چھوڑے بغیر رخصت ہوجانے سے، ٹھنڈی یخ قبر کے گڑھے میں دفن ہونے کے لیے رخصت ہوجانے سے۔ ملیکہ خوفزدہ تھی تو اس لیے کہ اسے ڈاکٹر کی آنکھوں میں صاف نظر آرہا تھا کہ وہ کتنی زیادہ بیمار ہے، وہ اس کی حالت پر کس قدر پریشان ہوگیا تھا، کیونکہ اپنے سخت مشقت طلب کام کے باوجود وہ باطنی طور پر ہنوز ایک رحمدل انسان تھا۔ اس بچی کو بچا پانے سے اپنی معذوری پر اسے واقعی غصہ آرہا تھا۔ تاہم اس نے ملیکہ کو ایکسرے کرانے کے لیے بھیجا، ایکسرے کا بغور معائنہ کیا، اور ایک دوسرے ڈاکٹر کو فون کیا جس سے خاصی تکنیکی زبان میں گفتگو کی، جس میں ملکیہ کو 'نمونیا' کا لفظ بار بار سنائی دیا۔

ڈاکٹر نے ملیکہ کو ہسپتال میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے ایک کمرے میں پہنچادیا گیا جس میں پہلے سے چند اور مریض بھی موجود تھے۔ پھر اس نے نسخہ لکھ کر ملیکہ کی بہن کو دیا اور بتایا کہ مجوزہ دوائیں کافی طاقتور ہیں اور قدرے مہنگی۔ ''میں کچھ نہ کچھ انتظام کرلوں گی،'' بہن نے کہا۔ اسے ابھی ابھی اندازہ ہوا تھا کہ ملیکہ سخت بیمار ہے۔ فارمیسی میں معلوم ہوتے ہی کہ دوا پر ہزار درہم سے زیادہ لگیں گے، اس نے فوراً ایک طلائی کنگن کلائی سے اتارا اور بھاگم بھاگ حسن جوہری کی دکان پر بیچنے صیاغین پہنچی۔ دوا کے علاوہ کچھ نوغا [چبانے والی مٹھائی] بھی خریدی جس کی چھوٹی بہن گرویدہ تھی۔ ہسپتال کے کمرے لوٹنے پر مرد نرس برقاش نے اشارتاً کہا کہ وہ ملیکہ کی اچھی خبر گیری کرسکتا ہے، سو بہن نے اسے سو درہم دے دیے۔ اس کے بعد اس نے تنبیہاً کہا کہ پلنگ کے سرہانے کی میز پر کبھی دواؤں کی تھیلی نہ چھوڑا کرے۔

''یہاں لوگ سب کچھ چرا لیتے ہیں،'' اس نے خبردار کیا۔ ''بہتر ہوگا کہ روز بھر کی گولیاں لے آیا کرو اور بقیہ گھر پر رکھو۔ اسے فرانس کی بنی ہوئی اینٹی بایوٹکس دی جارہی ہیں جو بہت مہنگی ہوتی ہیں، اسی لیے ہسپتال میں کام کرنے والے خاص ان کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ فکر نہ کرو، میں سب چیزوں پر نظر رکھوں گا، اور بچی انشاءاللہ صحت یاب ہوجائے گی اور پھول کی طرح کھل اٹھے گی، کیونکہ اینٹی بایوٹکس بڑی طاقتور اور مہنگی دوائیں ہیں، اور جتنی زیادہ مہنگی ہوں اتنی ہی زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہیں، یہ بالکل سادہ بات ہے، ہے نا؟ اسپرین کی مثال لے لو، سستی ملتی ہے اور، ظاہر ہے، بمشکل ہی

Scanned with CamScanner

کسی مرض کا علاج کرتی ہے۔ اور میں اسے سوپ بھی دگنا دے دیا کروں گا۔ یہ چھوٹی سی بٹیا، یہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں اس کا خیال رکھوں گا، تم بے فکر گھر جاؤ؛ ڈاکٹر اچھا آدمی ہے، وہ بچی کا اچھا خیال رکھے گا۔"

ملیکہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے آنسوؤں پر کیسے قابو رکھے — یہ خوف تھا جو آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں میں امڈا چلا آ رہا تھا اور اس کے رخساروں پر بہہ رہا تھا۔ اس نے ارد گرد نظر ڈالی: ہر مریض خاموشی کے عالم میں تکلیف اٹھا رہا تھا۔ جب کوئی ڈاکٹر پاس سے گزرتا تو ایک ہی لمحے میں اچانک سارے سر اوپر اٹھ جاتے اور مدد کے طلبگار ہوتے۔

اب ملیکہ کچھ کم کھانس رہی تھی لیکن سو نہیں پا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھلی رکھیں۔ اسے یقین تھا کہ موت راہداری میں اس کی گھات لگائے بیٹھی ہے یا شاید کمرے میں داخل بھی ہو چکی ہے تاکہ رخصتِ عظیم کے لیے کوئی امیدوار مل جائے۔ ملیکہ نے اپنی ناک دبائی؛ موت کی بو اب ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ ہاں، اسے خیال آیا، موت کی بھی اپنی گندھ ہے: تلخ، تباہ کار، پیپ اور پھپھوند کے بین بین کی کوئی گندھ، گرما کی گندھ جس کا گلا سرما کے اندھیروں نے گھونٹ دیا ہو، گندھ جس کا رنگ بھی تھا، ایک طرح کا پھیکا زرد جو بتدریج خاکستری ہوتا جا رہا ہو، ایک گندھ جو جسم کو اپنے بوجھ سے دبا ڈالے۔ اب ملیکہ کو اس شک نے آلیا کہ اس کے برابر کے پلنگ پر جو بڑھیا پڑی ہے اُسے موت ہی اٹھا لے گئی ہے۔ ملیکہ نے جتنے بھی غور سے اس کے سینے کا معائنہ کیا وہ بے حرکت ہی نظر آئی۔ وہاں کوئی چیز بھی تو نہیں ہل جل رہی تھی۔ واقعی وہ مر چکی تھی۔ ملیکہ نے بوڑھی عورت کی پیشانی چھونے کی نیت سے ہاتھ بڑھایا؛ وہ سرد تھی اور اس کا پھٹا سا کھلا منھ لڑھکا ہوا تھا۔ ملیکہ کی چیخ نکل گئی۔ دو مرد نرس اسٹریچر لیے آرام آرام سے آئے، اس کے عادی کہ جب کوئی رات کو اچانک چلّاتا ہے تو اس لیے کہ کوئی مر گیا ہوتا ہے۔ دونوں شور مچاتے اور آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے، جیسے چوٹ کھایا مال لے جا رہے ہوں، اسٹریچر بردار مردہ خانے کی طرف چل دیے۔ ملیکہ کپکپا رہی تھی۔ موت کی سرد سانسوں نے اسے چھو لیا تھا، اور وہ اس بیچاری عورت کو سرد خانے میں پڑا ہوا تصور کرنے لگی۔ "اب کہ وہ اُس پار چلی گئی ہے، اسے سردی کا احساس نہیں ہوگا۔ کل اس کے گھر والے بالآخر آ پہنچیں گے، اس کے گرد کھڑے رو رہے ہوں گے۔" جب موت تاک میں پھر رہی ہو تو کسے نیند آ سکتی ہے؟ ملیکہ

Scanned with CamScanner

کو اس کی موجودگی ابھی تک محسوس ہو رہی تھی، جس کی چغلی وہ بھیدی گندھ کھا رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات کی رو میں بہہ نکلی...

کاش میں فرانس میں ہوتی، ہسپتال میں تو نہ ہوتی— کیونکہ میں سرے سے بیمار ہی نہ پڑتی، کیونکہ میں اس یخ بستہ فیکٹری میں کام نہیں کر رہی ہوتی، مجھے یہ پھیپھڑوں کی بیماری نہ لگتی، مجھے موت کی یہ بساند برداشت نہ کرنی پڑتی جس کی وجہ سے میں آنکھیں بند رکھنے پر مجبور ہوں... جس سے موت شاید یہ سوچتی ہو کہ میں نے سانس لینا بند کر دیا ہے اور مجھے بھی لے کر چلتی بنے! موت کبھی کبھی غلطی بھی کر بیٹھتی ہے، بڑی بھیانک غلطی، لیکن میں اس کے ہاتھ آنے سے رہی، نہ یہاں نہ کہیں اور۔ مجھے کوچ کر جانا چاہیے تھا، مجھے عازل کا دامن پکڑے رہنا چاہیے تھا، کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے تھا، وہ کتنا خوبصورت اور بھلا ہے، اس نے مجھے کبھی نہ چھوڑا ہوتا۔ اوہ، عازل، تم اب کہاں ہو؟ تم کیوں نہیں آ کر مجھے پانی کے اُس پار لے جاتے؟ مجھے چاہیے تھا کہ بچوں سے بھری اس کار میں سوار ہونے پر راضی ہو جاتی، لیکن میں اپنے والدین کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی تھی، وہ مجھے کہاں کہاں تلاش کرتے پھرتے، میری اماں پاگل ہو جاتیں، تو میں نے انکار کر دیا، حالانکہ یہ بہت آسان تھا: اس آدمی کے پاس پاسپورٹ اور چھ بچوں کے فوٹو تھے، وہ رات کے وقت روانہ ہونے والا تھا، اور بچے سو رہے تھے، کسٹم کے افسر نے پچھلی سیٹ پر بس ایک نگاہ ڈال کر پاسپورٹ پر ٹھپا لگا دیا ہوتا۔ مجھے یہ کہانی کئی بار سنائی گئی تھی۔ وہ آدمی شمالی اطالیہ سے آیا تھا۔ وہ بچوں کو ایک اور مراکشی کے پاس لے جاتا جو انھیں سڑک پر کام میں لگا دیتا۔ انھوں نے مجھ سے کسی خاندان میں کام دلوانے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی کہ اسکول کی پڑھائی جاری رکھ سکوں گی۔ میرا جی تو بہت للچایا: اطالوی سیکھ سکوں گی، کچھ دنیا دیکھ سکوں گی، لیکن میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی، میں نے تو ان سے اس منصوبے کا ذکر تک نہیں کیا، انھیں کیوں پریشان کروں؟— خاص طور پر اماں کو، لیکن اب میں پچھتا رہی ہوں، مجھے اس مہم پر نکل جانا چاہیے تھا... اماں نے پرلے دن بتایا تھا کہ عزالعرب کی بہن اسپین چلی گئی ہے؛ اور یوں معلوم ہوتا ہے ان کی ماں بھی عنقریب بیٹے بیٹی سے جا ملنے والی ہے، صرف اس لیے کہ ایک مالدار آدمی ان کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ کتنے خوش قسمت ہیں! اے کاش...

دواؤں نے اثر کرنا شروع کر دیا تھا: اب ملیکہ کو نیند آ گئی تھی، اور خواب دیکھ رہی تھی۔ وہ

Scanned with CamScanner

دوبارہ صحتمند ہوگئی ہے، دراز قامت اور حسین، لمبا سا نیلا لباس پہنے ہے، آہستہ آہستہ تمکنت سے سرخ قالین پر چل رہی ہے جو اس موقعے کے لیے بچھایا گیا ہے۔ دوسری عورتیں، جو اس کے جتنے ہی دیدہ زیب لباس پہنے ہیں، اس کے برابر چل رہی ہیں، پھر آگے نکل جاتی ہیں؛ جب قالین کی انتہا پر پہنچتی ہیں تو ایک دم غائب ہو جاتی ہیں، جیسے کھڑی چٹان سے چھلانگ لگا دی ہو۔ ملیکہ غائب نہیں ہونا چاہتی، وہ رفتار اور بھی آہستہ کر دیتی ہے، متلاشی ہے کہ کوئی آ کر اس کا ہاتھ تھام لے۔ اپنی راہ کے خاتمے پر پہنچنے سے پہلے، ایک سر تا پا سفید پوش اپنا بازو اس کی طرف بڑھاتا ہے، پھر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے تاکہ اس چبوترے تک لائے جہاں ایک بہت لمبی سی کالے رنگ کی کار منتظر کھڑی ہے۔ ٹھیک اس وقت وہ پہچان لیتی ہے کہ یہ وہی ڈاکٹر ہے جس نے اس کا علاج کیا تھا۔ اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا ہے: وہ خوش نظر آ رہا ہے، پرسکون۔ ایک دیو قامت اسٹیم لائنر کا نچلا خانہ کھلا ہے۔ لیموزین کا نصف اس کے منھ کے اندر ہے۔ ملیکہ اسے اپنی قیادت کرنے دیتی ہے۔ ڈاکٹر مسکراتا ہے، لیکن جیسا کہ گونگی فلموں میں ہوتا ہے، وہ جو کہہ رہا ہے وہ ملیکہ کو سنائی نہیں دیتا۔ اب وہ لیموزین میں بیٹھی ہوئی ہے، جو کج کج زیریں خانے کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے، جہاں بہت سی دوسری لیموزینیں بھی کھڑی ہیں، سب کی سب بڑی ترتیب سے قطار میں ہیں۔ اسے خفیف سی حرکت کا احساس ہوتا ہے، پھر کامل سکون کا۔ جہاز شور مچاتا ہوا سمندر پر حرکت کر رہا ہے۔ ڈاکٹر جا چکا ہے۔ بس اسی وقت وہ اپنے برابر بیٹھی ہوئی بڑھیا کو پہچان لیتی ہے۔ ملیکہ چیخ مارتی ہے لیکن کوئی آواز نہیں نکلتی۔ وہ اپنا لباس پھاڑ ڈالتی ہے۔ بوڑھی عورت مسکراتی ہے اور اس کا پوپلا منھ نظر آتا ہے۔ آنکھوں کے بجائے اس کے دو چھوٹے سے تاریک گڑھے ہیں۔ وہ جتنا زیادہ مسکراتی ہے، ملیکہ اتنی ہی زیادہ چیخیں مارتی ہے۔ جہاز طنجہ کی بندرگاہ سے روانہ ہو چکا ہے۔ وہ رات کی تہوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ اب بوڑھی عورت نے مسکرانا بند کر دیا ہے۔ اور ملیکہ نے چیخنا چلانا۔ وہ ابدی خاموشی میں ملک چھوڑتی ہے۔ بالآخر وہ کوچ کر چکی ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔

Scanned with CamScanner

# 27

## کنزہ

کنزہ نے آئینے میں دیکھا تو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ خوبصورت ہے۔ وہ خوش ہوئی۔ محض دل لگی میں بالوں پر بدوضع اسکارف باندھ کر کسی باحجاب مسلمان عورت کی نقل اتاری۔ تو یہ ان کی آزادی ہے، اس نے سوچا۔ خیر، یہ ٹھہرا ان کا معاملہ، کسی کو اس سے کیا۔ رہی میں، تو میری آزادی ایک مرد سے محبت کرنا ہے جو مجھے ہر اعتبار سے اچھا لگتا ہے اور مجھے مسرت بخشتا ہے۔ اسے ناظم کی جو چیزیں سب سے زیادہ اچھی لگتی تھیں وہ اس کی ہلکی زردی مائل، تقریباً سبز آنکھیں، لمبے لمبے مضبوط ہاتھ، آبنوسی رنگ کی جلد، اور مسکراہٹ تھی۔ نہاتے میں بچپن کی یادیں اس کے ذہن میں موجوں کی طرح تھپیڑے مارنے لگیں... اسے وہ دن یاد آیا جب باپ نے اسکول جانے آنے کے لیے سائیکل لا کر دی تھی اور مارے خوشی کے اس کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ سارے محلے میں تنہا وہی ایک لڑکی تھی جس کے پاس سائیکل تھی۔ پھر اس نے بڑے غور سے اپنے جسم کا معائنہ کیا، پیٹ تھپتھپایا، چھاتیوں کو ہاتھوں میں بھر کر ان کے وزن کو محسوس کیا۔ آخر میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر لحاظ سے ایسی عورت ہے جس کی خواہش کی جا سکے۔

سو یوں لگتا ہے کہ بالآخر عشق کرنے کے لیے مراکش چھوڑنا پڑا، اس کیفیت کے تجربے کے لیے جو انسان کو اتنا ہلکا پھلکا بنا دیتی ہے، اتنا حاضر: مجھے ہر اس چیز سے خود کو نجات دلانی پڑی جو ثقلِ گراں کی طرح حاوی تھی، مجھے روکے ہوئے تھی، جس نے مجھے تسلیم و رضا اور سکوت سے باندھ رکھا تھا — عورت بننے کے لیے مجھے ان سب سے دامن جھٹکنا پڑا، ایک محبت کرنے والی عورت بننے کے لیے جو ایک بالغ اور متوجہ مرد کی آغوش میں ہو، ان تمام مراکشی مردوں سے مختلف جن سے میں ملی ہوں۔ اس کی موجودگی میں مجھے کچھ کرنے کی جرأت ہو سکی ہے، اور میرا احساسِ آزادی قوی تر ہو گیا ہے۔ بکارت کی فکر عذابِ جان بنی ہوئی تھی، سو میں نے سوچا، چلو اس کا قصہ ہی پاک کر دیتے ہیں اور میں نے خود کو اپنے عم زاد عبدالرحیم کے سپرد کر دیا تھا، جو کہتا تھا کہ میرا والہ و شیدا ہے۔ ایک سخت ناگوار

Scanned with CamScanner

یاد! کیا تماشا ہوا تھا! دخول کے لیے خود مجھے ہی اس کی مدد کرنی پڑی تھی، وہ اس بری طرح لرز رہا تھا! اور ذرا سا خون نظر آتے ہی اس کا عضو یکبارگی رانوں میں سکڑ کر رہ گیا تھا۔ وہ ہکلا ہکلا کر بول رہا تھا اور پسینے میں نہا گیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ ہم واقعی عمل سے گزر لیے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اب میں اپنے کو باکرہ تصور نہیں کر سکتی تھی۔ ایک اور مرتبہ میں نے خود کو اپنے ایک اور عم زاد نورالدین کے حوالے کر دیا تھا، جس سے عازل کو بڑی امید تھی کہ مجھ سے شادی کر لے گا۔ بڑا جاندار آدمی تھا، اگرچہ قدرے اجڈ۔ مجھے اوجِ لذت تک تو نہیں پہنچا سکا، مگر کم از کم یہ ہے کہ اس کا عضو بڑا زور آور تھا۔ یہ اس کے اُس کشتی پر سوار ہونے سے پہلے ہوا تھا، اور میں ابھی تک اسے دیکھ سکتی ہوں، اپنے پر کیسا فخر کر رہا تھا، چادر سے آلائش کو کس طرح صاف کر رہا تھا، اپنے آنے والے سفر کا اس طرح ذکر کر رہا تھا جیسے ہمارے بڑے بوڑھے اپنے مکہ کے حج کا کیا کرتے تھے۔ وہ یہاں سے ہونے والی روانگی کو ہر مسئلے کا حل سمجھتا تھا۔ ظاہر ہے، میں اس کے منصوبوں کا حصہ تھی: طنجہ میں شادی، برسلز میں ملن، بچے، اور بقیہ وہ سب جو ہوتا ہے۔ میں نے اسے خواب دیکھنے دیے۔ مجھے اس کے ساتھ اپنی زندگی تعمیر کرنے کی کوئی خاص خواہش نہیں تھی؛ وہ خوبصورت اور خوشگوار ضرور لگتا تھا، لیکن مجھے اس سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ جب میں نے یہ سب ماں کو بتایا تو وہ بولی، ''تو کیا تمھارے خیال میں مجھے تمھارے والد سے محبت تھی؟ محبت، یہ جسے تم نوجوان لوگ 'محبت' کہتے ہو، ایک تعیش ہے: یہ وقت کے ساتھ آتی ہے یا سرے سے کبھی نہیں آتی۔ تمھارے والد کو اور مجھے ایک دوسرے کے ساتھ کافی وقت نہیں ملا تھا، وہ بہت جلد گزر گئے۔ سنو، میری بیٹی، اس لڑکے کو ہاتھ سے نہ جانے دینا! پہلے اس سے شادی کرو اور بعد میں اسے جو چاہے بناتی رہنا، میں تمھاری مدد کروں گی، تم دیکھو گی کہ عورت ہی ہر بات کا فیصلہ کرتی ہے: وہ اپنے مرد کو یہ محسوس کراتی ہے کہ اسی کا حکم چلتا ہے، جبکہ حقیقت میں حکم تو وہ چلاتی ہے!''

عازل کو ہرگز اس کا پتا نہیں چلا ہوگا کہ ہم ساتھ سو چکے ہیں۔ چھت پر چڑھ کر سارے میں اس کا ڈھنڈورا پیٹنے کی میری کوئی نیت نہیں تھی، لیکن جس دن نورالدین مرا اور اس کی لاش اس کے گھر والوں کے حوالے کی گئی، مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے عازل سے اس سہ پہر کا ذکر کر دیا جو نورالدین اور میں نے آغلا کے ساحل پر عاشقوں کی کٹیا میں گزاری تھی۔ میں نورالدین کا تابوت

دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ میں وہ آخری عورت تھی جس نے اسے لذت پہنچائی تھی۔ میں بڑی دیر تک روتی رہی۔ آج میں ایک مختلف عورت ہوں، اور یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ کچھ مدت تک مجھے یہ ڈر لگا رہا کہ اب میں کسی اور مرد کی خواہش نہ کر سکوں گی، کہ موت نے مجھے کچل کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ میرے احساسات صرف جسمانی کشش تک محدود تھے، موت نے میرے جذبات پراگندہ کر دیے تھے اور مجھے اس کا قائل کر دیا تھا کہ مجھے نورالدین سے محبت تھی۔ یہ وہ نہیں تھا جو میں چاہتی تھی۔ مہینوں تک میں اس کے بھوت کے ساتھ زندہ رہی۔ عجیب عجیب سے خیالات آتے رہے، ایسے مرد سے محبت جس کا اب وجود نہیں رہا تھا، وہ جو جا چکا تھا، مر چکا تھا اور دفن ہو چکا تھا۔ ایک دن میں اس مشہور زمانہ کٹیا کی زیارت کو گئی۔ اندر داخل ہوئی اور بستر پر لیٹ گئی، جس کی چادریں ابھی تک نہیں بدلی گئی تھیں۔ میں نے انھیں سونگھ کر دیکھا: ان سے بڑی شدید بو آ رہی تھی۔ یہاں سے موت گزری تھی، اور اپنی تھوڑی سی راکھ پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ جب میں عاشقوں کی کٹیا سے بھاگی، ایک آوارہ کتا میرا پیچھا کرنے لگا۔ ایک پہریدار نے میری جان بچائی: بعد میں اوپر چٹان پر لوٹ جانے کے لیے مجھے اپنی گھوڑی پیش کی۔ کنارے پر افریقیوں کی ایک ٹولی پیڑ کے سائے میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ میں یہ سوچنے سے باز نہ رہ سکی کہ ان میں سے بعض جلد ہی رات کی تاریکی میں پانی میں ڈوب جائیں گے۔ میں نے مالی یا سینیگال کے کسی گاؤں میں ان کے بچپن کا تصور کیا، اور ان کی زندگی کا: نادار لیکن لامحالہ افسردہ نہیں۔ میں نے ان کی ماؤں، دادیوں نانیوں اور چچیوں کو کھانا پکاتے ہوئے تصور کیا؛ میں ان کے خوابوں کا اندازہ لگا سکتی تھی، لیکن مجھے احساس ہوا کہ یہ مرنے سے خوفزدہ نہیں تھے۔ اپنی حاضرہ غربت اور تنہائی کے باوجود، وہ ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ گھر پہنچ کر میں پھر رونے لگی۔ مجھے اپنی تباہ حالت کا خاتمہ کرنا ہی تھا، نورالدین کی بابت سوچنا بند کرنا تھا، خوابی پہاڑوں پر چڑھنے سے باز آنا تھا، جو اب بحرِ متوسط کی تہہ میں بہے جا رہے تھے۔ ان افریقیوں کو ہنسی مذاق کرتے ہوئے دیکھنا میرے لیے سودمند ثابت ہوا تھا۔

تو مجھے اپنا ملک چھوڑنا ہی تھا... چھوڑنا ہی تھا، اور گھر والوں کو، اور پہلے ایک من بھاؤنے مرد کی بیوی بننا تھا، اور پھر بالکل اتفاق سے ناظم سے ملنا تھا—ایک مہاجر یا جلاوطن (ان میں سے کون، یہ مجھے ابھی تک معلوم نہیں)، ایک سچ مچ کا مرد— صرف اپنی افسردہ کن داستان سے نجات

پانے کے لیے ہی نہیں بلکہ محبت، سچی محبت کا تجربہ کرنے کے لیے بھی، وہ محبت جس سے جسم میں جھرجھری آ جاتی ہے، قدم ڈگمگانے لگتے ہیں، جو آدمی کو نازک اور شفاف بنا دیتی ہے، اور کسی بھی چیز کے لیے تیار۔ میں اس کیفیت سے لاعلم تھی جس میں جسم، جس کی اتنی خواہش کی جائے، اتنی محبت کی جائے، بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے اور شہر پر ایسی ہوس کے ساتھ نظر ڈالتا ہے جیسے ہر قسم کی کوشش کرنا چاہتا ہو، ہر چیز کو اپنے میں سمو لینا اور قبول کر لینا چاہتا ہو۔

شروع میں ناظم مجھ پر اتنی توجہ دیتا کہ یہ تقریباً دکھاوا لگتا۔ بستر میں دیر تک مجھے سہلاتا رہتا؛ کہتا، مجھے تیار کر رہا ہے: مجھے اپنی پیٹھ، اپنے ہاتھوں، اپنی بانہوں میں جنت کی طرف لے جاتا، رقص کرتا، مجھے اپنی آغوش میں بھر لیتا، پھر تقریباً ناگہانی جفتی کرتا، بڑی نرمی سے دخول کرتا اور مجھے لذت سے پاگل کر دیتا۔ مجھ سے اپنی زبان میں بات کرتا، مجھے بے اختیار ہنسا دیتا۔ میں طنجہ کی عربی بولی استعمال کرتی، جس کا تیز بلند آہنگ اسے بہت مرغوب تھا۔ میں اس کی تھی۔ میں نے اپنے شوہر کو اس راز میں شریک کیا۔ میگیل کو میری خاطر مسرت ہوئی۔ ''تم بڑی حسین ہو،'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''تم اس جیسے آدمی سے محبت کیے جانے کی مستحق ہو! آہ، کاش تم جانتیں کہ مجھے تم پر کس قدر رشک آتا ہے۔''

کنزہ غسل کر کے باہر نکلی، روب پہنی اور فون کی طرف لپکی۔ پولیس والے تھے، کہہ رہے تھے کہ آ کر اپنے بھائی کو لے جاؤ۔ جب وہ تھانے پہنچی تو عازل کو نشے میں اتنا دھت پایا کہ اسے تقریباً پہچانا ہی نہیں۔ ایک آفیسر نے بتایا کہ اس کے بٹوے میں ایک پرزہ ملا جس پر لکھا تھا: ''اشد ضرورت پر میری بہن کنزہ کو 54 36 33 95 پر فون کریں۔'' وہ عازل کو گھر لائی اور اس کے ہوش و حواس بحال ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ تم کچھ بھی کرو، اس نے خود سے کہا، لیکن میگیل کو فون نہ کرنا۔

خدا خدا کر کے عازل بیدار ہوا اور غسل کیا، پھر قہوہ مانگا، اور مصر ہو گیا کہ کنزہ اسے اپنی وضاحتیں کرنے دے۔ پہلے کنزہ نے سننے سے انکار کر دیا، کیونکہ اسے کام پر جانا تھا۔ لیکن عازل نے اس سے مجبوراً ٹیلیفون کروا کر اطلاع دلوائی کہ وہ گھنٹہ بھر دیر سے پہنچے گی۔ اسے اپنی بات کرنے کی اشد ضرورت تھی۔

# 28

## عازل

''میری بہن، بڑی بہن، میری دوست، خدا کے لیے میری بات سنو، مجھے تمھاری ضرورت ہے، یہ صورتِ حال جاری نہیں رہ سکتی، میں قعرِ جہنم میں اترتا جا رہا ہوں، تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ میں ہر چیز میں ناکامیاب ہو رہا ہوں۔ پچھلے ہفتے، میں اپنی دوست سہام سے ملنے گیا تھا جو ماربیا میں ملازمت کرتی ہے۔ ہم واقعی ایک دوسرے کے گرویدہ ہیں۔ مجھے ہمیشہ اس کی رفاقت میں لطف آیا ہے۔ . . . بہن، معاف کرنا، مجھے تم سے ایسی باتیں کرنے کی ضرورت ہے جن کا ذکر بہن بھائی آپس میں نہیں کرتے۔ سہام اور میرا تعلق — یہ کسی اور چیز کے مقابلے میں جنس سے زیادہ تھا، اور مجھے اپنی رجولیت قائم رکھنے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ اور اسے بھی جو وہ چاہتی تھی مل رہا تھا۔ ہم ساتھی تھے، ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے، اور اس سے ہمیں لذت ملتی تھی۔ لیکن، گزشتہ ہفتے، 'والو!' — صفر۔ پتا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ تہہ میں پہنچ جانا۔ میں مرد نہ بن سکا، معاف کرنا، لیکن مجھے اس کا ذکر کیے بغیر چارہ نہیں، اسے تو سامنے آنا ہی ہے، یہ ندامت — حد درجہ ندامت، 'حشومہ!'[15] سہام بڑی شرافت سے پیش آئی، اس نے کچھ نہیں کہا، سوائے اس کے کہ یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں، یہ صرف تھکن، دباؤ اور آب و ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ کیسی تھکن، کیسا دباؤ؟ ڈالر کی شرح مبادلہ اور ٹڈی دل کی آفت کی وجہ سے کیوں نہیں؟ میں برباد ہو گیا، میری رجولیت فنا ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؛ کل اس مراکشی عورت سے ملنے گیا جو اپنے کویتی 'شوہر' کے چھوڑ کر چلے جانے کے بعد سے بستر گرما رہی ہے، اس کا نام یاد نہیں آ رہا، بس اتنا یاد ہے کہ میرے ساتھ لذت سے بے قابو ہو جاتی تھی، اور جب انتہا پر پہنچتی تو چیخیں مارنے لگتی۔ تو میں رات اس سے ملا، تھوڑی سی پی بھی لی کہ کچھ اعتماد آ جائے، مجھے پھر سے ناکام رہنے کا ڈر لگا ہوا تھا، اور جب میں کپڑے اتار رہا تھا، وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی! بولی، 'تمھارا یار کہاں چھپت ہو گیا ہے؟' میں نے پوچھا، 'کس یار کا پوچھ رہی ہو؟'

---

15۔ hchouma (حشومہ): الجزائری عربی میں 'عار'، 'شرم'، 'خجالت'، 'ندامت' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

'وہی، آدمی کا بہترین یار،' وہ بولی، 'جو عورت کو دیکھتے ہی فوراً بیدار ہو جاتا ہے، ہیلو کہتا ہے اور ایک دم اتنا تن جاتا ہے کہ عورت کو پاگل کر دیتا ہے... ' والو! والو! میں والو ہو گیا ہوں، ایک صفر، ایک عدم، آدمی کی یاد، اس کی پرچھائیں... مجھے یقین ہے یہ کارمن کا کیا دھرا ہے، وہی جو میگیل کو ڈراتی دھمکاتی ہے اور اس کی زندگی پر قابض ہے ——وہ کبھی مجھے ایک آنکھ نہ برداشت کر سکی، ہمیشہ مجھے یوں دیکھتی جیسے کوئی گھس بیٹھیا ہوں، چور ہوں؛ ہو نہ ہو وہ جادوگروں اور ڈائنوں کے پاس گئی ہوگی تاکہ مجھ پر افسوں پھنکوا دے، یہ چیزیں صرف ہمارے ساتھ مخصوص نہیں، خود یورپی بھی جادو ٹونا استعمال کرتے ہیں، بس یہ ہے کہ کوئی ان باتوں کا ان پر شبہ نہیں کرتا، لوگ انھیں عقل والا سمجھتے ہیں، تہذیب یافتہ، وغیرہ وغیرہ، لیکن ان کے اندر جھانک کر دیکھو تو یہ ہم جیسے ہی نظر آئیں گے: جہاں بیچ میں جنس اور پیسہ آ جائے، ان کا ردعمل ہو بہو ہم جیسا ہوتا ہے!

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ کس طرح شروع ہوا۔ ایک شام ——اسے ایک مطلق ڈراؤنا خواب ہی کہنا چاہیے—— میگیل نے چند برازیلی دوست بلا رکھے تھے ——سب کے سب جنس بازی کے دھتی—— اور مجھ سے ایک بلا کی حسین عورت کے ساتھ جفتی کرنے کے لیے کہا جو حقیقت میں ایک مرد تھی: یہ سب بڑا خوفناک تھا، مجھے سخت تنفر محسوس ہوا، وہ مجھے ٹھیک لونگ روم کے بیچ میں جفتی کرتا دیکھ رہے تھے! شروع میں مَیں بھی اس سے تفریح لے رہا تھا، ناٹک میں ساتھ دے رہا تھا، بڑی گرمجوشی سے، لیکن پھر اس عورت نما مرد نے پرتگالی زبان میں مجھ سے اپنے اوپر پیشاب کرنے کے لیے کہا، اور جب میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہہ رہا ہے، تو اپنا عضو پکڑ کر اشارہ کرتے ہوئے بولا، 'یہ جو کہتا ہے کرو، اس پر پیشاب پھرو، اس سے یہ بھڑک اٹھتا ہے، اور تم ہو کہ کوئی پروا نہیں کر رہے، پیشاب پینے کے لیے کون کہہ رہا ہے؟ بس اس پر سنہری پھوار برسانے ہی کی تو بات ہے!' یہ بے حد کراہت انگیز تھا۔ پیشاب کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، میرا عضو ساتھ دینے پر بالکل راضی نہ تھا—— میں چلّایا اور کمرے سے نکل گیا۔ یہ برازیلی، بالکل دیوانے تھے۔ آخر میگیل نے انھیں کیوں دعوت دی تھی؟ معاف کرنا، لیکن ان باتوں کو تم سے بیان کر کے بڑا سکون مل رہا ہے... میں اتنا گر گیا ہوں۔ میں غلاظت کی پوٹ ہوں، بالکل بے قدر و قیمت، ذرہ برابر بھی تو عزتِ نفس باقی نہیں رہی۔ اس واردات کے بعد میں اپنے مراکشی دوست سے ملنے گیا، جانتی ہو نا، وہی جو ہمیشہ جانتا ہے کہ کیا کرنا

Scanned with CamScanner

چاہیے، محلے کا بڑا آدمی؟ اسے یہ سب بتانے کی میری ہمت نہ ہوئی، لیکن میری کسمپرسی اس پر عیاں تھی، تو اس نے مجھے پینے کے لیے کچھ دیا اور کچھ کش لگانے کے لیے۔ اس کے بعد کا حال مجھے بالکل یاد نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رات دس بجے پولیس والے مجھے فٹ پاتھ سے اٹھا کر لے گئے، وہ سمجھے کہ کسی روگ کی وجہ سے بے کلی محسوس کر رہا ہوں۔ ایک لحاظ سے ان کا اندازہ غلط نہیں تھا، لیکن یہ بڑا پرانا روگ ہے، بڑا بے پناہ روگ، اور ایک طویل مدت سے چلا آ رہا ہے، کوئی چیز جو جراحت پہنچاتی ہے، سوئیوں کی طرح میرے دل اور جگر میں چبھی جا رہی ہے، ایسا شدید درد کہ ابکائیاں آنے لگیں اور قے کرنے کو جی چاہے۔ پولیس والوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی کوشش کی لیکن میں غنودگی میں تھا؛ پھر ڈاکٹر نے آ کر انجکشن لگا دیا، جس سے میں تھوڑا سا ہوش میں آ گیا، لیکن میری حالت بہت خراب تھی، اتنی خراب کہ مر جانا چاہتا تھا، کسی بس کے نیچے خود کو پھینک دینا چاہتا تھا... بس اسی وقت انھوں نے تمھیں فون کیا۔ اور خوش قسمتی سے، تم مل گئیں، بڑی بہن!

''کیا میں یہاں سو سکتا ہوں؟''

کنزہ کو شدید دھچکا لگا: اس نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ایک دن اس کا چھوٹا بھائی اس سے ایسی باتیں کہے گا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے، کیا کرے، لیکن وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ عازل کی حالت واقعی بڑی ناگفتہ بہ ہے۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اٹھ کر بٹوا لینے گئی، اور کہا کہ وہ اسے اپنے یہاں غیر معین مدت کے لیے نہیں ٹھہرا سکتی۔ اسے سنجیدگی سے مراکش واپس لوٹ جانے کی بابت سوچنا ہوگا۔ عازل چیخنے اور کسی بچے کی طرح رونے لگا۔ کچھ بھی سہی، کنزہ کو کام پر جانا ہی تھا۔ اس نے عازل سے کہا کہ اگر کوئی فون آئے تو نہ اٹھائے اور سب سے بڑھ کر کچھ نیند کر لے۔

کنزہ نے ریڈ کراس کے دفتر سے میگیل کو فون کیا۔ وہ برونکائٹس کی وجہ سے بستر میں پڑا تھا۔ اسی نے عازل کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کی علالت کے باعث کنزہ نے اسے مضطرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''اس کا حال ٹھیک نہیں ہے، ہے نا؟'' میگیل نے خود ہی پوچھا۔ ''بدقسمتی سے یہ ہونا ہی تھا... تم جانو، میں خود کو کسی حد تک اس کا ذمے دار سمجھتا ہوں: میں سمجھے بیٹھا تھا کہ کم از کم اتنا بالغ ضرور ہے کہ جانتا ہوگا میرے ساتھ یہاں کیوں آ رہا ہے... لیکن مراکش سے نکلنے کی آرزو اس

Scanned with CamScanner

شدت سے سر پر سوار تھی کہ اس نے بالآخر اسے اندھا کر کے رکھ دیا، اور اس کے ہر کام کا ستیاناس کر ڈالا۔ میں اب اس سے ملنا نہیں چاہتا، وہ حد سے باہر نکل گیا تھا۔ میں نے کبھی تم سے اس کا ذکر نہیں کیا، لیکن اس نے میری کئی بیش قیمت آرٹ کی چیزیں چرالی تھیں اور اونے پونے بیچ ڈالی ہوں گی، اور پھر بدترین گھناؤنے آدمی کی طرح پیش آیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہمارے درمیان پیسہ کوئی مسئلہ نہیں تھا، لیکن وہ کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ مجھے ذلیل کرنا۔ ایک شام میرے دوستوں کی موجودگی میں اس کا رویہ قابلِ نفرت تھا، اس نے ان کی بے عزتی کی، شراب کی بوتل توڑ ڈالی، اور خواہ مخواہ جھگڑنے لگا۔ نہیں، کنزہ، میری کنزہ، میری دوست، میری پیاری بیوی، تمھارا ننھا منا بھیا اب درست نہیں ہونے والا، اور تمھارا کہنا ٹھیک ہے کہ واپس لوٹ جانے میں ہی اس کی بہتری ہے، اس کی کھوئی ہوئی حالت وہیں بحال ہوسکتی ہے۔ یہاں اسے ہر چیز بغیر انگلی اٹھائے ملی ہوئی تھی، اسے اندازہ نہیں کہ میں نے کتنی شدید محنت کی ہے، اور جس مقام پر آج ہوں اس تک پہنچنے کے لیے کتنے دکھ اٹھائے ہیں، لیکن، خیر، جب آدمی محبت میں گرفتار ہو تو اسے سامنے کی چیز بھی صاف نظر نہیں آتی، بس اپنے احساسات اور جذبات کے پیچھے بھاگتا ہے۔ میں عازل کا دیوانہ تھا، لیکن اسے کبھی مجھ سے محبت نہیں تھی، اور یوں سوانگ رچاتا گویا اس کے خیال میں مجھے معلوم نہ ہو کہ خالی خولی بن رہا ہے۔ لیکن، تم جانتی ہو، میں ٹھہرا پرلے درجے کا شاطر، کوئی مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتا! چلو، یہ دفتر بند کریں۔ یہ بتاؤ، اپنے بڈھے شوہر کے پاس کب آؤ گی؟ کب التفات کرو گی؟ اس پر یاد آیا، ابھی تک تمھیں بتایا نہیں ہے، لیکن مبارکباد! بعض باحیثیت لوگوں کی مداخلت سے تمھارا معاملہ طے ہوگیا ہے، اب تم اسپینی بن گئی ہو، یورپ کی شہری: وزارت سے اطلاع نامہ کل ہی پہنچا ہے۔ بس اب تمھیں اتنا ہی کرنا ہے کہ وہاں جا کر دستخط کرو اور دستاویز وصول کرلو جس کی بنیاد پر اس قرمزی رنگ پاسپورٹ کی درخواست دینے کی اجازت مل جائے گی جس پر سنہری لفظوں میں 'یوروپین یونین' کا ٹھپا لگا ہوتا ہے! اس کے بعد جب چاہو گی طلاق لے لیں گے — میں تمھاری پرستش کرتا ہوں، میری پیاری، تم بڑی باکمال عورت ہو!''

گھر لوٹتے ہوئے کنزہ راہ بدل کر پہلے میگیل سے ملنے گئی۔ لیکن جب صدر دروازے پر کارمن نے بتایا کہ میگیل گہری نیند سو رہا ہے تو کنزہ نے سر جھکا لیا اور اپنی راہ پر ہولی۔ پھر، یہ یاد

کر کے کہ اس شام وہ ریستوراں میں رقص پیش کرنے کا وعدہ کر چکی ہے، جلدی سے سیدھی وہیں چل دی تا کہ وقت پر پہنچ جائے۔ اسے اپنے ناظرین کے سامنے بے محابا رقص کرنے میں لطف آتا تھا، جسم کو اس طرح تھرکانے میں کہ یہ تھرکن شہوانیت اور خواب کا شاندار استعارہ معلوم ہوتی۔ اس شام کنزہ نے کئی بار رقص پیش کیا، اور اچھی خاصی رقم سمیٹ کر گھر لوٹی۔

# 29
# ناظم

ناظم باہر کنزہ کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ کچھ اعصاب زدہ اور فکر مند نظر آ رہا تھا۔ ہمیشہ بدترین کی توقع کرنا اس کی فطرت کا خاصہ تھا، شاید اسی لیے ہنوز جوان ہونے کے باوجود سر کے بال سفید ہونے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن آج رات وہ عزم کیے بیٹھا تھا کہ اپنی بے چینی پر قابو پا کر رہے گا۔ فکر مند ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی! بس کنزہ کسی لمحے پہنچنے والی ہوگی؛ وہ اسے اپنی آغوش میں لے لے گا اور کہیں لے جائے گا، کہیں بہت دور۔ اسے آزاد ہونے کا کتنا ارمان تھا، اپنے مہاجرتی کاغذات کے باقاعدہ ہو جانے اور تھوڑا سا پیسہ مل جانے کی کتنی آرزو تھی... اس کے بعد وہ کنزہ کو اپنا وطن اناطولیہ دکھانے لے جائے گا، اور اس کے گھنے جنگلوں سے بھرے پہاڑوں کے گستاخ حسن کا نظارہ کرائے گا۔ اسے اچانک اپنے گھر والوں اور دوستوں کا خیال آیا، جنھیں دو سال سے نہیں دیکھا تھا، جن کی کمی ہمیشہ محسوس ہوئی تھی لیکن اس کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا، یہ انھیں اپنے خیالوں سے دور انتظار کے برزخ میں معلق رکھنے کا مبہم سا طلسماتی انداز تھا۔ اسے کامل یقین تھا کہ کسی روز ان سے ضرور ملاقات ہوگی، ایک خاص طور پر شاندار دن، جب دل روشنی سے بھرا ہوگا، اور آنکھیں مسرت کے آنسوؤں سے چھلک رہی ہوں گی؛ اس واقعی غیر معمولی دن وہ بالآخر اپنی بازیافت کر لے گا، وہی آدمی بن جائے گا جو کبھی ہوا کرتا تھا۔ اُس دن اس کا بن باس یکبارگی یاد سے محو ہو جائے گا۔

آخر کار جب کنزہ سڑک کی انتہا پر نمودار ہوئی تو وہ اس کی طرف دوڑا اور بانہیں اس کے گرد

ڈال دیں۔ بتایا کہ وہ کتنا خوش ہے، کتنے دکھ سے اس کی کمی محسوس کرتا رہا ہے؛ اس نے کنزہ کے ہاتھوں کو بوسے دیے اور ایک اور ترکی نظم سنائی۔ لیکن کنزہ بڑے جھکندن کے عالم میں تھی: عازل اس کے یہاں سو رہا تھا، سو وہ ناظم کو وہاں نہیں لے جا سکتی تھی۔

''چلو کسی ہوٹل چلیں!'' ناظم نے تجویز پیش کی۔

کنزہ ہچکچائی۔ ''تمھاری جگہ کیوں نہ چلیں؟ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم رہتے کہاں ہو۔ ہوٹل تو خفیہ عاشقوں یا طوائفوں کے لیے موزوں ہوتے ہیں، اور سادیل کی بات دوسری تھی، وہاں ہم سیاحت کے لیے گئے ہوئے تھے۔''

''پتا ہے، میں چوہے کے بل میں رہتا ہوں،'' ناظم نے احتجاج کیا۔ ''تم بہتر جگہ کی مستحق ہو۔''

کنزہ نے اس سے انتظار کرنے کے لیے کہا تا کہ اپارٹمنٹ سے کل کے لیے ضروری چیزیں لے آئے۔ ناظم سڑک پر آگے پیچھے چکر لگاتا رہا اور بتدریج بے صبرا ہونے لگا۔ شاید عازل نے اسے مجھ سے تعلق رکھنے کا منع کر دیا ہو۔ شاید خود اسی نے ارادہ بدل دیا ہو۔ اپارٹمنٹ میں روشنی ہو گئی۔ آخرکار بڑے طویل بیس منٹ کے بعد کنزہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ ہوٹل میں ایک اور رات بسر کرنے کے خیال سے اسے جوش آ رہا تھا۔ راستے میں وہ ترکی اور عربی میں گنگنانے لگا:

تم میرا نشہ ہو
میں کبھی سیر ہو کر تمھیں نہیں پی سکا ہوں
میں سیر ہو کر تمھیں نہیں پی سکتا
میں یہ کبھی چاہ ہی نہیں سکتا

کنزہ کی ہنسی چھوٹ گئی، بے اختیار دل چاہا کہ ناظم ابھی یہیں پر اسے لے لے، لیکن یہ بھلا کہاں کیا جاتا ہے، اس پر تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، خاص طور پر جب اس کا اظہار عورت کر رہی ہو، اور وہ بھی ایک عرب عورت۔ لیکن کم از کم وہ سمجھ تو سکتا ہے — حالانکہ یہ بات کنزہ کی توجہ میں آنے سے نہ رہ سکی تھی کہ رقابت اور عورت پر ملکیت جتانے کے معاملے میں وہ کسی مراکشی مرد سے کم نہ تھا۔ اب دونوں ہاتھ تھامے چل رہے تھے، اور چلتے چلتے کنزہ نے اس سے سرگوشی میں کہا، ''مجھے تمھاری طلب ہے۔'' وہ رک گیا، مسکرایا، اور ایک دیوار کے سہارے کنزہ کی پشت ٹکا دی، اور بڑے جذباتی

انداز میں اسے چومنے لگا۔ راہ گزرنے والے انجان بن گئے جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔ ہوٹل پہنچ کر ناظم نے کمرے کا کرایہ پیشگی ادا کیا اور پانی کی بوتل کے لیے کہا۔ اس کے شب گزاری کے تھیلے میں عرق[16] کی بوتل تھی۔

چھوٹا، معمولی سا کمرہ تھا، اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سیلن کی بو بسی ہوئی تھی، قالین گھسا پٹا اور روشنی کچھ بے کیف سی تھی، لیکن ان کی شہوت اندھی تھی اور ناقابلِ مزاحمت۔ ناظم نے کہا کہ اس کے کہنے پر عمل کرے، پھر اس کی آنکھوں پر اپنی سیاہ ٹائی پٹی کی طرح باندھ دی اور اپنے انداز میں کمرے کا نقشہ بیان کرنے لگا۔

"کمرہ چھوٹا لیکن بڑا دلکش ہے: دیواریں ہلکی نارنجی رنگ کے ریشم سے ڈھکی ہیں اور ایک کونے میں کپڑوں کی پرانے وقتوں کی نایاب الماری کے برابر چرمی صوفہ رکھا ہے، کھڑکی کے پاس مستشرقی طرز کی کسی پینٹنگ کی بڑی خوبصورت نقل ٹنگی ہوئی ہے: پلنگ پوش نفیس کمخواب کا ہے اور فرش پر بڑا سا ایرانی قالین بچھا ہے۔ اور اب میں تمھارا لباس اتاروں گا، ٹھیک جس طرح کوئی ایک دلکش گلاب کی پنکھڑیاں ایک ایک کر کے جدا کرتا ہے — چاہے کچھ بھی کرو، بس ہلنا جلنا نہیں ... پہلے تمھاری جیکٹ اتار رہا ہوں، پھر بلاؤز، تمھارا اسکرٹ، تمھارے جوتے، اسٹاکنگز ... رکو، ذرا رکو، اپنی انگیا تو اتارنے دو ... لیکن یہ کیا؟ پینٹیز ندارد، تھونگ (thong)[17] تک نہیں! کیا غضب ہے! مارے شہوت کے بے قابو ہوا جا رہا ہوں! تم بے پناہ ہو، تمھیں پہلے سے علم تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں ... اور تم کس غضب کی حسین ہو ... ہماری محبت بڑی جاندار ہے اور تم ایک گوہرِ نایاب ہو، مجھ میں نہیں آتا کہ میں تمھارا مستحق کیسے ہو سکتا ہوں، تمھارے لائق کیسے بن سکتا ہوں، میں کس قدر خوش قسمت ہوں! میری چیخیں نکلی جا رہی ہیں!"

کنزہ نے اس تک پہنچنا چاہا لیکن وہ ہاتھ نہ آیا، اور وہ پکاری۔ دونوں خوش تھے۔ کنزہ کی آنکھوں پہ ابھی تک پٹی بندھی تھی، وہ اسی حالت میں ناظم کے ساتھ بستر پر آ گری اور دونوں بڑی دیر یا مباشرت میں مگن رہے۔

---

16۔ arrack یا arak: مشرق اور شرق اوسط میں مستعمل ایک بے رنگ کشید۔

17۔ thong: پٹی کی طرح کی بے حد پتلی اور مختصر ستر پوش یا زیر جامہ۔

بتیاں بجھی ہوئی اور پردے گرے ہوئے تھے: وہ خاموشی میں پو پھٹنے کا انتظار کرتے رہے۔
پھر، یکبارگی، آسمان پر سپیدی نمودار ہونے لگی۔

''دیکھو، میری حسینہ: یہ وہ وقت ہے جب گھوڑے خزاں کے رنگوں کی مالا پہنے آسمان سے نیچے اترتے ہیں اور بادلوں کے جسیم پہاڑ کے گرد قلانچیں مارتے ہیں۔ وہ اونٹ نظر آ رہا ہے نا، جو اطلس اور ریشم کے کپڑوں سے بھری الماری لادے چلا جا رہا ہے؟ وہ ان عاشقوں کی تلاش میں افق پار کر رہا ہے جن کا گزشتہ رات ملاپ ہوا تھا، سحر اپنی سپیدی بلند ترین درختوں کی چوٹیوں پر بکھیر رہی ہے، اور تم —— اور تم روشنی کے لمس جتنی خوبصورت ہو: تم یہاں ہو اور میں گیت گا رہا ہوں تا کہ تم اب پھر کبھی مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ اوہ کنزہ، اس دل آویز صبح کی خاطر، اس خواب کی خاطر جو سارے آسمان میں تموج پیدا کر رہا ہے، مجھ سے شادی کرو گی، میری بیوی بنو گی؟''

کنزہ نے پٹی آنکھوں سے ہٹا کر اسے دیکھا۔

''سچ مچ، شادی کرو گے؟''

''مجھے تم سے محبت ہے، تم جانتی ہو، جہاں سے آیا ہوں وہاں مرد کے لیے عورت سے اپنی محبت کا اعتراف کرنا مشکل ہوتا ہے، ایسی باتیں ان کہی چھوڑ دی جاتی ہیں، مشکل سے ان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، لیکن مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اناطولیہ میں نہیں بلکہ یہاں اسپین میں ہوں، اور ہم مختلف ہیں، اپنی تحریمات اور روایات کے پابند نہیں رہے، اور مجھے یقین ہے کہ اپنا اپنا ملک چھوڑنے کے باعث ہم آزاد ہیں کہ جو بننا چاہتے ہیں بنیں، ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ہمیں ٹوہ لینے والی نگاہوں اور سن گن لینے والے ہمسایوں اور منافقوں کے بے رحم فقروں کا خوف نہیں۔ اسپین ہمیں رہائی دلا رہا ہے، سو تم اور میں، مراکشی عورت اور ترک مرد، شادی کریں گے اور بھلا دیں گے کہ کہاں سے آئے ہیں۔''

''ارے، ارے، اتنی تیزی نہ دکھاؤ! آدمی یہ کبھی نہیں بھولتا کہ کہاں سے آیا ہے، وہ چاہے جہاں جائے، اس آگہی کو ساتھ لادے پھرتا ہے: اتنی آسانی سے اپنی جڑیں کاٹی نہیں جا سکتیں۔ لوگ اکثر اس مغالطے میں رہتے ہیں کہ اپنا اندازِ فکر ترک کر دیا ہے، لیکن یہ ترک کیے جانے کے خلاف مزاحمت کرتا ہے، اور میں جو کہہ رہی ہوں خوب جانتی ہوں! یہاں، ایک عرب عورت سے

اپنی روش بدلنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اور اگر نہیں بدلتی، تو اسے پیس کر رکھ دیا جاتا ہے، دھونس دی جاتی ہے، اس سے نفرت کی جاتی ہے۔ تم نہیں دیکھتے، سوال ہم سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ باقی رہے ہم دونوں — تو مجھے غور کرنے کی ضرورت ہے، اور بعض مسائل کو طے کرنا ہے۔ مجھے کچھ وقت دو۔ اور، جیسا کہ تم جانتے ہو، میں پہلے سے شادی شدہ ہوں . . . ''

جب وہ ہوٹل کے باہر ایک دوسرے سے رخصت ہوئے، کنزہ نے خود کو کچھ ڈانواڈول پایا۔ ''میں مسرت کی کتنی مشتاق ہوں،'' اس نے سوچا، ''اور ماضی کو بھول جانے کی؛ میں زندہ رہنے کی خواہشمند ہوں، بہت سے کام کرنے کی۔ اور اب مجھ سے فیصلہ کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔'' لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ناظم کی پیشکش کے بارے میں کیا سوچے۔ اس آدمی کے بارے میں وہ بمشکل ہی کچھ جانتی تھی۔ جب بھی اس سے ترکی میں اس کی زندگی کے بارے میں پوچھا، وہ ہمیشہ کنی کاٹ گیا۔ اس نے محتاط رہنا سیکھ لیا تھا۔ لیکن کم از کم اسے ایک بات کا ضرور یقین تھا: اس کے ساتھ سونا اچھا لگتا تھا۔ ہر بار جب وہ پیوست ہوتے، اس کا جسم ایک بالکل نئی لذت سے آشنا ہوتا۔ ظاہر ہے وہ اس کے لیے جذبات بھی رکھتی تھی، شاید اس کے لیے محبت بھی محسوس کرتی تھی، تاہم کچھ شک سا ابھی باقی تھا۔ یہ مہذب اور اتنا تعلیم یافتہ آدمی بارسیلونا میں کیا کر رہا تھا؟ اس نے اپنا ملک کیوں چھوڑا تھا؟ اس نے بتایا تھا کہ سیاسی مسائل کی وجہ سے، لیکن کنزہ کو کوئی ایسی بات مضطرب کر رہی تھی جو ٹھیک سے گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ چلتے چلتے اسے اس کا خیال آیا جو اس نے ابھی ابھی تجربہ کیا تھا: اپنی زندگی کی شاندار ترین رات۔ طنجہ میں ایک فرانسیسی عورت نے، جس پر زنا کرنے کا شبہ کیا جاتا تھا اور جسے اس کے مراکشی شوہر نے گھر سے باہر کر دیا تھا، ایک مرتبہ کہا تھا کہ چوری چھپے کی ملاقاتیں محبت کی سب سے بیش قیمت راتیں ہوتی ہیں، کیونکہ محبت اس وقت فزوں تر ہوتی ہے جب معمول کے خلاف جاتی ہے۔ تو پھر شادی کیوں کی جائے؟ اس لیے کہ تنہا نہ رہنا پڑے؟

کنزہ کو اپنے عزیز دوست میگیل سے بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

Scanned with CamScanner

# 30
# میگیل

میگیل سفید اون کا برنوس (burnoose) پہنے میز کے سامنے بیٹھا خط لکھ رہا تھا، چیکوں پر دستخط کر رہا تھا، اور چیزوں کو قرینے سے ترتیب دے رہا تھا۔ کنزہ نے پاس آکر اسے بوسہ دیا۔ کسی بے محابا جنسی محفل میں برازیلی ملکاؤں کے گھیرے میں اس شخص کو برہنہ تصور کرنا کس قدر مشکل تھا! کنزہ نے کبھی اس کی نجی زندگی کے بارے میں پوچھنے کی جسارت نہیں کی تھی۔

"تم عین موقعے سے پہنچی ہو! مجھے ابھی حال ہی میں ایک بیاض دریافت ہوئی ہے جس میں میرے والد کی ایک طرح کی یادداشتیں درج ہیں۔ مجھے بڑی حیرت انگیز چیزوں کا علم ہوا ہے، تمھیں ان کے بارے میں ضرور بتانا چاہیے — اس سے بھی بہتر، کیوں نہ مراکش کے بارے میں چند صفحے پڑھ کر سنا دوں۔

24 جون: 1951 ان دونوں رباط میں قیام ہے، 'فندق بالیما' کے ایک کمرے میں۔ ہمارے قونصل خانے نے اسی ہوٹل میں انتظام کیا ہے، تا آنکہ تحقیقات ختم نہیں ہو جاتیں۔

یہاں ہم دس جنے ہیں، دس اسپینی جو 22 جون کو طریفہ کی بندرگاہ پر ایک چھوٹی جسامت والی کشتی میں سوار ہوے۔ پرنٹر ہوزے، جسے اس لیے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا کہ اس نے یونین بنانے کی جسارت کی؛ اس کا بھائی پابلو، ایک صحافی جو پولیس کی نظر میں تھا؛ وکیل حوان، جسے اپنے پیشے پر عمل کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی؛ شاعر بالتھازار، جسے کوئی ناشر نہیں ملتا؛ طب کا طالبعلم اگناسیو، جس کی اپنے والدین سے کھٹ پٹ ہے؛ ایمبولینس گاڑی کا ڈرائیور پیدرو، مذہب پر کاربند یہودی جس پر سرکاری ستم ٹوٹے ہیں؛ کتاب فروش رامون، جس پر فرانکو کے حامی ناشر اور اخبار حملے کرتے رہتے ہیں؛ گارسیا، جو بارٹینڈر ہے؛ آندرے، ایک فرانسیسی ادیب جو اسپین میں رہ رہا ہے اور خود کو اسپینی کہتا ہے۔ ہم سب اشتراکی ہیں، فرانکو مخالف تشدد پسند، اور ہم سب جیل جا چکے ہیں۔ مجھے اب یاد

نہیں رہا کہ یہ کیسے ہوا، لیکن ایک دن ہوزے نے تجویز کیا کہ کیوں نہ ہم اسپین کو خیر باد کہیں اور مراکش جا کر رہیں اور ملازمت کریں۔ اس ملک کے شمالی اور انتہائی جنوبی علاقوں پر اسپین کا قبضہ ہے، بقیہ پر فرانس کا۔ اسپین میں ہماری جاسوسی کی جاتی، بات بات پر ہم سے شناختی کاغذات دکھانے کے لیے کہا جاتا؛ ہمیں ہر وقت گرفتار کیے جانے اور خدا جانے کس جرم کا الزام لگا دینے کا خوف لگا رہتا۔ پولیس اس قسم کے جال بچھانا خوب جانتی ہے؛ ہم تھانے پہنچتے تو پتا چلتا کہ ہماری فائلیں پہلے ہی سے قابلِ تعزیر حرکتوں اور ایسے ایسے الزامات سے بھری ہوئی ہیں جن کے ہم کبھی مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ ہمارے پاس پاسپورٹ نہیں تھے، نہ علاقہ چھوڑنے کے اجازت نامے۔ ہم ہمیشہ خفیہ طور پر ملتے لیکن اس طرح چھپنے چھپانے سے بیزار ہو گئے تھے۔ بارٹینڈری اختیار کرنے سے پہلے گارسیا کشتی ران ہوا کرتا تھا، اور اسی نے یہ کشتی ڈھونڈ نکالی تھی۔ یہ کام پہلے کسی نے نہیں کیا تھا: اسپین سے خفیہ طور پر مراکش کوچ کرنا۔ ہم اپنے بہت سے کامریڈوں کی طرح فرانس میں جلاوطنی اختیار کر سکتے تھے، لیکن ہم دسوں کو اِس ملک میں کشش محسوس ہوئی جہاں سورج سارا سال چمکتا ہے۔ مراکش افریقہ میں داخلے اور مہمات کا باب تھا۔ سو ہم 22 کو نکلے اور ساری رات اندھیرے میں باری باری چپو چلاتے رہے، لیکن رستہ کھو بیٹھے۔ گارسیا یہ بھول بھال گیا تھا کہ کھلے سمندر میں صحیح سمت کا تعین کیسے کیا جاتا ہے۔ ہم سلا (Salé) کے باہر جا پہنچے، جو رباط کے برابر ایک چھوٹا سا خوشنما شہر ہے۔ جب فرانسیسی پولیس نے ہمیں دھر لیا تو ہم بولے کہ ہم دوست ہیں، مچھلی پکڑنے نکلے تھے اور راستہ بھول گئے۔ انھوں نے ہمارا اعتبار کر لیا۔ اسی طرح اسپینی قونصل نے بھی۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ ہم اسپینی مراکشی تاریخ کے پہلے 'بوٹ پیپل' (boat people)[18] تھے۔

اس سے پہلے کہ قونصل کو حقیقتِ حال کا اندازہ ہو، ہم نے ہوٹل کو خیر باد کہا اور سارے ملک میں تتر بتر ہو گئے، خاص طور پر شمال میں۔ اگلے دن میں نے لُپیتی ماروکان (Le Petit

---

18۔ Boat People: یا 'کشتیوں والے' کی اصطلاح غیر قانونی مہاجرت کرنے والوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال 1970 کی دہائی میں اس وقت شروع ہوا جب ویت نام کے خلاف امریکہ کی جنگ کے خاتمے کے بعد ویت نام میں قائم ہونے والی کمیونسٹ حکومت کے زمانے میں وہاں کے کچھ شہریوں نے ٹوٹی پھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر دوسرے ملکوں کو فرار اختیار کیا اور بے پناہ دشواریوں کا سامنا کیا۔

Scanned with CamScanner

(Marocain) اور طنجہ سے نکلنے والے یومیہ اخبار اسبانیا (España) میں بھی یہ خبر پڑھی:
دس مہاجرت کرنے والے اسپینیوں کو، جو ڈوب جانے کے خطرے میں تھے، سلا سے تھوڑے فاصلے پر کشتی سے بچالیا گیا؛ یہ لوگ طبی دیکھ بھال کے بعد غائب ہو گئے اور ان کے گھر والے اور پولیس ان کی تلاش میں ہیں۔

26 جون: 1951 میں ریل گاڑی سے طنجہ پہنچا۔ عرباوہ (Arbaoua) پر ساحلی پولیس خاص دلچسپی سے مراکشی مسافروں کی چھان بین کر رہی تھی، چنانچہ میں حوان کے ساتھ زور زور سے اسپینی میں باتیں کرنے لگا۔ پولیس والے ہمارے پاس سے گزرے تو ہمیں سلام کیا؛ ایک نے تو سگریٹ بھی مانگی۔ حوان نے پورا پیکٹ تھما دیا۔ دس گھنٹے بعد طنجہ پہنچے تو اس شہر کی خوبصورتی پر جس سے سمندر ہم آغوش ہو رہا تھا، ہکا بکا رہ گئے۔ بسیتا (peseta) یہاں کا خاص سکہ تھا، اور گھما گھمی سے پُر اس بین الاقوامی شہر میں ہر کوئی ہماری زبان بول رہا تھا، جو ہمارے لیے بیک وقت سر چکرا دینے والی اور اتنی ہی روح افزا بات تھی۔ ہمیں یہاں لمبی لمبی، پر تعیش امریکی کاریں نظر آئیں، اور مجھے ایک گلابی رنگ کی کنورٹیبل کیڈیلیک بڑی اچھی طرح یاد ہے جسے بھڑکدار کپڑوں میں ملبوس ایک دبلا پتلا مرد چلا رہا تھا اور اس کے برابر میں ایک شاندار یورپی عورت بیٹھی سگریٹ پھونک رہی تھی، بالکل جس طرح اشتہاروں میں دکھایا جاتا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ نوجوان طنجہ کے ایک قدیم، انتہائی مالدار یہودی خاندان کا واحد سپوت ہے۔ اس کا نام موسیٰ تھا۔

ہفتے کے اندر اندر حوان کو ایک بڑی وکالتی فرم میں نوکری مل گئی جہاں عملے میں اسپینی، فرانسیسی، اور انگریز شامل تھے۔ 'ہوٹل المنزہ' کسی حساب کتاب رکھنے والے کی تلاش میں تھا، وہاں ملازمت کے دوران میری سیاست اور ادبی دنیا کے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ مجھے خاص طور پر ایک امریکی ادیب یاد ہے جو ہمیشہ نشے میں رہتا۔ افواہ کے مطابق ہر طرف جاسوس پھیلے ہوئے تھے؛ مجھے ایک بھی نظر نہیں آیا، گو ایک بارٹینڈر ایسا ضرور تھا جو پولیس کے لیے کام کرتا تھا — لیکن کون سا؟ کون سا ملک ہے جس کے اپنے جاسوس نہیں؟ ظاہر ہے اس نے ہر پیسے والے کو معلومات بیچ دی ہوں گی۔ مجھے اس پر مخبر ہونے کا اسی وقت شک ہو گیا تھا جب اس نے ایل کودیو [فرانکو] پر نکتہ چینی شروع کر دی تھی، مجھے اس سمت میں لے جانے کے لیے یہ ایک جانا بوجھا حربہ تھا، اور جب میں نے کہا کہ میں

سیاست سے دور رہتا ہوں، تو وہ اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے بڑے پر لطف آٹھ ماہ اس شہر میں گزارے۔ مجھے 'گرانڈ سوکو' بے حد مرغوب تھا جہاں دہقانی عورتیں اپنے پودے، پھل پھلواری، ترکاریاں، اور گائے کے دودھ کا پنیر بیچنے لاتی تھیں، اور اس دوسرے سوق، 'سوکو چیکو' سے بھی مجھے بہت رغبت تھی، جہاں لوگ چپ چاپ بیٹھے کیف سے لطف اندوز ہوتے تھے جو اُن دنوں غیر قانونی نہیں تھی — حتیٰ کہ نیلے رنگ کے ایسے اشتہاری بورڈ نصب تھے جن میں سگریٹ کے دھویں سے مراکش کے نقشے کے خطوط کھینچے گئے تھے، اور اس کے اوپر 'مراکشی تمباکو اور کیف کا سرکاری ادارہ' کی عبارت لکھی ہوتی۔ ہاں، بالکل، اس زمانے میں کھلے بندوں کیف کا استعمال کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے 'الجبل القدیم' کا علاقہ بھی بہت پسند تھا۔ نو آبادیاتی دور کی وِلائیں، رسمی استقبالیے، گھمنڈی انگریز لڑکیاں اور خوش شکل اسپینی عورتیں جو مہمانوں کی پذیرائی کرتیں۔ حوان ایک ایسی ہی پارٹی میں اسٹیفنی نام کی ایک فرانسیسی لڑکی کے دامِ الفت میں گرفتار ہو گیا جو اپنے چچا کے یہاں چھٹیاں گزارنے آئی ہوئی تھی۔ چچا داخلی آرائش کا کام کرتا تھا اور عورتوں سے سخت متنفر تھا۔ حوان اور اسٹیفنی نے فرانس جا کر شادی کر لی اور، جیسا کہ کہاوت ہے، ابدالآباد تک خوش و خرم رہے۔ مجھے ایک انگریز پینٹر اور اس کی بیوی یاد آتے ہیں؛ یہ مدینہ اور مراکشی زندگی کے مناظر کی تصویریں بناتا تھا۔ اور برٹش شاہی خاندان کا ایک فرد بھی وہاں ہوا کرتا تھا جو ایسی محفلوں اور لونڈوں کا بڑا شائق تھا اور لوگ جانتے ہوں تو اس کی بلا سے۔ انھیں دنوں ایک امریکی ادیب کا بھی چرچا تھا جو کئی برسوں سے ایک اَن پڑھ مراکشی لڑکے کے ساتھ وہاں رہ رہا تھا اور اس کی بیوی نے ایک دہقانی عورت کے ساتھ گھر بسا رکھا تھا۔ طنجہ ایک سرکس کی طرح تھا جس میں ان لوگوں کی بھرمار تھی جو معاشرے کے حاشیے پر زندگی گزارتے ہیں۔ میں اس منظر کو تنقیدی نظر سے دیکھتا تھا اور اس قسم کی مخلوق کے ساتھ میل جول نہیں رکھتا تھا۔

13 فروری: 1952 میں یہاں سے 'پاکہ' کمپنی کے جہاز پر رخصت ہوا اور مارسے (Marseilles) میں اترا جہاں ہماری پارٹی کے دوستوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور 'ساں شارل' کے اسٹیشن میں میرے لیے ملازمت کا بندوبست بھی کرا دیا۔ وہ کٹھن دن تھے۔ بہت سارے اسپینی مہاجرین تھے۔ ایک دن اطلاع ملی کہ میرے والد کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے، اور میں پہلی بار اسپین لوٹ آیا، سفر جعلی کاغذات کے ذریعے کیا۔ گھر پر بیوی، مرسیڈِس سے دوبارہ ملاپ ہوا، جو بڑی

محنت کر کے ہمارے دونوں بچوں کی پرورش کرتی رہی تھی: پندرہ سالہ میگیل، باغی لڑکا، اور اس کی جڑواں بہن مریا، فائق درجے کی طالبعلم۔ زندگی میرے آدرشوں سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئی: میں نے اپنے اصول تو نہ بدلے، نہ پارٹی سے غداری کی، ہاں یہ ضرور ہے کہ آہستہ آہستہ پارٹی سے دور ہو گیا، خاص کر ہنگری پر سوویت یونین حملے کے بعد۔

میں جون 1951 میں اُس چوری چھپے سمندر کے اس پار جانے کی واردات سنانا چاہتا تھا۔ ایک تاریخی، منفرد واقعہ۔

میگیل نے بیاض بند کر دی، آنکھیں ملیں، اور کنزہ کی طرف دیکھا۔

''بالکل ناقابلِ یقین! تم یقین کر سکتی ہو کہ 1951 میں بھی غیر قانونی پناہ گزیں موجود تھے، لیکن یہ آج کے 'بوٹ پیپل' کے مقابلے میں مخالف سمت میں جا رہے تھے؟ عجیب بات ہے، ہے نا؟ میرے والد نے اپنی زندگی کے اس دور کا کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا تھا۔ حیرت کی بات ہے نا؟''

کنزہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ تمام دوسرے لوگوں کی طرح، وہ بھی یہی سمجھے بیٹھی تھی کہ یہ جوکھمی سفر صرف مراکشیوں ہی کی ایجاد تھے۔

''میری جان، جانتی ہو، وہ اسپینی جو مراکش پر قابض ہوئے تھے بے حد غریب لوگ تھے، ان کے پاس فرانسیسیوں کے سے وسائل نہیں تھے۔ فرانکو نے اپنی فوج کے عناصر ریف سے بھرتی کیے تھے، اور پھر ہر اس چیز میں دلچسپی کھو بیٹھا جس نے ملک کی ترقی میں مدد پہنچائی ہوتی، اسے زندہ رکھا ہوتا۔ اس نے کوئی مناسب تعمیرات نہیں کیں، نہ بند بنائے، نہ سڑکیں تعمیر کیں؛ لے دے کر بس ایک اسپینی ہسپتال ضرور تھا جسے حقیقت میں چلانے والی راہبائیں تھیں۔ خیر، عجیب زمانہ تھا وہ بھی! اسی لیے تو مراکشیوں نے اسپینیوں کو کبھی حقیقی نوآبادکار نہیں سمجھا۔ اس کے باوجود بعض اسپینی خود کو مراکشیوں یا، جیسا کہ انھیں کہتے ہیں، 'لوس موروس' [موروں] سے افضل سمجھتے ہیں۔ چلو یہ قصہ ختم کریں: یہ بتاؤ، کیسی ہو؟''

کنزہ ناظم کی پیشکش کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ میگیل کے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی اور بہت تھکا ماندہ معلوم ہوتا تھا؛ شاید بیمار تھا۔ سو اس نے کسی بہتر موقعے کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ جانے کو تھی کہ میگیل نے بتایا کہ اس نے طلاق کی کارروائی شروع کرنے کے لیے اپنے

Scanned with CamScanner

وکیل سے کہہ دیا ہے۔

''طلاق دینے کے لیے تمھیں بس اتنا ہی کرنا ہے کہ گواہوں کے سامنے تین بار کہو، 'میں تمھیں طلاق دیتا ہوں'— اور معاملہ ختم شد۔ اس کے بعد عدول کی معرفت مجھے خط بھجواؤ، جو مجھے رسمی طور پر تمھارے فیصلے سے آگاہ کردیں گے۔ مراکش میں اسی طرح ہوتا ہے۔''

میگیل جانتا تھا کہ مراکشی شادی ایک عہد نامہ نہیں ہوتی بلکہ ایک فعل جسے مسلمانوں کے علاقے کے باہر کوئی قانونی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس نے بارسلونا کی بلدیہ میں اپنی شادی کا اندراج کرادیا تھا۔ اس کے باوجود کنزہ نے اپنی قانونی حیثیت سے کبھی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے میگیل کو بوسہ دیا۔

''جانتے ہو، میرا ترک دوست، ناظم ... وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''تمھارے بچے ہوں گے— میں باپ بنوں گا، یا نانا!''

''میں ابھی اس منزل میں نہیں پہنچی ہوں۔ مجھے اس میں کشش تو ضرور محسوس ہوتی ہے لیکن میں اس سے اچھی طرح واقف نہیں۔ کہہ نہیں سکتی کہ کتنا مخلص ہے۔ مجھے کچھ اندیشہ سا ہوتا ہے ... وہ پہلا ترک ہے جس سے میں کبھی ملی ہوں، شاید میں تعصب سے کام لے رہی ہوں۔''

''تم چاہتی ہو کہ اس کے بارے میں کچھ پوچھ تاچھ کروں؟''

''نہیں، نہیں، یہ زحمت نہ کرو۔''

''خیر، اس کا نام بتادو، اور اسپین میں اس کی آمد کی تاریخ۔''

''خفیہ طریقے سے یہاں آیا ہے، غیر قانونی ہے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر اس کے پاس کاغذات نہیں تو قانونی طور پر شادی نہیں کرسکتا۔''

'نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے شادی کرلیں، اس کے بعد اس کی صورتِ حال کو باضابطہ بنانے کی عرضی داخل کریں۔''

''جب تک ہماری طلاق طے نہیں ہوجاتی، تم دوسری شادی نہیں کرسکو گی۔ باقی رہا وہ، تو اگر وہ ضابطے کا کام کرنا چاہتا ہے تو پہلے اسے اپنے مسائل حل کرنے ہوں گے۔ یہ سب مجھے کچھ پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو؛ ہم بس ان باتوں پر غور ہی کررہے تھے، ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔''

Scanned with CamScanner

''کیا تمھیں اس سے محبت ہے؟''

''ہاں، میکیل۔''

''جلد بازی نہ کرو۔ کم از کم اتنا انتظار کرو کہ خود تمھاری حیثیت پوری طرح سے صاف ہو جائے۔ اس کے بعد وہی کرنا جو چاہتی ہو۔ مراکشی عورت اور ترک مرد! کیا زبردست جوڑ ہے۔ تمھارے بچے بڑے خوبصورت ہوں گے!''

# 31

## عازل

عازل 'بریو چینو'، بارسی لونا کے چائنا ٹاؤن، سے واقف تھا، سوائے معلوم تھا کہ یہ اب اسپینی محلہ نہیں رہا تھا۔ 'لاس رامبلاس' کے نیچے، جہاں ہندوستانی اور پاکستانی دکاندار اپنا دھندا کرتے تھے، تنگ سی گلیاں کبھی فاس کے مدینے جیسی لگتیں، کبھی نیپلز کے پرانے حصوں کی طرح۔ اس جگہ میں کوئی امتیاز بخش خصوصیت نہیں تھی۔ دیواریں نڈھال نڈھال سی۔ افسردہ لوگ اور دن دہاڑے گاہکوں کے انتظار میں بیٹھی ہوئی چند افریقی عورتیں محلے کا دلگیر ترین علاقہ تھیں، جس کا ایک حصہ بلدیہ نے سینما اور لائبریری تعمیر کرنے کے لیے لے لیا تھا۔ یہاں مراکشی منڈلاتے پھرتے، وقت گزاری کرتے؛ بعضے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے، دھوپ تاپتے، بعض دوسرے ہوا میں گہرے گہرے سانس لیتے۔ دیکھنے والے کو لگتا جیسے کسی نبی کی آمد کے منتظر ہیں۔ یہ لوگ بیشتر ایک فون کی دکان پر جمگھٹا لگاتے جس کا بڑا عجیب سا نام تھا، 'الانتصار'، یعنی 'فتح'۔ یہ کاریر سانت پاؤ پر ایک تنگ سی روکھی پھیکی جگہ تھی اور 'ماشاء اللہ' نامی مختصر سی ہیر ڈریسنگ سیلون اور ایک چھوٹی سی 'مسجد طارق بن زیاد' کے درمیان پھنسی ہوئی سی تھی۔

یہ دکان عازل کی جائے پناہ تھی۔ دوسروں کی طرح، وہ بھی یہاں فضول وقت گزاری کرتا؛ بس انتظار کرتا۔ ایک دن عباس نے کہا تھا، ''انتظار، یہ ہمارا نیا دھندا ہے!'' سو عازل یہیں تھا، بغیر بلے

جلے بیٹھا زمین کو گھورر ہا تھا، ہونٹوں میں دبی سگریٹ دھیمے دھیمے جلتی رہی۔ بہت خستہ حال نظر آرہا تھا، ہفتے بھر سے نہایا دھویا نہیں تھا۔ جب نائیجیریا کی عزّیہ نامی طوائف نے اسے اپنے ساتھ بھاگ چلنے کی دعوت دی، کہیں ہندوستان یا آسٹریلیا جا کر غائب ہو جانے کی، تو اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا اور پوچھا کہ اس نے آج صبح عباس کو کہیں دیکھا ہے۔ وہ 'الجیریا' نامی بار میں بیئر پینے کھسک لی۔

اچانک ایک نام اس کے ذہن میں ابھرا: سمیّہ! ''ساری دنیا میں اگر کوئی مجھے بچا سکتا ہے،'' اس نے سوچا، ''تو وہ سمیّہ ہی ہو سکتی ہے۔ صرف وہی میری مردہ روح میں دوبارہ جان ڈال سکتی ہے، اور میری مردانگی کی بازیافت میں مدد پہنچا سکتی ہے۔ اس سے ملنا ضروری ہے! عباس اس کا اتا پتا ضرور جانتا ہوگا۔ لیکن عباس خود کہاں ہے؟ کیا روپوش ہو گیا ہے؟ ان دنوں پولیس کے چھاپوں کی افواہیں سننے میں آرہی ہیں؛ شاید وہ ان کی آمد سے پہلے ہی روپوش ہو گیا ہو۔''

عازل سورج کی شعاع کے پیچھے پیچھے سڑک پر چلا جارہا تھا۔ ایک مراکشی پھیری والے کے پاس آ کر رک گیا جو انمل بے جوڑ چیزیں بیچ رہا تھا: استعمال شدہ جوتوں کی جوڑی، ٹوٹا پھوٹا ٹیلیفون، ایک ڈوئی، پلاسٹک کی چند راکھ دانیاں، تین گندی سندی ٹائیاں، ایک ملٹری خود، سِوِل [اشبیلیہ] کی ٹیلیفون ڈائریکٹری، بارسلونا کا نقشہ، لیمپ شیڈ، چند بلب (جو شاید جل جلا چکے تھے)، کوٹ ٹانگنے کے چار عدد ہینگر (جن میں سے ایک لکڑی کا تھا)، اور ایک تہہ کی ہوئی چادر۔ دونوں آدمیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مسکرائے، پھر مصافحہ کیا۔

عازل کو توقع تھی کہ عباس 'باریوگوتکو' کے بورڈنگ ہاؤس میں مل جائے گا۔ وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا، اسے رہ رہ کر سمیّہ کا خیال آرہا تھا، وہ اسے دیکھ رہا تھا، اس کی بو باس کو یاد کر رہا تھا؛ اس کی آنچ کا ایک دزدیدہ کوندا عازل کے پیڑو میں سرسرا گیا: ''بس، یہی تو ہے، وہ ہر چیز درست کر دے گی، اسے میرے جسم کو گرمی سے غرقاب کرنے کا گُر آتا ہے، اور اس کی بڑی بڑی چھاتیاں لاجواب ہیں، وہ انھیں اچھی طرح استعمال کرنا جانتی ہے، ہاں بالکل یہی، چھاتیاں ہی کافی ہوں گی، پہلی مرتبہ کی طرح، جب اس نے اصرار کیا تھا کہ میں ان کے درمیان فارغ ہوں۔ اسے میری کمزوری کا پتا ہے — لیکن کیا وہ اب بھی بارسلونا میں ہی ہے؟'' اس نے کئی بار اس سے مراکش لوٹ کر اپنا ہیئر ڈریسنگ سیلون کھولنے کے ارادے کا اظہار کیا تھا... شاید عباس کچھ بتا سکے... عباس کو سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

چند مراکشی 'کاریر دیل بیسی' پر ایک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے، اور کچھ ایسے زاویے سے کہ لگتا تھا جیسے گھر کو ڈھینے سے بچانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ایک پاکستانی ایکریلک کے گلوبند بیچ رہا تھا۔ وہ کہتا کچھ نہیں تھا، بس کسی گاہک کا انتظار کرتا رہتا اور لپک کر ایک بھڑکدار رنگوں کا گلوبند اس کے گلے کے گرد لپیٹ دیتا۔

عباس کی اقامت جس بورڈنگ ہاؤس میں تھی اسے لاطینی امریکہ کے کچھ لوگ چلا رہے تھے۔ عباس ابھی تک پڑا سو رہا تھا۔ عازل نے اسے اٹھا دیا، کھینچ کر بستر سے نکالا اور 'لاس رامبلاس' کے قہوہ خانے میں گھسیٹ لایا۔

''ان دنوں چھپا ہوا ہوں،'' عباس نے اعتراف کیا۔ ''مجھے خفیہ اطلاع ملی کہ چند عرب افغانستان سے اسلام آباد کے راستے آئے ہیں۔ پولیس کے چھاپوں کا اندیشہ لگا ہوا ہے — تم جانو، بے اصولے قاتلوں کی جانب سے، وہی جنھیں یہ افغان کہتے ہیں، فینیٹکس جن کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں۔ سو پولیس والوں نے جال پھیلا رکھا ہے اور بے تحاشا موروں کو پکڑ رہے ہیں۔ خیر، یہ بتاؤ، تمھارا کیا حال ہے؟''

''اسپین کو رخصت کہہ آیا ہوں۔ مردوں کی لینا — یہ میرے بس کا نہیں۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے! یہ تم مجھے پہلے بھی بتا چکے ہو، لیکن پھر استادگی کیسے پیدا کرتے تھے؟''

''وہ میرے سامنے چوتڑ نکال کر جھک جاتا تھا، میں آنکھیں بند کر کے سہام یا سمیّہ کا تصور کرنے لگتا، اور مجھے کہنا پڑے گا وہ اس معاملے میں ان دونوں سے بہتر تھا۔''

''اوہ، سمیّہ...''

''کہاں ہے؟ میں اسے تلاش کر رہا تھا، مجھے اس کی ضرورت ہے۔''

''بہتر ہوگا اسے بھول جاؤ، اسے وہ بیماری لگ گئی ہے جس کا علاج نہیں ہو سکتا، بیچاری؛ منشیات استعمال کرنے لگی تھی، بات بڑھتی گئی، اب یہ حال ہے کہ دیکھو گے تو پہچان بھی نہ سکو گے، بالکل مریل ہو گئی ہے، چھاتیاں جیسے خالی تھیلے، آنکھیں پتھرائی ہوئی... طبی امداد حاصل کرنے کے لائق نہیں، پھر یہ ڈر بھی لگا ہوا ہے کہ کہیں واپس گھر نہ بھیج دیں۔ تم اس سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟''

''کوئی خاص وجہ نہیں، بس صاحب سلامت کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ بھلائی سے

Scanned with CamScanner

پیش آتی تھی۔''

''اگر چاہو تو کل اس سے ملوانے لے چلوں گا، لیکن کوئی گڑ بڑ نہ کرنا، اسے اس کے حال پر چھوڑنا ہوگا، وہ بے حد بیمار ہے، بیچاری لڑکی۔ ایک تباہ حال میکسیکن عورت کے ساتھ کمرہ شریک ہے۔''

حسین سمیّہ، اتنی زندہ دل اور رسیلی، اب ایک دھندلا سا سایہ بن کر رہ گئی تھی، چہرہ تھا کہ جھریوں میں ڈھے گیا تھا، آنکھیں کسی تاثر سے عاری، جسم بھوک اور بیماری کی تکلیفوں سے پامال۔ وہ سو رہی تھی... یا شاید کوما میں تھی۔ عازل کی آنکھیں چھلک اٹھیں، اس سے دیکھا نہ گیا اور رخ پھیر لیا۔ وہ بولایا ہوا تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا، اسے بچانا، اگر بن پڑے تو؛ عباس نے کہا کہ وقت کبھی کا نکل چکا ہے۔

عازل کو اپنی جان پہچان کا ایک فرانسیسی ڈاکٹر یاد آیا جو بارسلونا میں میکیل کا دوست تھا۔ وہ اس سے مدد کی درخواست کر سکتا تھا۔ اس کا نام بھول جانا ناممکن تھا: 'گبریئل لمارویو یعنی 'شاندار گبریئل'۔ یہ اس کا واقعی نام تھا۔ مستغانم، الجزائر، کا پیے نوار (Pied-Noir)[19] تھا اور سابقہ فرانسیسی نو آبادکاروں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ شائستہ، بذلہ سنج، از حد رحم دل، وہ دوسروں کی خدمت کرنے کا دلدادہ تھا اور دوستی کا شدید احساس رکھنے کے باوجود بنی آدم کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ وہ کم سے کم کام کرتا اور مردوں سے اپنے متعدد تلاطم خیز معاشقوں کو فوقیت دیتا۔ حساس اور ذکی، گبریئل ایک ماہر پیشہ ور سے کچھ زیادہ ہی تھا، کیونکہ اس میں دوسروں کی خدمت کرنے کا حقیقی جذبہ تھا۔ لوگ کہتے کہ اسے ''اپنے پڑوسی سے محبت ہے''؛ بعض لوگ اس پر ہنستے، بعض دوسرے اسے کاٹ دار طنز کا ہدف بناتے، لیکن اس کا سب پر اتفاق تھا کہ اسے دوسروں کی نگاہیں پڑھ لینے کا ملکہ حاصل تھا، اور جہاں اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہوتی وہاں موجود ہونے کا۔ عازل کی اس سے ملاقات طنجہ میں میکیل کی ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ بارسلونا کی ٹیلیفون ڈائریکٹری سے عازل کو اس کا پتا آسانی سے مل گیا۔

---

19۔ Pied-Noir (سیاہ پا): اصطلاحاً آزادی سے پہلے کے الجزائر میں اقامت گزیں مختلف الاصل فرانسیسی شہریوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

جب وہ گبرئیل کے دفتر پہنچا، تو وہاں جو معلوم ہوا وہ عازل کے سان وگمان میں بھی نہ تھا۔

# 32

## گبرئیل

بلاشک گبرئیل ہی وہ شخص تھا جو میکیل کو اوروں کے مقابلے میں بہتر جانتا تھا۔ اگر چہ دونوں کی ملاقات شاذ و نادر ہی ہوتی، لیکن انھوں نے رابطہ قائم رکھا تھا۔ گبرئیل کو اس کے بارے میں بعض باتوں کا علم تھا لیکن ان پر گفتگو کرنے سے محترز رہتا۔ تاہم جب اُس صبح عازل اس کے دفتر جا پہنچا تو اس نے کچھ انتظار کرنے کے لیے کہا اور یہ کہ کسی صورت میں وہاں سے ٹلے نہیں، کیونکہ اسے کچھ بتانا ہے۔

"عازل، تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا تمھیں کہاں تلاش کروں۔ خیر، پہلے یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟"

عازل نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد سمیتہ کی ناگفتہ بہ صورتِ حال کا ذکر کیا، اور گبرئیل نے اسے فوراً اطمینان دلایا۔ اتفاق سے وہ خود چند دن پہلے اس سے ملنے آچکی تھی: وہ جگر کے شدید ورم کا شکار تھی، اور کچھ نہیں۔ دوائیں استعمال کر رہی تھی جو جلد اسے بحال کر دیں گی۔

"لیکن میں نے خود اسے دیکھا ہے! بڑی سخت بیمار ہے!"

"فکر نہ کرو، ٹھیک ہو جائے گی۔ چند 'مراکشی' حربے استعمال کر کے میں نے اسے ایک کلینک میں داخل کرا دیا ہے جسے ریڈ کراس چلاتا ہے۔ اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے، اور سب سے بڑھ کر، صاف ستھری زندگی گزارنے کی، بیچاری — اسے بیچارگی میں تن تنہا چھوڑ دیا گیا ہے، پھر اس نے بھی اپنی حالت بد سے بدتر ہو جانے دی ہے۔ میں نے اس سے یہاں تک کہا کہ سب سے پہلے بہتر ہوگا کہ نہا دھو لے۔ اسے دیکھتے تو معلوم ہوتا جیسے موت کے دروازے پر کھڑی ہے۔"

تھوڑے سے توقف کے بعد گبرئیل نے اضافہ کیا، "جانتے ہو، تم نے میکیل کو بہت تکلیف پہنچائی ہے۔"

Scanned with CamScanner

''اوہ، چلو بھی، اتنے ڈرامائی ہونے کی ضرورت نہیں: میں نے اس کی چند آرائشی چیزیں ہی تو لی تھیں، مجھے قرضہ چکانا تھا، اور بس۔ اس میں شک نہیں کہ میکیل نے میرے گھر والوں کے ساتھ بڑی دریادلی کا سلوک کیا ہے، لیکن خود میرا سب کچھ ہاتھ سے جاتا رہا ہے، میں تباہ و برباد ہو گیا ہوں۔ رحم کا مستحق تو میں ہوں، وہ نہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے، لیکن کم از کم جو بتانے والا ہوں وہ پہلے سن تو لو۔ میکیل وہ نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو۔ وہ خود ساختہ آدمی ہے، لیکن ایک طرح سے اس نے بھی وہی راستہ اختیار کیا تھا جو تم نے کیا ہے۔ وہ جس گھر میں پیدا ہوا تھا وہ نادار لوگ تھے۔ اس کے باپ کو مراکش اور بعد میں فرانس جانا پڑا جہاں مارسے کی بندرگاہ میں محنت مزدوری کی۔ اس کی ماں ایک اقامتی محلے میں چوکیداری کا کام کرتی تھی، اور بقا کی خاطر اپنے بچوں کو بہبودِ اطفال کے ادارے کے حوالے کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی۔ تمھاری سی عمر میں میکیل کی حالت آج تمھاری حالت سے کہیں زیادہ بری تھی۔ اپنی جان بچانے کی خاطر وہ جس قدر جلد ممکن ہو سکا اسپین سے کوچ کر گیا۔ اس کے لیے، بالکل تمھاری طرح، اسے بھی ایک آدمی کا پیچھا کرنا پڑا، جو کوئی متمول اور بااثر انگریز لارڈ تھا، سخت گیر اور بڑا پیچیدہ آدمی۔ کیونکہ میکیل بے حد خوش شکل تھا، لارڈ نے اسے اپنے زیرِ سایہ لے لیا اور لندن لوٹنے پر اپنے گھروں میں سے ایک میں بسا دیا۔ میکیل اس کا لَور تھا، اس کا جاںنثار غلام، خدمتگار اور چاکر۔ یہی نہیں، اکثر اسے لارڈ کی ایما پر اس کی بہن کے ساتھ بھی سونا پڑتا تھا، ایک کھوسٹ عورت جس کا کوئی طلبگار نہیں تھا۔ تمھارے برخلاف، میکیل کے اسپین میں مردوں سے تعلقات رہ چکے تھے: اسے یہ بھاتا تھا اور یہ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا، ہر چند کہ اس زمانے میں معاشرہ ایسے معاملات کو سخت ناگواری سے دیکھتا تھا۔ میکیل اپنے آقا کی عجز و انکسار سے تعمیل کرتا اور اسے آسودہ بھی، اس توقع میں کہ ایک نہ ایک دن اسے اپنی خدمت گذاری کا انعام ملے گا۔ سوکم آمیز اور فہیم میکیل نے ان چند موقعوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جب وہ کچھ بھی مانگتا، آقا دینے سے انکار نہ کرتا۔ میکیل صرف یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح مفلوک الحالی اور غربت سے ہمیشہ کے لیے گلو خلاصی ہو جائے۔ چنانچہ وہ چیز جس سے جدا ہونا آقا کے لیے بے حد باعثِ اکراہ تھا، وہ میکیل نے آقا کی بہن کو استعمال کر کے حاصل کر لی، اور یہ پکاسو کی بنائی ہوئی میکیل کی مرغوب ترین پینٹنگ تھی۔ اس کھیل کو آخر تک کھیلنا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے جیتنا بھی بڑی قوت

کا متقاضی تھا، میں تمھیں بتاتا ہوں، اس کے لیے ناقابلِ یقین دم خم کی ضرورت تھی۔ الغرض، جب لارڈ کا انتقال ہوا تو وہ اپنی وسیع ملکیت میگیل کے نام کر گیا۔ بہن نے وصیت نامے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا، حتیٰ کہ یہ افواہ بھی اڑا دی کہ میگیل نے اس کے بھائی کو زہر دیا ہے، لیکن عدالت نے فیصلہ میگیل کے حق میں کیا۔ اس کے بعد وہ طنجہ چلا آیا، جہاں بڑا شاندار گھر خریدا۔ مالاگا کے ایک فارم پر اپنے والدین کی رہائش کا انتظام کر دیا اور اپنی زندگی میں بھی کچھ باقاعدگی لانے کا بندوبست کیا، جس کی ابتدا اپنا نام بدلنے سے کی۔ بہن کو ملازمت دلوائی اور اس کے لیے شوہر ڈھونڈ نکالا۔ اسپین کے شاہی خاندان سے گفت وشنید کا آغاز کیا، اور لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ملکہ اسے پسند کرنے لگی تھی، جس سے کچھ دروازے اس کے لیے کھل گئے۔ میگیل کو نمود اور جگمگانے کی خواہش تھی، بڑی بڑی پرتکلف ضیافتیں کرنے کی، پیسہ لنڈھانے کی، اور ان لوگوں کے لیے جن کی محبت میں گرفتار ہو جاتا سب کچھ کرنے کی۔ سو، عازل، یوں سمجھو کہ تمھارے ساتھ وہ اپنی جوانی کے ایک حصے کو دوبارہ جی رہا تھا، اور تم نے اسے بڑی بری طرح مایوس کیا۔"

عازل دنگ رہ گیا۔ وہ یہ سوچنے سے باز نہ رہ سکا کہ مرتے وقت میگیل اس کے لیے کیا کچھ چھوڑ جائے گا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ جا کر معافی مانگے، پھر سے اس کا منظورِ نظر بن جائے اور اسے چپکے سے وہ مشہورِ زمانہ تکیہ کھلا دے جو حرکتِ قلب بند کر دیتی ہے اور پیچھے کوئی نشان بھی نہیں چھوڑ جاتی۔۔۔

گبریئل کے اطمینان دلانے اور سمیّہ کے بارے میں کم فکرمند ہونے کے بعد، عازل نے اپنی مصیبتوں کا سوچا۔ وہ گبریئل کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونے ہی والا تھا کہ سر جھکا لیا اور اعصابی انداز میں ہکلا ہکلا کر بولا، "سنو، میرا عضوِ ایستادہ نہیں ہوتا!"

"تو پھر؟ یہ بھی کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے ٹائر پنکچ جائے۔ جلد یا بدیر بھی مرد اس مرحلے سے گزرتے ہیں، یہ کوئی اہم بات نہیں، پریشان نہ ہو۔"

"یہ جسمانی معاملہ نہیں ہے۔ سارا فتور میرے سر کا ہے، ماؤف ہو گیا ہوں، ساری خود اعتمادی رفوچکر ہو گئی ہے۔ میرا اپٹرا ہو گیا ہے، اتنی شرم آتی ہے۔۔۔"

"ایسا ہے تو اگلے ہفتے مجھے فون کرنا، پھر ہم اس کے بارے میں سنجیدگی سے بات کریں گے۔"

Scanned with CamScanner

# 33

## فلوبئیر

اسے حیرت انگیز اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ ایک ٹھٹھری ہوئی صبح عازل اور فلوبئیر کی پارک کی بنچ پر مڈبھیڑ ہوگئی۔ عازل سگریٹ پی رہا تھا، فلوبئیر نہیں۔

''ارے او! تمھارا سگریٹ پینے کا انداز بڑا قاتل ہے!''

''قاتل — یعنی؟''

''تم دھویں کو پوری طاقت سے اندر کھینچ رہے ہوتا کہ سارا قیر پھیپھڑوں میں جذب ہو جائے۔۔۔ ر۔ر۔رت۔رتی رتی۔ تم خود کو فنا کرنے کے درپے ہو۔ خیر، میری بلا سے، لیکن جیسا کہ پیچھے میرے وطن کامیرون میں کہا جاتا ہے — یا بلکہ ٹھیک کہیں تو، بانگانتی کے علاقے بِدہ میں — تمھیں 'سرد ماتم' کا خوف ہے۔'' [یعنی کوئی تمھارے مرنے کا ماتم کرنے نہیں آئے گا۔]

عازل اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا، اور اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''تم بڑے عجیب آدمی ہو! مجھے وعظ کرنے تمھیں کس نے بھیجا ہے؟ میری ماں نے، بہن یا میرے کسی محسن نے؟''

''کسی نے نہیں، میں تو بس یہاں سے گزر رہا تھا۔ آندرے ماری کی تلاش میں، ایک رشتے دار جسے گھر والے بہت ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، ایک 'ٹون ٹائن' (Tontine)[20] کا چکر ہے۔ آندرے مری ایک دراز قامت سیاہ فام آدمی ہے، میرے خیال میں چھ فٹ سے اوپر ہی ہوگا، ایک دن وہ اس عزم کے ساتھ رخصت ہوا کہ یورپ جا کر کام تلاش کرے گا، موریتانیا کی سرحد سے

---

20۔ Tontine: سرمایہ کاری کی ایک اسکیم جس میں سرمایہ لگانے والوں کی رقم ان کی وفات تک بڑھتی رہتی ہے اور ان کے بعد پوری کی پوری ان کے وارثوں کو دے دی جاتی ہے، یا کسی مقررہ تاریخ تک جس کے بعد باقی ماندہ ورثا کل سرمائے کے حقدار ہو جاتے ہیں [اسکیم کے مخترع نیپلز کے باشندے Lorenzo Tonti کے نام سے منسوب]۔ دیکھیے اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، مرتب ومترجم، شان الحق حقی (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 2003)، صفحہ 1848۔

Scanned with CamScanner

ہوتا ہوا مراکش میں داخل ہوا، چند ماہ طنجہ میں گزارے — جہاں بڑا کٹھن وقت گزرا — پھر سمندر عبور کیا۔ کم از کم اس پیغام میں تو وہ اسی کا مدعی ہے جو طن لوٹتے ہوئے ایک رشتے کے بھائی کی معرفت بھجوایا تھا۔"

"سمجھا، انھی افریقیوں میں سے ایک جو اتنے تنگدست ہیں کہ طنجہ کی ساری بلّیاں چٹ کیے جا رہے ہیں! لوگ کہتے ہیں کہ انھی کی وجہ سے بندرگاہ کے آس پاس کے محلوں میں چوہے پھر سے نکل آئے ہیں۔ اور تم، تم کہاں کے ہو؟"

میں ایک فرانسیسی جرمن این جی او میں کام کرتا ہوں۔ تولوز (Toulouse) میں تھا جب گھر والوں نے فون کیا اور کہا کہ اسے تلاش کروں، بولے کہ وہ بارسلونا میں مل جائے گا، افریقی محلے میں۔ سو میں نے ریل گاڑی پکڑی اور اب یہاں آندرے ماری کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ تمھیں تو اس کا پتا و تا نہیں ہوگا؟ لمبا تڑنگا چھ فٹا، فوراً پہچانا جاتا ہے!"

"نہیں، میں کسی افریقی سے واقف نہیں۔ ارے ہاں، عزّیہ کو جانتا ہوں، نائیجیریا کی طوائف۔"

"عزّیہ — یہ کوئی افریقی نام نہیں!"

"ٹھیک کہتے ہو! مراکشیوں نے اس کا یہ نام رکھ دیا ہے۔ میں جہاں سے آیا ہوں، وہاں کالوں کو اکثر 'عزّی' کہا جاتا ہے، ایک طرح سے بڑا قبیح نام ہے، اور کبھی 'عبد'، یعنی غلام۔ خیر، اسے چھوڑو اور یہ بتاؤ یہ 'سرد ماتم' اور 'ٹون ٹائن' کیا بلا ہے؟"

"وطن، یعنی بامیلیکہ (Bamileke) کے ملک میں، یہ ہمارا فرض ہوتا ہے کہ قول نبھائیں اور خاندانی عزت پر آنچ نہ آنے دیں۔ ایک بامیلیکی کے لیے سب سے زیادہ باعثِ شرم یہ ہے کہ لوگ ماتم کے لیے نہیں آئیں گے، سمجھے، تجہیز و تکفین کے لیے۔ اگر تم قول پورا نہیں کرتے، تو خاندان اور قبیلے کے رکن نہیں رہتے۔ 'سرد ماتم' سے مراد یہ ہے کہ لوگ تجہیز و تکفین کے لیے آتے تو ہیں، لیکن نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، اور زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے۔"

"لوگ آئیں نہ آئیں، مرے ہوئے کو اس کی کیا پروا۔"

"ایسا نہیں ہے — کیونکہ ہمارے نزدیک مرے ہوئے کبھی مرتے نہیں؛ بس اپنی حیثیت بدل لیتے ہیں اور ہمارے آبا و اجداد بن جاتے ہیں جن سے ہم مشکل کے وقت مشورے کے لیے

Scanned with CamScanner

رجوع کرتے ہیں۔''

''اور ٹون ٹائن' — یہ کیا ہے؟''

''ایک طرح کا 'کریڈٹ' کا نظام ہے۔ کچھ لوگ چھوٹی سی جماعت بنا لیتے ہیں اور ہر فرد ماہ بماہ ایک مقررہ رقم مشترکہ فنڈ میں ادا کرتا ہے، پھر باری باری ہر فرد کریڈٹ پر پوری رقم استعمال کرسکتا ہے۔ رقم عاریتاً دی جاتی ہے، نہ کوئی دستاویز ہوتی ہے نہ دستخط، کچھ بھی نہیں، بس وعدہ۔ اگر جماعت کا کوئی فرد قرض واپس نہیں کرتا تو اس کے پورے خاندان کا وقار خطرے میں پڑ جاتا ہے، چنانچہ اس کے کسی بھائی یا بہن پر عائد ہوتا ہے کہ قرض چکائے اور خاندان کے نام پر جو بٹا لگا ہے اسے دور کرے۔ میں آندرے ماری کو ڈھونڈنے اس لیے نکلا ہوں کہ اس نے فرانس جا کر ملازمت کرنے کے لیے قرض لیا تھا، پھر ادا کیے بغیر غائب ہو گیا۔ اس کا باپ مرا نہیں ہے لیکن بیمار ہے، اور اسے یہ فکر لاحق ہے کہ بیٹے کے کرتوت کے باعث اس کا ماتم سرد ہوگا۔ انھوں نے مجھے فون کیا کہ وقت آنے سے پہلے اس مشکل کا تدارک کروں۔ میرے پاس اس مسئلے کو یکسو کرنے کے لیے دو یا تین ہفتے ہیں۔ ورنہ اچھا خاصا المیہ کھڑا ہو جائے گا: وہ پھر کبھی نہ کہہ سکے گا کہ بِدہ کا ہے۔''

''بِدہ تمھارے گاؤں کا نام ہے؟''

''گاؤں سے کچھ زیادہ ہی ہے؛ ملک کی طرح ہے، اور اس کا مطلب ہے 'شرافت'، 'وقار'، 'شائستگی'۔''

عازل سمجھا، وہ مذاق کر رہا ہے۔

''ان تمام روایتی اقدار کے ہوتے ہوئے،'' اس نے پوچھا، ''تمھیں وہاں سے رخصت ہونے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ان تمام افریقیوں کو طنجہ کی سڑکوں پر بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح مارے مارے پھرتے دیکھ کر میرا دل جلتا ہے۔ یہ بڑے نرم خو ہوتے ہیں، بالکل برے نہیں، نہ انداز جارحانہ ہوتا ہے؛ یہ بھیک مانگتے ہیں، قبرستانوں کی صفائی ستھرائی کرتے ہیں، اور ذرا سی اجرت کے لیے حقیر سے حقیر کام کرتے ہیں۔ چند سڑکوں کے کنارے، خاص طور پر سبتہ کے آس پاس، کھڑے ہو جاتے ہیں اور ڈرائیوروں کو آواز دیتے ہیں اور پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بھوکے ہیں۔ یہ واقعی بڑا دلگیر منظر ہوتا ہے۔ کیا چیز ہے جو انھیں سڑکوں پر نکلنے پر مجبور کرتی ہے؟''

Scanned with CamScanner

''ہم رخصت ضرور ہوتے ہیں، لیکن ہمیشہ لوٹ آنے کے لیے۔ ہم اپنے گھر والوں کی خاطر زندہ رہتے ہیں، کیونکہ ہر فرد خود کو ان کا ذمے دار محسوس کرتا ہے۔ چلو تمھیں اپولینیر کا بتاتا ہوں — فرانسیسی شاعر نہیں، بلکہ میرا رشتے کا بھائی، جوان دنوں سامان کی نقل وحمل کا دھندا کرتا ہے۔ چند سال پہلے اچانک اس کا باپ مر گیا، تون ٹائن کا قرضہ چکانے سے پہلے جو گھر والوں پر واجب الادا تھا۔ اس کا ماتم کہیں زیادہ سرد ثابت ہوا: مرحوم کی عزت افزائی کے لیے کوئی بھی تو نہیں آیا، یہ بڑا ویران ماتم تھا، نہایت پھیکا سیٹھا اور کرب انگیز۔ سو اپولینیر نے فرانس مہاجرت کا فیصلہ کیا تاکہ وہ پیسہ بنالے جس کے لیے باپ کو مہلت نہ مل سکی تھی۔ اپولینیر چوری چھپے فرانس میں داخل ہوا اور پرانی کاریں بیچنے کا کام شروع کر دیا۔ پانچ سال سے کم عرصے میں اس نے اچھی خاصی رقم بچالی تھی۔ وہ دوالا (Douala) لوٹا اور گاؤں میں باپ کی ماتمی رسوم کا مناسب اہتمام کیا۔ ظاہر ہے، اس نے قرض چکا دیا تھا۔''

''لیکن اس کے باپ کو فوت ہوئے پانچ سال نہیں گزر چکے تھے؟''

''ہاں، بالکل۔ لیکن خاندان کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال تو کرنا ہی تھا، پانچ سال دیر سے ہی سہی۔ سو اپولینیر کا قصہ یوں ہے۔ آج وہ ایک مالدار آدمی ہے، بااثر اور صحتمند، کئی بیویاں ہیں، اور سارا کاروبار گھر ہی سے چلاتا ہے۔ اس کی ماں کو پورا یقین ہے کہ اس کی خوش قسمتی کی وجہ دیے گئے قول کا احترام ہے۔''

''گویا تمھیں اپنے ملک کا حال اور روش پسند ہے؟''

''ہمارے بڑے سے بڑے مسائل معاشی ہیں، پھر حکومت جو مصیبتیں کھڑی کرتی رہتی ہے اور کرپشن، کیونکہ ہم ابھی تک بیگم فرانس کی گود سے نہیں نکلے ہیں جو ہمارے ساتھ ذہنی اعتبار سے معذور بچوں والا سلوک کرتی ہے۔ اور تم جانو، بدتر یہ کہ ہم اس کی ہاں میں ہاں ملائے جاتے ہیں!''

''تو تم نے بیگم فرانس کی وجہ سے ملک چھوڑا؟''

''نہیں، میں تو خوش قسمتوں میں سے ہوں، کام کی وجہ سے آزادی کے ساتھ آجا سکتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مجھے اپنے پہاڑوں کی ضرورت ہے، بالکل جس طرح تمھیں اپنے سگریٹ کی۔''

''چند پہاڑوں کے لیے ملک سے چمٹے ہوئے ہو؟''

''صرف پہاڑ ہی نہیں، یہ میرے اجداد کا ملک ہے، جو ہمارے لیے بے حد ضروری ہیں: ان

Scanned with CamScanner

کے بغیر میرا وجود نہیں۔‘‘

عازل نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور افریقہ کا خواب دیکھنے لگا۔ اس نے تعجب سے سوچا کہ آخر مراکشی خود کو افریقی کیوں نہیں سمجھتے، اور اپنے برّ اعظم سے بالکل نابلد کیوں ہیں۔

’’پتا ہے،‘‘ فلوبیر نے کہا، ’’اجنبی اور غیر ملکی ہمارے ہاں آئیں تو سر آنکھوں پر۔ اگر چاہو تو آؤ، میرے ملک کے شمال میں، خاص طور پر مروا یا غروا میں غالیچے بیچ سکتے ہو؛ الادجی (Aladji)[21] خرید لیں گے۔ انھیں مراکشی غالیچے، خاص طور پر جانمازیں، بہت پسند ہیں۔ تو آنے کے بارے میں سوچنا، اگر اپنے آلام بھول جانا چاہتے ہو: یورپ چھوڑو، اور مراکش نہ لوٹو — کامیرون تمھیں خوش آمدید کہے گا! یہ خالی خولی باتیں نہیں ہیں۔ یہ نہ بھولنا: ہم وہ ملک ہیں جہاں قول دیا جاتا ہے لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے پورا بھی کیا جاتا ہے۔ یہ لو، میں تمھیں بندہ میں اپنے گھر والوں کا فون نمبر دیتا ہوں۔ جب جی چاہے فون کر لینا۔‘‘

’’تم واقعی مجھ پر بھروسا کرتے ہو! میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے، پھر بھی مجھے آنے کی دعوت دے رہے ہو!‘‘

’’آدمی کے بھلے ہونے سے ابتدا کرنا بہتر ہے، تم جانو؛ اور اگر وہ برا نکلے، تو وہ اپنا ہی نقصان کر رہا ہوتا ہے۔ عقل کی بات ہے۔‘‘

’’تمھارا کیا خیال ہے، وہاں کسی مَربوط[22] سے صلاح مشورہ لے سکوں گا؟‘‘

’’بالکل، بالکل۔ لیکن اس کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ تم اس سے کیا چاہتے ہو۔‘‘

’’یہی کہ شفایاب ہو جاؤں۔‘‘

’’کس چیز سے شفایاب؟‘‘

’’ہر چیز سے۔ خود سے، اپنی زندگی سے، اپنی ناکامیوں سے، اپنے خوفوں سے، اپنی کمزوریوں

---

21۔ Aladji: شمالی کامیرون میں 'مسلمان' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

22۔ مَرابط (واحد: مَربُوط): مغربی افریقہ میں استعمال ہونے والی کثیر المعنی اصطلاح جس سے عالم، قرآن کا عالم، صوفی، درویش اور مرشد مراد لیے جاتے ہیں۔ بعض مربوط ماقبل اسلام کی روایات پر عمل کرتے ہیں اور گنڈے تعویز دیتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

سے، اپنی کمیوں سے۔ چاہتا ہوں کہ سکون مل جائے، بالکل، اپنے سے آسودہ رہوں۔''

رخصت ہونے سے پہلے فلوبیئر نے عازل کو اپنا کارڈ دیا۔

''ارے یہ تو بتاؤ— تمھارا نام کیا ہے؟''

''عزالعرب۔''

''کسی ادیب کا نام ہے؟''

''ایسی قسمت کہاں!''

# 34

## کنزہ

طلاق کی کارروائی آگے بڑھ رہی تھی۔ میگیل نے کنزہ کو خبردار کر دیا تھا کہ چند ماہ باہر رہے گا۔ روانگی سے ذرا پہلے اس نے کنزہ کو ایک پیکٹ بھیجا جس میں ایک شاندار قدیم گلوبند اور وافر رقم تھی، ساتھ ہی ایک رقعہ بھی: ''میری پیاری، میں بہت دور جا رہا ہوں، جو کچھ میری زندگی میں پیش آ رہا ہے اس سے اکتا گیا ہوں، سو کوشش کر رہا ہوں کہ اپنی امیدوں اور الجھی ہوئی زندگی کے درمیان مناسب فاصلہ قائم کروں۔ یہ آسان نہیں۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے، اور سب سے بڑھ کر، باغ نسیاں کی دیکھ بھال کی۔ خوش رہو، اس ترک کے ساتھ کچھ بچے پیدا کرو، اور میں اپنے بڑھاپے سے افسردگی کو دور رکھنے کے لیے ان کی پرورش کروں گا۔''

یہ آخری بات خاصی ترغیب انگیز تھی، لیکن کنزہ کو ابھی تک ناظم کے بارے میں شک تھے۔ وہ جب بھی اس سے مستقبل کی بات کرتی، وہ گریز کر جاتا۔ وہ پیار کرتی؛ ناظم ہچکچاتا، اپنے جذبات کے اظہار سے معذور، خواہ کسرنفسی کے باعث یا کسی جانے بوجھے مقصد کے تحت، کنزہ کہہ نہیں سکتی تھی۔ انھیں ایک

Scanned with CamScanner

دوسرے سے ملتے ہوئے اب سال سے اوپر ہو رہا تھا، اور بستر میں ان کی ہم آہنگی ابھی تک برقرار تھی۔ کنزہ معاملہ آگے بڑھانا چاہتی تھی، منصوبے بنانا چاہتی تھی، اور میگیل سے طلاق طے ہوتے ہی بچے پیدا کرنے کی خواہشمند تھی۔ اسے اس ملک سے محبت تھی، ماں کو باقاعدگی سے پیسہ بھیج رہی تھی، 'ڈیول دلیف' میں اب بھی رقص پیش کرنے جاتی تھی، اور کبھی کبھار شادی کی تقریبوں میں بھی رقص کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتی جہاں مشرقی رقص پسند کیا جاتا تھا۔ وہ پیسہ بچا رہی تھی اور تہیہ کر لیا تھا کہ عازل کے بارے میں فکرمند نہیں ہوگی۔ ہر کسی کی اپنی زندگی اور قسمت ہے، وہ مسلسل سوچتی، جیسے خود کو یقین دلا رہی ہو کہ وہ عازل کی ذمے دار نہیں ہے۔

پھر یوں ہوا کہ ناظم راتوں رات غائب ہو گیا۔ کنزہ نے اسے ہر جگہ تلاش کیا؛ اس کے بارے میں بدترین خیالات آ رہے تھے۔ اس نے سنا تھا کہ اسپینی امورِ داخلہ کے شعبے نے مالی اور سینیگال کے سو کے لگ بھگ غیر قانونی غیر ملکیوں کو طلب کر لیا تھا؛ موزوں دستاویز ملنے کے وعدے کی ترغیب میں آ کر سب کے سب مقررہ وقت پر تھانے پہنچ گئے تھے۔ پولیس والے اتنی بھلائی سے پیش آئے کہ چند غیر قانونی تھانے کے سامنے ہی ناچنے لگ گئے۔ پھر انھیں گرم مشروب اور پنیر کے چھوٹے چھوٹے رول پیش کیے گئے؛ سؤر کے گوشت کے رول نہیں، اور انھوں نے اس ثقافتی پاسداری کو تحسین کی نظر سے دیکھا تھا۔ کھانا کھلا کر اربابِ اختیار انھیں ایک بڑے ہال میں لائے، پھر اگلے ایک گھنٹے کے لگ بھگ انھیں بھول بھال گئے، یہاں تک کہ خواب آور گولیاں جو مشروب میں تحلیل کی گئی تھیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔ سارے افریقی گہری نیند میں اتنا غفیل ہو گئے۔ مشاق افسروں نے اب ہتھکڑیاں چڑھا دیں اور بس میں ڈال کر عسکری ہوائی اڈے پر لے گئے جہاں ایک جہاز ان کا منتظر تھا۔ چند قیدیوں نے ایک ذرا اپنی غنودہ آنکھیں کھولیں، لیکن کچھ بول نہ پائے؛ نظر دھندلائی ہوئی تھی، اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ جہاز پر دوسرے افسروں نے ان کے منھ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا اور بڑی مضبوط ٹیپ سے انھیں ان کی نشستوں سے جکڑ دیا تھا۔ جہاز اڑا، چند گھنٹوں بعد جب مسافروں کی نیند کھلی تو دیکھا کہ باماکو (Bamako) کے ہوائی اڈے پہنچ گئے ہیں، جہاں افسروں نے انھیں ان کے بندھنوں سے رہائی دلائی۔ بس پھر کیا تھا، اندرونِ جہاز ہر طرف مکے بازی ہونے لگی اور نشستیں اِدھر اُدھر پھینکی جانے لگیں۔ جہاز کا عملہ کاک پٹ میں بند ہو کر بیٹھ گیا تھا؛ پائلٹ نے،

Scanned with CamScanner

ظاہر ہے، یہ پسند نہیں کیا، لیکن ساری کارروائی کو نظر انداز کرنے کو ترجیح دی۔ جو ہو رہا تھا ہونے دیا، لیکن یہ نہیں کہ اس سے اتفاق کیا ہو۔ احکامات۔ ظاہر ہے — اسے حکم ملے ہوئے تھے، اب یہ اور بات ہے کہ اس کارروائی کی تفصیل میں کوئی نہیں گیا...

دریں اثنا، مالی کے حکام بڑی شش و پنج میں آپڑے، تعجب کرنے لگے کہ آخر جہاز دکار (Dakar) کیوں نہیں گیا۔ چنانچہ ان گھر لوٹیوں کو — وہ نام جو امورِ داخلہ والوں نے انھیں دے رکھا تھا — ویرانے میں لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ سینیگالی بھاگ کھڑے ہوئے، بعض دکار کی سمت میں، بعض دوسرے شمالی مراکش کی طرف۔ وہ واپس اسپین لوٹنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس تھا ہی کیا جس کے کھونے کا غم ہو۔

یہ اسپینی پریس والے تھے جنھوں نے یہ خبر سنائی، اور اثنار (Aznar) حکومت کے اس انسانیت سوز ہتھکنڈوں پر کڑی تنقید کی۔ وزیر اعظم نے جواب میں وہی لگا بندھا ترش رو فقرہ دہرا دیا: ''مسئلہ تھا، اب مسئلہ نہیں رہا، تو مسئلہ کہاں ہے؟''

اس گھناؤنے فضیحتے نے کنزہ کو بڑی اذیت پہنچائی۔ ہو سکتا ہے ایک ایسا ہی دوسرا مخصوص جہاز ترکوں کے لیے بھی تیار کیا گیا ہو؟ اس نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ پورے اسپین میں اتنے ترک نہیں تھے جو جہاز بھر جائے۔ وہ ریستوراں پہنچی جہاں ایک بیرے نے بتایا کہ ہفتے بھر سے ناظم نظر نہیں آیا ہے اور اسے ایک پتا دیا جہاں شاید مل جائے۔ کنزہ نے ٹیکسی رکوائی۔ وہ اس جگہ لے آئی جو 'بریو چینو' اور 'بریو گوتکو' کے درمیان ایک تنگ اور تیرہ و تاریک سی گلی نکلی۔ داخلہ بے حد غلیظ تھا، نشے میں آیا ہوا ایک لاطینو کھڑا بھیک مانگ رہا تھا؛ کنزہ نے ایک سکہ دے کر پوچھا کہ کیا کسی ترک کو جانتا ہے، دراز قامت، گندم گوں، موٹی موٹی کالی سیاہ مونچھوں والا۔

''اچھا وہ، ایل مورو، سب سے اوپری منزل کے عقب میں، سرخ دروازہ۔''

کنزہ نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کئی بار ناظم کا نام لے کر آواز دی۔ اندر سے صرف ایک بچے کی آواز آتی سنائی دی۔ اس نے دروازہ اور زیادہ زور سے کھٹکھٹایا۔

''ناظم، کنزہ ہوں، دروازہ کھولو۔ بڑی اہم بات ہے۔''

بچہ رو رہا تھا۔ کنزہ کو کسی عورت کی آواز سنائی دی جو بچے کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہیں

Scanned with CamScanner

اسے غلط پتے پر نہ بھیج دیا گیا ہو، اسے خیال آیا۔ ناظم اس خستہ حال عمارت میں تو نہیں رہ سکتا، سوائے اس کے کہ شادی شدہ ہو اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہتا ہو . . . اور یہ سوچنے پر کنزہ نے فوراً خود کو مجرم محسوس کیا — تاہم، سب کچھ ممکن ہے: جیسا کہ میکیل نے اس سے بارہا کہا تھا۔ اب ناظم کی بابت اس کے شکوک دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو گئے، یہاں تک کہ اس کی پوری وسعت میں سما گئے، اسے کچوکے لگانے لگے، چالیں چلنے لگے، اذیت پہنچانے لگے۔ بس اب ایک کام ہی باقی رہ گیا تھا: اپنے مرد کو ڈھونڈ نکالے اور اس سے صاف صاف پوچھے۔

اگلے دن، سہ پہر کے ڈھلنے پر، ناظم دوبارہ نمودار ہوا۔ تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا اور جیسے کسی فکر میں غلطاں ہو۔ کنزہ کو بتایا کہ ایک اچھی اجرت کا کام نمٹانے گا لیا گیا ہوا تھا، اور چونکہ خطرے کا کام تھا اس لیے اسے پہلے نہیں بتایا تھا۔ چند لمحوں کے باہمی سکوت کے بعد اس نے کنزہ کا شانہ پکڑ کر نرمی سے کہا:

''یوں سمجھو، کنزہ، میری زندگی میں بڑے پیچ ہیں، مجھ پر ایک بڑے موذی آدمی کا قرضہ نکلتا ہے جو چکانا ہے۔ میں تفصیل میں نہیں جا سکتا، اور پھر یہ کہ مجھے اس کے بارے میں بات کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ میں بس تم سے اتنی درخواست کرتا ہوں کہ مجھ پر بھروسا کرو۔''

وہ ایک قہوہ خانے میں چلے آئے تھے۔ اس نے اپنی بانہیں کنزہ کے گرد ڈال دیں۔ کنزہ کا جی چاہا کہ رو دے، لیکن اس کا ذہن تنبیہ کرتا رہا: خبردار، خبردار۔ ناظم غسلخانے جانے کے لیے اٹھا۔ کنزہ نے دیکھا کہ اس کا بٹوا گر گیا ہے۔ اس نے اٹھا کر میز پر رکھ دیا، اور اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ایک عجیب سا خیال آیا: اگر بٹوا کھول کر دیکھو گی، تو تمھیں ایک اہم بات دریافت ہو گی۔ جیسے یہ قسمت کی جانب سے اشارہ تھا۔ بایں ہمہ، اس نے بٹوے کو چھونے کی جرأت نہ کی، لیکن ناظم غسلخانے میں بڑی دیر لگا رہا تھا۔ کنزہ نے دھیرے دھیرے بٹوے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک انگلی کی حرکت سے اس کا ایک پٹ پلٹ دیا۔ ایک تصویر۔ اس میں ناظم ایک لمبے لمبے بھورے بالوں والی نوجوان لڑکی کو چمٹائے ہوئے تھا اور پہلوؤں میں دو بچے تھے۔ ایک فیملی فوٹو۔ ایک مثالی فوٹو جو باپوں کے بٹوے میں ہوتی ہے۔ وہ آنسوؤں کو رخساروں پر بہنے سے نہ روک سکی۔ بالآخر ناظم دوبارہ نمودار ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا، اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک شاندار دن گزارنے کے لیے چاق و چوبند۔ دریں اثنا کنزہ

اپنی حالت پر قابو پا چکی تھی۔ وہ بنا ایک لفظ کہے کھڑی ہوئی، قہوہ خانے سے نکلی، اشارے سے ٹیکسی بلائی، اور اوجھل ہو گئی، ناظم کو فٹ پاتھ پر تنہا چھوڑ کر۔

## 35

## ناظم

اس راز نے اس کے دماغ اور جسم دونوں کو تقریباً تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے اسے مقفل کر رکھا تھا، جیسے کسی ڈبے میں جو یادوں پر مضبوطی سے بند کر دیا گیا ہو، وہ یادیں جو دوبارہ زندہ ہونے پر تلی بیٹھی ہوں، ایک گزشتہ زندگی کے باقی ماندہ ٹکڑے جسے مہینوں، یا شاید چند برسوں سے محبوس کیا ہوا ہو۔ اس نے اپنا دل کڑا کر لیا تھا کہ ان یادوں کو کبھی نہیں دہرائے گا، ان کی کبھی یادآوری نہیں کرے گا۔ اسے معلوم تھا کہ یادوں کا وجود صرف اسی وقت ہوتا ہے جب انھیں حال میں واپس لے آیا جائے۔ کبھی کبھار وہ ان کے گرد ضرور منڈلا لیتا تھا، ان کی مہک اپنے مشام میں اتارتا تھا، اور تنہائی سے خود کو مدہوش کر لیتا تھا، خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیتا تھا جیسے خود کو یقین دلانا چاہتا ہو کہ اپنی ماضی اور حال کی زندگیوں کے درمیان چکرانا بے مصرف ہے۔ اب مزید احتیاطوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اس غلیظ بے توقیری کو اپنے باطن میں لیے لیے پھرتا رہا تھا اور یہ سوچے بیٹھا تھا کہ وہ اس غلیظ، بدبودار، اور رسوا کن چیز کو ناقابلِ اعتراف جرائم کی اقلیم میں ہنکا کر اس سے امان پا جائے گا۔ اس نے غفلت سے کام لے کر جھوٹ بولا تھا۔ وہ خاموش رہا تھا، اور بس۔ کنزہ نے اس سے کبھی اس کے ماضی کے بارے میں مخصوص سوال نہیں کیے تھے۔ اگر وہ پوچھتی کہ کیا وہ ترکی میں شادی شدہ تھا تو وہ کیا جواب دیتا؟ بس یہی کہ چند فقرے بڑبڑا دیے ہوتے، اور پھر موضوع بدل دیا ہوتا۔ میں، شادی شدہ؟ ظاہر ہے نہیں! اس میں شک نہیں کہ میں اپنی ہمسائی سے شادی کر سکتا تھا، لیکن اسے تو اس کے چچیرے بھائی کو دینے کا طے ہو چکا تھا۔ اور جیسا کہ عظیم شاعر ناظم حکمت نے کہا ہے:

میں نے غزال کو صیاد کے چنگل سے نکال لیا

لیکن ہنوز بے ہوش، وہ جی نہ سکی
میں نے شاخ سے نارنج توڑ لیا، لیکن اس کا چھلکا نہ اتار سکا
میں ستاروں کے جھرمٹ میں چپکے سے داخل ہو گیا، اندھادھند
لیکن ان کا شمار نہ ہو سکا...

بیوی اور دونوں لڑکوں کو دیکھے اسے اب دو سال اور تین ماہ ہو رہے تھے۔ وہ انھیں پیسے بھیجتا رہا تھا، کبھی کبھار ٹیلیفون بوتھ سے فون بھی کر لیتا تھا، جو جی میں آتی کہہ دیتا، مثلاً، ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں کام کر رہا ہے، اس کا نام کبھی نہ بتاتا، رہائش میڈرڈ میں ہے لیکن طلیطلہ میں ریاضی بھی پڑھا رہا ہے۔ وہ ایجاد سے کام لیتا، غلطیاں کرتا، چکرا جاتا، معذرت کرتا، اور پھر رُکھائی سے فون بند کر دیتا۔ اسے پتا تھا کہ وہ بیوی پر بھروسا کر سکتا ہے، جو آرکیٹیکٹس کی ایک فرم میں ملازم تھی، وہ بچوں کی دیکھ بھال کی پوری صلاحیت رکھتی تھی، اور وہ اس کا انتظار کرے گی۔ اسے جوئے کے سلسلے میں بھاری قرضے کے باعث ترکی چھوڑنا پڑا تھا، یہ اس وقت جب اس کے قرض خواہوں میں سے ایک نے، جو بڑا مالدار اور کجرو آدمی تھا، اچانک بڑی سفاکی کے ساتھ اس سے رقم کا مطالبہ کیا تھا۔

''جانتا ہوں تم قلاش ہو، تمھارے پاس ایک دمڑی تک نہیں،'' قرض خواہ نے کہا تھا۔ ''تم وہ ساری رقم کبھی ادا نہیں کر سکتے جو تم پر واجب ہے۔ تمھیں قتل کروا سکتا ہوں، لیکن اس سے میرا پیسہ نہیں ملنے کا۔ میری دولت کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن تم جانو، مجھے 'ایذا رسانی' سے عشق ہے، انسانوں کو کسمپرسی میں تڑپتا دیکھنے کا دلدادہ ہوں، میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے اندر کیا ہوتا ہے، مجھے کسی کو، خاص طور پر تم جیسے کسی اچھے انسان کو غلامی کرتے، زندگی کی بدترین ذلتیں اٹھاتے دیکھ کر کتنی فرحت محسوس ہوتی ہے۔ تمھاری سزا — جلاوطنی ہے۔ میں تمھیں ملک سے باہر نکل جانے کا حکم دے رہا ہوں۔ جہنم رسید کر رہا ہوں، جیل خانے نہیں بھیج رہا، کیونکہ یہ بہت آسان ہوگا، نہیں، تمھیں بن باس دے رہا ہوں۔ تمھیں بیوی بچوں سے جدا کر رہا ہوں، جن پر اپنی نظر رکھوں گا۔ خبردار جو تین سال تک ترکی میں پلٹ کر قدم رکھا۔ میرے آدمی سارے میں پھیلے ہوئے ہیں، اور وہ پرلے درجے کے سفاک ہیں۔ آدمی کی تکا بوٹی کرنے میں بڑا مزہ لیتے ہیں۔ سو بات یوں ہے۔ تم میرے تین ملین کے مقروض ہو۔ چنانچہ میں تمھیں ترکی میں تین سال کے عدم وجود کا فیصلہ سناتا ہوں۔ آیا سمجھ میں؟ اور مجھے رُلانے

کی کوشش مت کرنا: جب روتا ہوں تو نہایت کمینہ بن جاتا ہوں۔ تم خوش قسمت ہو، تمھاری سزا حسبِ ضرورت ظالمانہ نہیں۔ اپنی قسمت کا شکر ادا کرو کہ مجھ جیسے قرض خواہ سے پالا پڑا ہے۔ ٹھہرو، ابھی جاؤ نہیں، ابھی تمھیں معلوم نہیں ہوا ہے کہ کہاں جلاوطن کر رہا ہوں۔ ایسی جگہ جہاں ترک عام طور پر نہیں جاتے ہیں۔ جیسے اسپین: بڑا پیارا ملک ہے، اسپین، بڑا مہمان نواز۔ وہاں تم بہت سی چیزیں دریافت کرو گے، ممکن ہے ملک پسند بھی آئے۔ ویزے کی درخواست مت دینا، وہ تمھیں کبھی نہیں ملنے کا۔ بس روانہ ہو جاؤ، پاپیادہ، دن رات چلتے چلے جاؤ، اور تھک جاؤ تو مجھے یاد کر لینا—— مجھے لطف آئے گا۔ غائب ہونے کے لیے تمھارے پاس صرف اڑتالیس گھنٹے ہیں۔ سنو، یہ فون نمبر لو: اس آدمی کا نام عمر ہے، اپنے دوستوں میں 'تارس بلبا' (Taras Bulba)[23] کے نام سے مشہور ہے۔ کوئی شاعر واعر نہیں، لیکن تم جیسے مردوں کے ساتھ جفتی کا بڑا شوقین ہے، سو اپنی مقعد پیش کر دینا، اور وہ ملک سے نکلنے میں تمھاری مدد کرے گا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے: عمر ذہنی طور پر مریض آدمی ہے، بس کہیں کولھے نظر آ جائیں، اس کا عضو بے تاب ہو کر نکل آتا ہے اور ان کی ضیافت کا بھوت سوار ہو جاتا ہے—— عجیب آدمی ہے، وفادار، میرے ساتھ کبھی دغا نہیں کی، بالکل بے حس اور جذبات سے عاری۔ الّا یہ کہ سارا بکھیڑا تم خود ہی نبٹانا چاہو... یہ جو ہمارا معاہدہ ہے، یہ نہ سمجھنا کہ تمھیں اس کا ذکر کرنے کی آزادی ہے، یا، مثلاً، سیاسی پناہ مانگنے کی؛ مجھے معلوم ہے کہ یورپیوں کے دل موم ہوتے ہیں، بس کوئی حیران پریشان نظر آ جائے کہ پھٹ سے سیاسی پناہ پکڑا دیتے ہیں—— سو ایسی کوشش کی تو انجام برا ہو گا۔ تمھارے بیوی بچے میری مٹھی میں ہیں۔ خیال رہے، اسپین جانا ضروری نہیں، جرمنی جانے کی کوشش کر سکتے ہو، لیکن یہ بہت آسان ہو گا، وہاں جو ڈھیر سارے ترک موجود ہیں۔ جرمنی جانا جلاوطنی نہیں ہو گی۔ جلاوطنی تو برف جیسی سرد جگہ کا نام ہے۔ لیکن یہ نہ بھولو، میرے آدمی وہاں بھی موجود ہیں۔"

ناظم کو پتا تھا کہ اس کا سابقہ بڑے ٹیڑھے اور سرپھرے آدمی سے پڑا ہے۔ ملک چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، فرار ہو، جس قدر جلد ممکن ہو ترکی سے نکلے اور اسپین پہنچے، وہاں ٹھیک حکم کے

---

23۔ روسی ادیب نکولائی گوگول کے اسی نام کے مختصر ناول کا مرکزی کردار۔ قزاخستان کے رہنے والے تارس بلبا نے اپنے دو بیٹوں آندری اور اوستاپ کے ساتھ جنوبی یوکرین کا سفر اختیار کیا اور وہاں دوسرے جنگجوؤں کے ساتھ مل کر پولینڈ کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔

مطابق تین سال گزارے۔ ہو نہ ہو، وہاں قرض خواہ کے بھروسے کے آدمی موجود ہوں گے: ناظم کو اس کی تمام دھمکیوں کا پورا یقین تھا اور وہ ابھی سے یہ تصور کرنے لگا تھا، جیسا کہ مافیا سے متعلق فلموں میں دکھایا جاتا ہے، کہ قاتل اس کا پیچھا کر رہے ہیں، اور بیوی بچے خطرے میں ہیں۔ قرضہ غیر معمولی طور پر بھاری تھا۔ یہ نوبت کیسے آئی تھی؟ ایک طرح کی لاپروائی، جنون، لعنت۔ اس کے لیے قمار بازی کی وہی حیثیت تھی جو نشے کی شراب کے دھتیوں کے لیے ہوتی ہے، جہنم میں بیچ بیچ کی چھلانگ۔ اس کی بیوی کو بہر حال اس کی بابت کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ اسے کبھی بتاتا بھی نہیں تھا۔ بس گاہے بگاہے غائب ہو جاتا، کہتا کہ یونیورسٹی میں میٹنگ تھی یا یہ کہ بچپن کے دوستوں سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی اور رات دیر سے گھر پہنچے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اسپین میں جلاوطنی ایک عذاب تھی، لیکن اس نے اسے جوئے بازی سے نجات کا موقع بھی سمجھا۔ رخصت ہونے سے پہلے بیوی سے کہا کہ یونیورسٹی اسے چند ماہ کے لیے یورپ بھیج رہی ہے: وہ تفصیل میں نہیں گیا۔ بچوں کو سوتے میں پیار کیا، ایک بیگ میں سامان ڈالا، اور آنسوؤں کو ٹپکنے سے روکتے ہوئے غائب ہو گیا۔

سو وہ اس طرح فرانس میں کچھ دن ٹھہرنے اور راہ کی چند پریشانیوں کے بعد اسپین جا پہنچا۔

# 36

# عازل

غیر دستاویزی اجنبی کیا ہوتا ہے؟ ایک غریب الوطن جو بے قاعدہ صورت حال میں ہو۔ ایک شخص جس نے اپنے سارے شناختی کاغذات جلا دیے ہوں تاکہ اسے اپنے اصلی وطن واپس بھیجنا ناممکن ہو جائے۔ لیکن، بسا اوقات، ایسا غیر ملکی بھی جو قانونی طور پر ملک میں داخل ہوا ہو لیکن ملازمت کرنے یا اقامت کا اجازت نامہ اب پاس نہ رہا ہو، یا ملک میں پڑے رہنے کی کوئی اور معقول وجہ۔

عازل کا شمار آخری زمرے میں ہوتا تھا۔ رہائشی پرمٹ کی تجدید کے لیے، جس کی میعاد چند ماہ پہلے ختم ہو چکی تھی، آجر سے کیا ہوا باقاعدہ معاہدہ ہونا لازمی تھا اور قیام گاہ کا پتا جس کی تصدیق پانی، بجلی،

یا ٹیلیفون کے بل سے ہوتی ہو — اور ایسی کوئی دستاویز وہ پیش کرنے سے قاصر تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ غیر قانونیت کے گڑھے میں جا گرا ہے، وہ حاشیے کا منطقہ جہاں ممنوعہ منشیات کا لین دین کرنے والے اور ایسے ہی دوسرے بھرتی کرنے والوں کا راج تھا جو آدمی کو اسی قسم کے ناگوار دھندوں کے لیے ملازم رکھنے کے لیے ہمیشہ تیار ہوتے۔ اسے یہ سب معلوم تھا اور وہ اس کی طرف سے پریشان نہیں تھا۔ جبریت پسند ہونے کے سبب اسے معلوم تھا کہ اس کی تقدیر میں ہی اس راہ پر چلنا لکھا تھا، اس کی مزاحمت کرنا نہیں۔ سو اس نے سبھوں سے اپنا تعلق توڑ لیا تھا، حتیٰ کہ کنزہ سے بھی۔ وہ لاابالی زندگی گزار رہا تھا، گویا کسی گھناؤنے جرم کا کفارہ ادا کر رہا ہو جو کبھی ماضی میں اس سے سرزد ہوا ہو۔ اب کوئی ایسا نہیں رہا تھا جس سے بات چیت کی جا سکے، جس سے اپنے راز بیان کیے جا سکیں۔ اس کی زندگی کی ساری معنویت جاتی رہی تھی۔ وہ وقت کا بیشتر حصہ عباس کے ساتھ گزارتا، جو اسے جعلی کلائی کی گھڑیاں چپکے سے بیچنے کے لیے دے دیتا یا کبھی کبھار حشیش کی تیلیوں سے بھری ماچس کی ڈبیاں۔ گاہے بگاہے کوئی عورت اس سے چھلتی ہوئی گزر جاتی تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کی سابقہ جنسی توانائی لوٹ آئی ہے اور فوراً بھاگتا ہوا کسی قہوہ خانے کے سنڈاس میں جلق لگانے جا پہنچتا۔ ایک دفعہ ایک نقلی کارٹیئے (Cartier) گھڑی ایک راہگیر کو بیچی جس نے عربی میں شکریہ ادا کیا۔ چند لمحوں بعد وہی آدمی لوٹ کر آیا اور پوچھا کہ کیا عازل کے پاس قہوے کی ایک پیالی پینے کا وقت ہوگا۔ وہ اس شہر سے ناواقف تھا، اس نے بتایا، بس یہاں سے گزر رہا تھا۔ کیا عازل اسے اس محلے میں کسی مسجد کا پتا بتا سکتا ہے جہاں وہ مغرب کی نماز پڑھ سکے؟ وہ نماز پڑھنا چاہتا تھا، بصورت دیگر اسے بہت افسوس ہوتا۔

عازل کو اس علاقے میں کسی مسجد کا معلوم نہیں تھا۔

''تو گویا،'' آدمی نے پوچھا، ''تم نماز ادا نہیں کرتے؟''

جواب میں عازل نے ایسے منھ بنا دیا جیسے نماز وماز اس کی دلچسپی کی چیز نہیں۔

''خدا سے کلام نہ کرنا، دن میں ایک بار بھی نہیں، میرے بھائی، سخت افسوس کی بات ہے۔ معلوم ہے تم دن کی پانچوں نمازیں ایک ہی وقت میں قضا پڑھ سکتے ہو اور اس طرح سکون کے عالم میں پڑھ سکتے ہو؟''

تب عازل سمجھ گیا کہ یہ شخص حقیقت میں ایک بھرتی کار تھا اور ٹھیک اسی آدمی کا سا انداز اور

Scanned with CamScanner

دوستانہ طریقہ استعمال کر رہا تھا جس نے طنجہ میں اسے کسی اسلامی تحریک میں پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ عازل نے اسے بولنے دیا، خاموشی سے سنتا رہا، لیکن اس نے اس کا تصور ان بھونڈی، مضحکہ خیز حالتوں میں نہیں کیا جن میں پہلے بھرتی کار کا کیا تھا۔ اُس وقت اس میں اس قسم کی ترغیب انگیز سیاسی اکساہٹوں کے خلاف اپنے دفاع کی طاقت باقی تھی۔ لیکن اب وہ تھک چکا تھا، اور الجھے الجھے انداز میں ان پیشکشوں سے کسی نہ کسی طرح فائدہ اٹھانے کا امیدوار تھا جو یہ آدمی یقیناً اس کے سامنے رکھنے والا تھا۔

''برادر، تم جانتے ہو گے، کہ یہاں، ہم اپنے اجداد کی سرزمین پر ہی ہیں، وہ اجداد جنھیں کیتھولک اسابلا نے دیناروں کو کھونٹے سے جکڑ کر بھسم کرنے کے بعد ملک بدر کر دیا تھا، ہمارے مسلمان آباواجداد۔ اس نے مسلمانوں کے عبادت خانوں کو مسمار کرنے کا حکم دیا، اور جو وہاں سے فرار نہ ہو سکے انھیں زبردستی کیتھولک عقیدہ اختیار کرنے پر مجبور کیا، اس نے عربی رسم الخط اور روایتی لباس کا استعمال غیر قانونی قرار دیا۔ یہ سب ماضی میں ہوا تھا، پانچ سو سال پہلے، لیکن وہ زخم سوزاں ابھی تک باقی ہے، ہمارے دلوں میں، ہر مسلمان کے دل میں، ہر عرب کے دل میں۔ اسلام کو اس ملک سے دیس نکالا ملا ہے۔ اسے واپس لانا، اس کو محترم بنانا ہمارا فرض ہے۔ ہم کافی ذلت برداشت کر چکے ہیں، عیسائی مغرب کی آنکھوں میں اپنی کافی بے بضاعتی دیکھ چکے ہیں۔ ذرا دیکھو کہ ہمارے فلسطینی بھائیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے، امریکہ کس طرح اسرائیل کی حمایت کر رہا ہے، اور خود ہمارے ملک اپنے شہریوں کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ ہم پر واجب ہے کہ کچھ کریں، کوئی ردعمل ظاہر کریں، ہر طرف پھیلیں، اسلام اور دوسرے مسلمانوں کی صدا کو سنیں۔ اچھا یہ بتاؤ، تم تعلیم یافتہ ہو، ہونا؟ اپنے بیشتر بھائیوں کی طرح جاہل تو نہیں؟''

''میں رباط کے لا اسکول کا سند یافتہ ہوں۔''

''مجھے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ میرا سابقہ ایک مہذب شخص سے ہے جو عقل سلیم رکھتا ہے۔ میں تمھیں ہمارے ساتھ عشا کی نماز پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ آج نہیں، ظاہر ہے، اگر کسی اور وقت تمھارا ہم وطنوں سے ملنے کو جی چاہے جو نہ منشیات کے لتی ہیں نہ معاشرے کی تلچھٹ ہیں، تو آؤ اور دیکھو کہ ہم کیا تعمیر کر رہے ہیں، اپنے ملک کے مستقبل کے لیے کیا تیار کر رہے ہیں۔''

عازل کو اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے، اور اس نے پوچھا، ''کیا تم مراکشی ہو؟''

Scanned with CamScanner

''اتنا ہی جتنے تم۔''

''تو پھر مشرق قریب والوں کی طرح کیوں بول رہے ہو؟ تمھارا انداز خلیجی ریاستوں والوں جیسا ہے جو ہمیں ٹی وی پر وعظ کرتے ہیں۔''

''اس کی بس اتنی وجہ ہے کہ میں نے جدہ کی وہابی یونیورسٹی میں پڑھا ہے۔''

''وہابی ... تم وہابی ہو؟''

''کبھی ملنے تو آؤ، پھر تمھیں ہمارے ہادی عبدالوہاب کی تعلیمات کے بارے میں بتاؤں گا جو اٹھارھویں صدی میں گزرے ہیں۔''

''مجھے بتانے کی ضرورت نہیں، میں پہلے سے انھیں جانتا ہوں۔ یہی نا کہ عورت چھپی رہے، سرتا پا ڈھکی رہے، یہ شریعت ہے، قانون اور شہری حقوق کے بجائے۔ تم لوگ سارق کا ہاتھ قلم کرتے ہو، زانی عورت کو سنگسار کرتے ہو ...''

''یہ ساری باتیں، یہ ہمارے بارے میں پہلے سے قائم کر لی جاتی ہیں۔ میں اگلے ہفتے، اسی وقت، اسی قہوہ خانے میں تم سے ملاقات کا طے کرتا ہوں۔ یہ لو، یہ رہا میرا کارڈ، اس پر میرا فون نمبر بھی درج ہے۔ جب چاہے بات کر لینا، نماز کے اوقات کے علاوہ، ظاہر ہے۔ اور یہ بتانا تو بھول ہی گیا، کیا شاندار اتفاق ہے کہ میرا نام بھی عبدالوہاب ہے!''

عازل کو کوئی تعجب نہ ہوا۔ اس نے کارڈ کو غور سے دیکھا، اس پر جو رقم تھا پڑھا، پھر پڑھا: ''احمد عبدالوہاب: امپورٹ ایکسپورٹ: بارسلونا۔ میڈرڈ۔ طنجہ: ٹیلیفون: 89205 606 34۔''

اس شام عازل عباس سے ملی ساری گھڑیاں بیچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ قہوہ خانے سے اٹھنے ہی والا تھا کہ دو مہاجرت کرنے والوں کے درمیان دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔ بڑی غیر معمولی برق رفتاری دکھا کر پولیس نے سب کو دھر لیا۔

''شناخت ہو گی!'' ایک آفیسر چلایا۔ ''کاغذات، پاسپورٹ، کام کرنے کا پرمٹ، رہائشی پرمٹ، بے روزگاری کارڈ، میں ہر کارڈ دیکھنا چاہتا ہوں، اور جن کے پاس نہیں، وہ دائیں طرف کھڑے ہو جائیں، اور وہ جو سمجھتے ہیں کہ ان کے کاغذات ٹھیک ٹھاک ہیں، بائیں طرف! جو اسپینی ہیں، وہ جائیں! شناختی معائنے کا تعلق صرف 'موروں' سے ہے۔''

عازل ہچکچایا، پھر بائیں طرف چلا آیا۔ پاسپورٹ پاس موجود تھا، لیکن اس کی بقیہ دستاویزات کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ اس نے دیکھا کہ پولیس والوں نے شمالی افریقہ کے دو عربوں سے کاغذات طلب کیے بغیر ہی انھیں جانے دیا۔ مخبر — شاید انھوں نے ہی پولیس کو خبردار کیا ہوگا۔

عازل کو تھانے لایا گیا، جہاں اسے میگیل کو فون کرنے کا خیال آیا، لیکن اسے اس معاملے میں ملوث کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس قہوہ خانے میں جانا اور گرفتار ہونا تقدیر میں لکھا تھا۔ اسے اس کا کامل یقین تھا۔ بس وہ ایک بات نہیں چاہتا تھا: کہ مراکش واپس بھیج دیا جائے، جہاں ذلت، حشومہ اور تحقیر کا سامنا کرنا پڑتا — نہیں، کبھی نہیں، اور کچھ بھی سہی، حتیٰ کہ جیل بھی، لیکن چوتڑوں پر لات نہیں جو چند ہی سیکنڈوں میں اسے طنجہ کے پرانے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچا دے۔ وہ وہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔ اور کسی شہزادے کی طرح لوٹنے کے لیے رخصت، اس کوڑے کرکٹ کی طرح نہیں جو اسپینیوں نے پھینکا ہو۔ پولیس والوں نے حشیش سے بھری دو ماچس کی ڈبیاں اس کی جیب سے برآمد کر لیں۔ اب وہ بدترین حالت میں تھا۔

''اچھا! تو یہ شخص جس کے کاغذات باضابطہ نہیں — یہ بھی حشیش بیچ رہا ہے!''

رات اسے تھانے میں گزارنی پڑی، بنچ پر ایک لاطینو نکمے کے برابر بے خوابی کے عالم میں جس کے جسم سے بدبو آ رہی تھی۔ عازل کو ماں یاد آئی۔ اس نے اسے پکارا؛ ماں نے سنا نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ سننے سے قاصر تھی۔ اس نے اسے گھر کی ٹیرس پر بیٹھے ہوئے دیکھا، نگاہیں سمندر پر جمائے، اس دن کے خیال میں گم جب وہ اپنے بچوں سے مل سکے گی۔ اس نے زندگی میں جو مصائب برداشت کیے تھے ان کا تقاضا تھا کہ اس کے آخری دن کسی خوشگوار ملک میں پہلو میں اپنے دونوں کامیاب بچوں کے ساتھ گزریں۔ ہر کسی کے اپنے خواب ہوتے ہیں . . . عازل کا خواب اس طرح چکنا چور ہو چکا تھا کہ بحال نہیں ہو سکتا تھا۔ فی الوقت اسے یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب کرنی تھی، کوئی ترکیب جو پولیس والوں کو اس کی نیک نیتی کا یقین دلا سکے۔ جب جیب سے پچاس گرام حشیش نکلی ہو تو خود کو معصوم کیسے باور کرایا جا سکتا ہے۔ اسے اپنے پتے کھیلنے ہی ہوں گے۔ صبح اس نے کسی بااختیار آدمی سے بات کرنے کے لیے کہا، کوئی افسر جس کے ساتھ گفت و شنید کر سکے۔

''یہ کیا 'گفت و شنید، گفت و شنید' لگا رکھی ہے! یہ پولیس اسٹیشن ہے، کوئی عدالت نہیں! تم مکروہ

Scanned with CamScanner

منشیات کا دھندا کرنے والے ہو جو نقلی گھڑیاں بیچتا پھرتا ہے، اس پر گفت وشنید کرنا چاہتے ہو؟ خود کو کیا سمجھ رکھا ہے؟''

بالآخر ایک افسر وارد ہوا۔ اس نے عربی میں بات کی۔

''السلام علیکم۔ اسمی خایمه۔ اتکلّم العربی و اعرف المغرب۔ ماذا ترید یا عزالعرب؟'' [السلام علیکم! میرا نام خائمہ ہے۔ میں عربی بولتا ہوں اور المغرب سے واقف ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو، عزالعرب؟]۔

''من الممکن ان اعاونکم۔'' [میں اپ کے کام آ سکتا ہوں۔]

خائمہ نے عربی بولنا چھوڑا اور اسپینی اور فرانسیسی میں بولنے لگا۔

''کام آ سکتا ہوں؟ یعنی مخبر بننا چاہتے ہو؟''

''ٹھیک طور سے کہیں تو میں آپ کو بعض اسلامی جماعتوں کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتا ہوں۔''

خائمہ فون کرنے کے لیے گیا، اور ایک اور افسر کے ساتھ واپس ہوا جو بظاہر مرتبے میں اس سے بڑا تھا۔

''تم سمجھتے ہو کہ چٹ پٹ پولیس کے مخبر بن سکتے ہو؟ اس میں وقت لگتا ہے: اعتبار قائم کرنا پڑتا ہے، کامیاب نتائج دیکھنے ہوتے ہیں، آزمانا پڑتا ہے . . .''

کوئی ایک گھنٹے بعد، جس میں عازل کو فضا بدلتی ہوئی محسوس ہوئی، ایک تیسرا افسر بھی آ کر شامل ہو گیا۔

''تم کیسے یہ ثابت کر سکتے ہو کہ ہم تم پر بھروسا کر سکتے ہیں؟''

عازل نے عبدالوہاب کا کارڈ نکال کر حوالے کر دیا۔

''اس شخص نے مجھے ایک تحریک میں بھرتی کرنے کی کوشش کی تھی جس کا مقصد اسپین میں مسلمانوں کے مفادات کا دفاع ہے۔ وہ مسلسل انتقام کی بات کرتا ہے، کیتھولک اسابلا، اندلسیہ، عیسائیوں اور کفار کے ملکوں میں اسلام کے احیا کی۔ میری اس سے اگلے ہفتے پھر ملاقات ہوگی۔ مجھے ایک موقع تو دیں۔''

Scanned with CamScanner

❁

سو اس طرح عازل اسپینی پولیس کا مخبر بن گیا۔ اپنی کھال بچا لی لیکن اپنی روح بیچ ڈالی ——شاید ایک اچھے مقصد کے لیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے اس کی مطلق پروا نہ تھی کہ راہ راست پر ہے یا گمراہی کے راستے میں۔ مایوسی نے اس کا دل پتھر کر دیا تھا۔ اگلے دن اس کی حالت ابتر ہوگئی، یوں لگ رہا تھا جیسے سارے جسم میں سوئیاں چبھ رہی ہوں۔ ننھے ننھے کیڑے اس کا اعضا پر اوپر نیچے رینگ رہے تھے، اسے کتر رہے تھے، اسے لگا کہ شل ہو گیا ہے۔ اسے بہت تکلیف تو نہیں محسوس ہو رہی تھی، لیکن اس نے یہ ضرور دیکھا کہ دایاں پاؤں بدن سے الگ ہو گیا ہے اور موٹی موٹی سیاہ چیونٹیوں کا ایک جتھا اسے کھینچے لیے جا رہا ہے، جس کے بعد گوشت خور حشرات نے اس کا دوسرا پاؤں بھی اکھاڑ ڈالا ہے۔ اس نے چاہا کہ پیر ہی کیا، وہ اس کا سارا جسم اٹھا لے جائیں اور اس کے بدلے ایک بالکل ہی نیا جسم لا دیں؛ شاید اسے اپنی مردانگی واپس مل جائے، اور بار دگر اپنی گزشتہ زندگی کی لذتیں اٹھا سکے۔ اسے لگا جیسے چہرے پر سنگین نقاب پڑا ہو۔ جب اٹھنے کی کوشش کی کہ جا کر آئینہ دیکھے، تو جنبش نہ کر سکا۔ کوئی چیز اسے روکے ہوئے تھی، ایک بے پناہ بیرونی طاقت جو سختی سے اسے زمین سے جڑے ہوئے تھی۔ پوری کی پوری شفاف نیلگوں پردے میں لپٹی ہوئی ایک بے پناہ حسین مراکشی عورت اس کے سامنے آئینہ اٹھائے ہوئے تھی۔ متبسم اور رقصاں، عورت نے اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی۔ عازل کامل بے حرکتی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا؛ یہ پہلی بار تھی کہ اسے دنیا کی بابت اپنی آگہی میں ایسی حیرت انگیز تبدیلی نظر آئی تھی۔ اس کا دھیان کافکا اور اس کے ''کایا کلپ'' کی طرف گیا، جو اس نے کبھی نہیں پڑھا تھا، لیکن اسے وہ شاندار لیکچر یاد آیا جو اس کے فلسفے کے استاد نے اس موضوع پر دیا تھا۔

میں اپنی قلب ماہیت کروں گا، کوئی اور بن جاؤں گا—— یہ بہر حال اچھا ہوگا: میں ایک شخص سے دوسرے میں بدل رہا ہوں: تھوڑی سی دغابازی ملاتا ہوں، چٹکی بھر الزام تراشی، چاہے یہ اچھے مقصد کے لیے ہو، اور، ہاں، یہ کون سا مقصد ہے؟ ہاں، واقعی، پولیس کا جاسوس بننا بڑا کراہت انگیز ہے۔

اپنے نئے فرائض منصبی کا عادی ہونے کے لیے اسے کچھ وقت درکار تھا۔ اخلاقی تاملات گھٹ کر اپنے اختتام کو پہنچ رہے تھے۔ رخصت شد، آگے کا اتا پتا نداردـ ہمیشہ کے لیے رخصت۔ مرنے کے لیے رخصت۔ وہ شہر کے قبرستان کی زیارت کا قصد کر رہا تھا۔

اگر مروں تو مجھے یہیں دفن کرنا، اس سرزمین میں جس کے اتنے خواب دیکھے تھے۔ میں مارشن قبرستان کی زمین میں نہیں دفن ہونا چاہتا، میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں: وہاں مدفون ہمارے ہمسائے ہیں، اور ہم ان کی زیارت کرنے والے سبھوں سے واقف ہیں۔ مرنا، تو اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے...

ایک صبح اٹھنے پر اسے کوئی مثبت کام کرنے کی تحریک ہوئی۔ وہ ماں کو تار کے ذریعے پیسے بھیجنے ڈاکخانے گیا۔ پھر اسے فون کیا کہ وہ نئی ملازمت شروع کر رہا ہے، کہ میگیل ایک دراز عرصے کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے، کہ وہ خود اچھی حالت میں ہے اور جلد اس سے ملنے طنجہ آنے والا ہے۔

جب ماں نے بولنا شروع کیا تو اس کا لہجہ میلوڈرامائی تھا۔

"تم جانو، بیٹے، خدا مجھے اس دنیا میں اور کتنے دن زندہ رکھے گا، سو تم جانتے ہو گے کہ مجھے کیا فکر کھائے جا رہی ہے: یہی کہ تمھیں شادی شدہ دیکھوں، اپنے گھر میں تمھارے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھوں، شور مچاتے ہوے، خوب شور مچاتے ہوے... میں ایسے شاندار لمحات کا تجربہ کیے بغیر نہیں مرنا چاہتی۔ جانتے ہو، تمھاری چچیری بہن، صباح، وہ تمھاری راہ دیکھ رہی ہے، اس نے حال ہی میں ایک بڑے مالدار اور امید افزا آدمی کا پیغام رد کر دیا؛ وہ تمھیں یاد کرتی ہے، اس کی ماں نے کل ہی اس کی مجھ سے تصدیق بھی کی تھی۔ تو لوٹ آؤ، بیوی کرو اور مجھے پوتے پوتیاں دو۔ خدا مجھے زندگی اور بستر مرگ پر تمھاری موجودگی عطا فرمائے۔"

عازل نے لگے بندھے فقروں کے علاوہ کچھ اور نہ کہا، "خدا تمھیں تندرست رکھے اور تمھاری دعائیں میری محافظ ہوں۔"

محفوظ... وہ بالکل محفوظ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ آخر اس نے کس طرح اتنے الجھاووں میں خود کو پھنسا لیا تھا؟ اس نے دیکھا کہ چوراہے پر کھڑا ہے، سڑک عبور کرنے سے متذبذب؛ ہر سمت سے آتی ہوئی کاروں کے جمگھٹے میں اس نے خود کو کسی بے سر کی کٹھ پتلی محسوس کیا۔ گزشتہ ماہ میں وہ جتنے تجربوں سے گزرا تھا، اس کے بعد وہ کیسے اپنی بازیافت کر سکتا تھا؟ کیسے سکون پا سکتا تھا؟ اس کے اندر کوئی بیٹھا اسے خود اپنی زندگی کی تباہی پر اکسا رہا تھا۔

آسیب زدہ۔ ماں نے اس کے بارے میں یہی کہا ہوتا۔ انھوں نے تم پر جادو کر دیا ہے۔

Scanned with CamScanner

تمھیں شکار کرلیا ہے۔ نظر بد، بغض، حسد۔ سو، میرے بیٹے، جن آزار سے تم گزر رہے ہو ان کی وجہ یہ ہیں۔ تم اس بغض اور کینے کا اندازہ نہیں کر سکتے جو لوگوں کے سینے میں پیدا ہوتا ہے، جب زندگی میں کوئی خود کو بھیڑ بھاڑ سے ممتاز کرتا ہے: وہ تمھیں جراحت پہنچانے کے در پے ہو جاتے ہیں: تم حسین و جمیل ہو، ذہین اور کامیاب ہو (تم، بہر طور، یہاں سے رخصت ہونے میں کامیاب ہوئے، اور اسپین میں اپنے لیے اچھا ذریعہ معاش پیدا کیا)، تو یہ سب خونخوار نفرت، بھیانک رشک پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آہ، ہم سب نظر بد کے ستم رسیدہ ہیں، اور مجھے معلوم ہے، تم آج کے نوجوان، تم ان باتوں میں یقین نہیں رکھتے، تم سمجھتے ہو کہ منطق ہی سب کچھ ہے، کہ تمھاری نظر کے آگے کچھ نہیں ہوتا، لیکن تمھیں اس چیز کو دیکھنا اور سیکھ لینا چاہیے جو خود کو عیاں نہیں کرتی، کیونکہ ہمارے نبی کریم نے بھی نظر بد کے وجود کو مانا ہے۔ حسد تباہی لا سکتا ہے، بس بیچاری حنان ہی کو دیکھ لو: حسین ہے، پڑھی لکھی ہے، اچھے خاندان کی ہے، ایک اہم کنبے کے انجینئر سے شادی کرنے والی تھی، سب کچھ تیار تھا، دعوت نامے تک چھپ چکے تھے، اور جانتے ہو اس کے ساتھ کیا ہوا؟ نہیں، وہ مری نہیں: اس کے ساتھ تو اس سے بھی بدتر ہوا! اس کے منگیتر نے اسے چھوڑ دیا، جو حنان کی پھوپھی سے شادی کرنے کو ترجیح دیتا تھا! سو میں نظر بد کو خوب پہچانتی ہوں۔ میرے بیٹے، قرآن کی تلاوت کرنا نہ بھولنا۔ خدا تمھارا حافظ ہے۔ جانو کہ جہاں میں ہوں، تم سے کوسوں دور، میں تمھیں اپنی برکتیں بھیجنا کبھی نہیں بھولتی، تمھیں اور تمھاری بہن کو۔

## 37

## کنزہ

ریڈ کراس کی ایمر جنسی سروس کے خبردار کرنے پر میگیل اپنی خود عائد کردہ تنہائی سے برآمد ہوا تاکہ اپنی بیوی کے سرہانے بیٹھے جس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ کنزہ خطرناک حد تک زرد نظر آرہی تھی، آنکھیں بے رونق اور کسی احساس سے خالی۔ ایک ناکام معاشقہ۔ ایک سفاک مایوسی۔ زندہ رہنے کی

Scanned with CamScanner

ساری خواہش یکبارگی جاتی رہی تھی۔ جب اس نے میگیل کی پرسش کا جواب نہیں دیا تو میگیل کو اندازہ ہوا، اس کی خاموشی کسی مخصوص صدمے کا نتیجہ ہے، کہ کوئی بھیانک واقعہ پیش آیا ہے۔ میگیل نے اس کا ہینڈ بیگ کھنگالا اور اس میں سے نظموں کی کتاب نکالی، انسانی مناظر، از ناظم حکمت۔ اس نے اس تصویر کو دیکھا جسے کنزہ نے کتاب میں نشانی کے طور پر استعمال کیا تھا۔ تصویر میں وہ ایک گندم گوں، حسین وجمیل، اور مونچھوں والے مرد کے برابر کھڑی تھی۔ دونوں 'کباب' نامی کسی ریستوراں کے باہر کھڑے تھے۔ میگیل کو خیال گزرا کہ اگر کنزہ تصویر کے آدمی کو دوبارہ دیکھ لے تو شاید اس کی قوتِ گویائی لوٹ آئے۔ اور ڈاکٹر کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں وہ اس آدمی کی تلاش میں نکل پڑا۔

'کباب' تلاش کرنے میں اسے کچھ وقت لگا کیونکہ یہ ریستوراں کیا تھا، ڈرائی کلینرز اور سیل فون کی دکان کے درمیان دیوار میں بھنچا ہوا ڈربہ سا تھا۔ کرسیاں غلیظ اور میزیں پلاسٹک سے ڈھکی ہوئی۔ کاؤنٹر کے عقب میں ایک بڈھا بیٹھا سر ہلا رہا تھا، لیکن میگیل کو اپنے دیدہ زیب کوٹ میں ملبوس آتے دیکھ کر وہ اچک کر یوں ہوشیار ہو گیا جیسے شاہ بنفس نفیس قدم رنجہ ہوا ہو۔ میگیل نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا، عقبی دیوار پر ایک پوسٹر چسپاں تھا جس میں کسی اداکار یا گلوکار کی تصویر تھی، اور جب اس نے اور غور سے دیکھا تو اسے اس میں کنزہ کے برابر کھڑے ہوئے آدمی کی شباہت نظر آئی۔

بڈھے نے میگیل کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''اچھا، تو آپ بھی ہماری طرح ہمارے قومی ستارے کے پرستار ہیں! ساری عورتیں اس کی دیوانی ہیں۔ بڑا شاندار گایک ہے۔''

''یہ کہاں رہتا ہے؟''

''یہ ان میں سے ہے جو جہاں بھی جائیں، ان کے محل ہوتے ہیں۔ سبھی اس کے متوالے ہیں، حکومت چاہے کیسی ہو: بائیں بازو کی، دائیں بازو کی، عسکری، شہری، مسلمان، لادین — سب اس کے گرویدہ ہیں، اس کی داد دیتے ہیں۔''

''یہ اسپین میں نہیں رہتا؟''

''نہیں، پچھلے سال ٹیلیوژن کے ایک خاص پروگرام کے لیے آیا تھا۔ تو یہ، ہماری حسین ترین ویٹرس کا شکریہ، کہ ہم یہاں اس کی پذیرائی کرنے کے شرف یاب ہوئے۔ اس نے تو یہاں گایا بھی،

Scanned with CamScanner

بغیر موسیقی کی سنگت کے، کیونکہ کمرے میں موجود تیس کے لگ بھگ ہم وطن چلا چلا کر گانے کا تقاضا کر رہے تھے۔''

''کون ہے یہ؟''

''ابراہیم تتلے سیس 24 جس کا مطلب ہے 'شیریں لحن'! جنوب مشرقی ترکی میں عرفہ کا باشندہ ہے، جو شام کی سرحد سے زیادہ دور نہیں۔ عورتیں اس پر فدا ہو جاتی ہیں۔ جہاں گانے جاتا ہے، شوہر اپنی بیویوں کو چھپا دیتے ہیں۔ اس کی آواز پر تو ریہ کے آنسو نکل آتے ہیں۔''

میکیل نے بڈھے کو فوٹو دکھائی۔

''اس عورت کو جانتے ہو؟''

''اسے تو نہیں، لیکن مرد کو ہاں، اس نے چند ماہ یہاں کام کیا تھا۔ اپنے میں مگن رہتا تھا۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ کیا اس نے کوئی گڑبڑ کی ہے؟ ذرا رکیں، یہ ٹھیک ہے، یہ ابراہیم سے کافی ملتا جلتا ہے، لیکن ظاہر ہے ابراہیم نہیں۔''

میکیل نے لکنت سے شکریے کے چند کلمے ادا کیے اور فوراً اس تیرہ و تاریک، بے کیف جگہ سے نکل آیا۔ اچانک اسے یہ آگہی ہوئی کہ دراصل کنزہ کو خود 'محبت' سے محبت ہو گئی تھی۔ اسے اپنی زندگی میں ایک مرد کی ضرورت تھی، اور یہ مرد اسے ناظم میں مل گیا ہے۔

یہ خاموش طبع لڑکی، بظاہر اتنی متین اور متوازن، جس نے کسی نہ کسی طرح نرسنگ اسکول مکمل کر لیا تھا اور وہاں اتنی کامیاب رہی تھی، آخر اس نے کیسے اپنے کو قائل کر لیا تھا کہ یہ آدمی جسے وہ بمشکل جانتی ہے اس کے ساتھ گھر بسانے کا شائق ہوگا؟ میکیل نے خود کو اس غلطی کا ایک بار پھر کسی قدر ذمے دار محسوس کیا، اور خاص طور پر موجودہ بحران کا۔ اسے کنزہ پر بہتر نظر رکھنی چاہیے تھی، اس نے سوچا، وہ جو کر رہی تھی اس پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی، لوگوں سے متعارف کرانا چاہیے تھا، حتیٰ کہ ایسے مردوں سے بھی جو اسے مسرت پہنچا سکتے۔ یہ پراسرار اور ترغیب انگیز ناظم، صاف ظاہر تھا کہ کنزہ کو قانونی کاغذات، شاید ہسپانوی شہریت حاصل کرنے کے لیے استعمال کر رہا تھا، اس کنزہ کو جس نے اس

24۔ ابراہیم تتلے سیس (Ibrahim Tatlises): ترکی کا بیسویں صدی کا محبوب ترین گلوکار، مخلوط عرب اور کرد پس منظر کا حامل، اور پاپ اور فوک گیت گانے کے لیے مشہور۔

Scanned with CamScanner

امکان کا کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا — یا بلکہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے ہٹ دھرمی سے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس کا شوہر بنے گا اور اس کے بچوں کا باپ، اگرچہ دونوں عاشقوں نے اس موضوع پر صرف ایک مرتبہ ہی بات کی تھی، اور ناظم کا عندیہ صاف صاف معلوم کر لینا دشوار ثابت ہوا تھا۔ بہر حال، کنزہ نے ماں سے اس کا ذکر کیا تھا، جو ایک عرصے سے اسے شوہر تلاش کر لینے کے لیے زور دے رہی تھی۔ للا زہرہ کو ناظم سے تعلق کا یقین تھا اور اس کا کہ کنزہ کو مناسب آدمی مل گیا ہے۔ حقیقت میں بیٹی نے اپنے لیے صرف ایک خیالیہ بنا لیا تھا جو اس کی ہر خواہش پوری کر رہا تھا: شادی کرے، دوسروں جیسی ہو، فوراً بچے پیدا کرے، اور سب سے بڑھ کر، آخر کار سر فخر سے اونچا کیے، ماں کو خوش کرنے گھر لوٹے۔ کہیں سے ناظم آ ٹکرایا تھا، اور کنزہ نے اسے اپنی کہانی کا مرکزی کردار ادا کرنے کے لیے چن لیا تھا۔ ناظم کو کبھی سن گن نہ ہوئی کہ کنزہ کے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اور اب کنزہ کی دنیا ڈھے گئی تھی۔ یہ صدمہ بڑا جانکاہ تھا۔

اسے بچانا ضروری تھا، حقیقی دنیا میں واپس لانا اور علاج کرانے پر راضی کرنا۔ کچھ بھی ہوا سے اس آدمی کو بھول جانا چاہیے، اور ہو سکے تو آخر میں مراکش لوٹ جانا چاہیے۔ اب جا کر میگیل کو اندازہ ہوا، مہاجرت کرنے والوں کے احساسِ تنہائی میں کوئی چیز بڑی جان لیوا ہوتی ہے، ایک طرح کا خلا میں نزول، سایوں سے بنی سرنگ جو حقیقت کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ کنزہ خود ہی بھول بھلیوں میں جا پھنسی تھی، اور عازل، تو وہ بڑی بری طرح غلط راہ پر چل نکلا تھا۔ نکبت کے صحیح ابعاد بے وطنی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ میگیل کو یاد آیا کہ جو طویل نفسیاتی معالجہ اس نے کرایا تھا اس نے زندگی کے اس پہلو کی بابت اس کو کتنی مدد پہنچائی تھی، شاید اس زندگی کو بچا تک لیا تھا۔ لیکن اپنی موجودہ حالت میں کنزہ نفسیاتی معالج کے کاؤچ پر لیٹنے اور اپنی روح کے رازہائے سربستہ منکشف کرنے کے لیے عازل سے زیادہ تیار نہ تھی۔۔۔ ایک اپنی ثقافت اور رسم و رواج کا سوال تھا، اور پیسے کا بھی۔ بہر حال، دونوں یہی سوچتے تھے کہ نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس سر پھرے ہی جاتے ہیں۔

اب میگیل کی سمجھ میں آیا کہ کنزہ اور عازل کو واپس مراکش بھیجنا کتنا اشد ضروری تھا، کیونکہ ان کی واپسی ہی تنہا وہ چیز تھی جو ان کی حیثیت کی دوبارہ بحالی میں مددگار ثابت ہو سکتی تھی اور ان کے زخموں کا اندمال کر سکتی تھی۔ میگیل نے حوان سے رابطہ کیا، تو نصل کا وہی عہدے دار جس نے عازل

Scanned with CamScanner

سے متعلق کا غذات کی ابتدائی کارروائی کی تھی۔ اب میگیل اس کے ذریعے عازل کو گرفتار کروا کر فوراً مراکش کے لیے نکلوا دینا چاہتا تھا۔ باقی رہی کنزہ، تو وہ اسے اپنے ملک میں اپنی زندگی کی دوبارہ داغ بیل ڈالنے پر قائل کرنے کے لیے حسبِ ضرورت وقت لگائے گا۔ حوان نے تفتیش کرنے کے بعد میگیل کو مطلع کیا کہ اس کے متوسل نے اپنا سر پرست بدل لیا ہے: فی الحال وہ میڈرڈ میں تشدد پسندوں کی مخالف پولیس کے لیے مخبر کا کام کر رہا ہے، سو میگیل کو اس کے بارے میں متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر چند کہ عازل کے لیے میگیل کے جذبات بدل چکے تھے، اسے اس دھچکے سے معاملہ کرنے میں کافی دشواری پیش آئی۔ سوان کا تعلق سراسر ناکام ثابت ہوا تھا... میگیل کو حقائق کا سامنا کیے بغیر چارہ نہ تھا: قسمت کے لکھے کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

# 38

# عازل

اگر عازل چاہتا تو اپنے مخمصے سے نکلنے کا ایک اور راستہ بھی اسے مل سکتا تھا، لیکن وطن کی یاد نے اسے بڑی بری طرح گھائل کر دیا تھا، اسے چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں، اور وہ شرمسار تھا۔

میں ہر کام میں ناکام رہنے پر شرمسار ہوں، اس بستر میں اپنی طرف بڑھا ہوا ہاتھ تھام لینے پر شرمسار ہوں جس کی ریشمیں چادریں گناہ کی طرح ترغیب انگیز ہیں؛ میں خود کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میری رجولیت اتنی قوی ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کو آسودہ کرنے کے لیے کافی ہے: کیسی خوش فہمی تھی، کیسی حماقت، اور مجھے میگیل کے پیچھے پیچھے چلے آنے پر کتنا افسوس ہے، وہ رحمدل اور نرم خو آدمی میں کبھی جس کے لائق نہ بن سکا... شروع میں میں نے اپنے سے کہا کہ بس یہ ایک تجربہ ہی ہے، دوسرے تجربوں جیسا۔ مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ میں نے اپنے رشتے کے بھائی مہدی کے ساتھ کچھ عمل کیے تھے جسے اپنے کولھے سہلوانے میں بڑی لذت محسوس ہوتی تھی، لیکن وقت کے ساتھ میں نے جانا کہ میں زیادہ دنوں تک جھوٹ نہیں بول سکتا۔ لیکن میں نے جھوٹ بولا، میگیل سے جفتی کرنے سے

Scanned with CamScanner

پہلے اندھیرے میں مشت زنی کرتا، لذت اور فرحت کے بغیر سارے عمل سے گزرتا، کبھی اپنے پر ہنستا، خاص طور پر جب اس پر سوار ہوتا؛ میں اس کی پیٹھ پر دو ہنٹر مارتا، اسے یہ اچھا لگتا تھا، سو میں اس سے فائدہ اٹھاتا، پیسے طلب کرتا، جو وہ دے دیتا، اور پھر میں اپنے کو ایک طوائف کے روپ میں دیکھتا، ایک ذاتی جگلو [مرد طوائف]۔ میرے پاس وہ سب تھا جو میں چاہتا تھا، لیکن بعد میں مجھے برا لگتا، میں خود کو مجرم، بددیانت، اور ایک جونک محسوس کرتا، تو میں جان بوجھ کر اسے اکساتا تا کہ غصہ آئے، اور مجھے چلتا کرے — میں اسے سخت برہم کرنے کی کوشش کرتا، بلکہ کر بھی لیتا، اور پھر وہ بڑھیا کارمن اپنی، بدزبانی کے ساتھ مداخلت کرتی! وہ کوئی کسر نہ چھوڑتی، اسے معلوم تھا کہ کیا گل کھل رہے ہیں — وہ چیختی چلاتی، خاص طور پر جب وہ وہاں موجود نہ ہوتا، مجھے ''گلیوں کا غلیظ مور لونڈا'' کہتی، اور ایک دن جب مجھے، ''رنڈی کی اولاد'' کہا، تو ایکدم میرا خون کھول اٹھا، اور اس کو ایسا جھانپڑ مارا کہ ساری عمر یاد رکھے گی... میری ماں پر حملہ کرتی ہے، اُس کی یہ مجال — یہ حق اسے کب پہنچتا تھا! میری بیچاری ماں جس نے اپنے بچوں کے لیے اتنی قربانیاں دی تھیں، ان کی خاطر اسمگلنگ کرنے کے خطرات مول لیے تھے، اور یہ اسے ''رنڈی'' کہہ رہی ہے — میں نے اسی وقت اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا — اس کارمن کا۔ تو میں سمجھ گیا کہ اب یہاں سے نکلنے کا وقت آ گیا ہے، اور میں نکل گیا، لیکن بڑے رکیک انداز میں: میں نے چوری کی، ریشمیں چادریں دھجی دھجی کر دیں، میگیل کے بڑے خوشنما جوتوں پر موت دیا، بلوریں گلدان توڑ پھوڑ ڈالا، تباہی مچادی؛ میں چاہتا تھا کہ ایک سچ مچ کی رنڈی لے آؤں، جو سستی خوشبوؤں میں بسی ہوئی اور میک اپ میں لتھڑی ہوئی ہو، اور میگیل کے بستر میں اس کے ساتھ مجامعت کروں، لیکن یہ نہ کر سکا۔ بس سر جھکائے نکل گیا کیونکہ بڑھیا کا حکم فیصلہ کن تھا اور میں ذہن میں جو کچھ تھا، میگیل سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ جب وہ پیسے سے لدے پھندے یورپی طنجہ، شہر مراکش، اور صویرہ کے غربت زدہ محلوں میں شاپنگ کے لیے آتے تھے تو کس طرح میرا دل چلانے اور ان کو برا بھلا کہنے کو چاہتا تھا؛ مجھے جھینگوں کی افتاد یاد آتی ہے — جھینگے — ہنوز تر و تازہ ننھے ننھے نوخیز لڑکے، جن کے ساتھ یہ یورپی نہ صرف ایک سینڈوچ کے عوض جفتی کرتے یا کرواتے ہیں، بلکہ جھینگوں کو جائز اجرت بھی نہیں دیتے۔ میں کسی باؤلے کی طرح شدید جدوجہد کر رہا تھا، روزی کمانے اور اس سے بڑھ کر ماں کی اچھی دیکھ بھال کرنے کے لیے، جس نے عزت اور آبرو کے ساتھ ہماری پرورش کرنے میں اتنی

تکلیفیں سہی تھیں — کتنی بار وہ باثروت لوگوں کے یہاں شادی بیاہ یا کسی اور تقریب کے موقعے پر کھانا پکانے نہیں گئی تھی، اور جب علی الصباح گھر سے نکلتی اور رات گئے لشتم پشتم لوٹتی تو واجبی سی اجرت اور پلاسٹک کی تھیلی میں تقریب کا بچا کھچا کھانا لیے، گوشت کی کچھ بوٹیاں اور تھوڑی سی تری۔ پھر وہ اسے گرم کر کے ہم سے کہتی، ''کھاؤ، یہ تمھاری ماں کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا ہے، سیر ہو کر کھاؤ، ابھی جو ملتا ہے لے لو، بہتر دنوں کے انتظار میں،'' اور مجھ سے کہتی، ''تم بڑے ہو کر ڈاکٹر بنو گے یا انجینئر، مجھے سفر کراؤ گے، پہلے مکہ، پھر قاہرہ کا — مجھے فرید العطرش[25] اور ام کلثوم کا ملک دیکھنے کا کتنا ارمان ہے، تم مجھے زیور اور گزوں ریشم دلواؤ گے، میں ایک نئی زندگی گزاروں گی، ایک چھوٹی سی بے تاج اور بے بادشاہ کی ملکہ کی طرح۔ لیکن تم ہمیشہ میرے شہزادے رہو گے، سو اسکول میں محنت سے کام کرو، اچھے نمبر لا کر دکھاؤ، اچھے بیٹے بنو، اور میری دعائیں ہمیشہ تمھارے ساتھ ہوں گی۔''

... جو میں نے کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ میں اس کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کر سکا ہوں، اور یہ طوائفی کی لعنت مجھ سے چپکی ہوئی ہے — 'کیفے حافہ' میں میرے سب یار دوست جانتے ہیں کہ میں خالص ذاتی مفاد کی خاطر اس عیسائی کے ساتھ گیا ہوں، کہ میں ہمیشہ عورتوں کے پیچھے لگا رہا ہوں، کہ میں، جیسا کہ کہا جاتا ہے، وہ نہیں ہوں جو لوگ مجھے سمجھتے ہیں، کہ میں کچھ بھی کر کے مراکش سے نکل جانے کو تیار تھا، اور پھر چند ایسے بھی تھے جو میری ریس کرتے تھے، جو بہت چاہتے تھے کہ انھیں بھی کوئی ایسا مل جائے جو انھیں اپنے سامان میں باندھ کر ساتھ لے جائے، بعضے تو خاص عورتوں کے متلاشی تھے، اور کیوں نہیں، وہ بھی تو مردوں کے ساتھ جانے کو تیار تھیں، سب جانتے ہیں، قہوہ خانوں میں اس کا عام ذکر ہوتا ہے، ہماری شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ کوئی اچھی شہرت نہیں — ہوٹل کے دربان ہیں یا ٹیرسوں پر تاک لگائے بیٹھے ہوئے لوگ، جو مرغا دیکھتے ہی فوراً اپنے یاروں کو آگاہ کر دیتے ہیں، اور یہ مرغا عام طور پر ایک خاص عمر کی کوئی عورت ہوتی ہے، بے حساب مالدار، تنہا یا کسی سہیلی کے ساتھ، اکثر بیوہ یا مطلقہ، یا کبھی کبھار، لیکن شاذ و نادر، ہنوز جوان، آزاد، سچی محبت کے لیے تیار، مشرق اور حرم کے خوابوں میں گم، اس کی بابت بار بار دہرائے جانے والے فقروں کی رنگینی میں بے خود۔ شروع شروع میں ہر چیز بڑی آسانی نظر آتی ہے، جفتیاں بڑی

25۔ فرید العطرش (Farid al Atrash): مخلوط مصری شامی پس منظر کا حامل موسیقار، گلوکار، عود نواز اور اداکار۔

Scanned with CamScanner

لذت انگیز ہوتی ہیں، منصوبے بنائے جاتے ہیں، عورت جنسی کیف کی سرشاری سے چکا چوند رہ جاتی ہے، ہر چیز کے لیے تیار، مراکش اور اپنے ننھے منے مراکشی سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، سو وہ سارے اثر ورسوخ استعمال کرتی ہے کہ اسے اپنے ساتھ اپنے ولندیزی یا امریکی شہر لے آئے، اور یہ تو اسے بہت بعد میں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ اسے جُل دیا گیا ہے؛ تب اسے یاس گھیر لیتی ہے، نفرت، ذہنی دباؤ کا اضمحلال، اور ہر اس شے کو دھتکارنا جس کا عربوں سے دور کا بھی تعلق ہو... لیکن اب ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں... میرا عضو استادہ نہیں ہوتا، مجھے سزا مل رہی ہے، میں نے خود کو سزا دی ہے، خود کو یقین دلایا ہے کہ میں جنسی ملاپ کا مستحق نہیں—ایک طرح سے خود اپنے ہاتھوں اپنے اعضا کو مسخ کرنا جو مجھے بڑی اذیت ناک تکلیف پہنچا رہا ہے: میں ایک کونے میں پڑا آہ وزاری کرتا ہوں، آنسو تک نہیں پونچھتا، ان تمام نوجوانوں پر آنسو بہاتا ہوں جو کسی مددگار ہاتھ کی تلاش میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں، اپنے گھر والوں پر جو مایوس ہوں گے اور تسکین دلائے جانے کے محتاج، لیکن میں—مجھے کون تسکین دلائے گا؟ کون مجھے گلے سے لگا کر دوبارہ زندگی کی راہ پر لے آئے گا؟ سانس لینے کے لیے بھی مجھے بڑی سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے، میرا دم گھٹ رہا ہے، لیکن کسی کو پروا نہیں؛ میں دوسروں کو اپنے پاس سے گزرتا ہوا دیکھتا ہوں اور ان پر رشک کرتا ہوں، انھیں زندگی سے سرشار تصور کرتا ہوں، خوب دل کھول کر ہنستے ہوئے، اپنے مستقبل کے منصوبے بناتے ہوئے، گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے، ایک پتھر پر دوسرا پتھر رکھتے ہوئے، گھر تعمیر کرتے ہوئے، پتھر کی طرح مضبوط ہوتے ہوئے، شہوت محسوس کرتے اور اسے نقطۂ اوج پر پہنچاتے ہوئے، جبکہ میں یہاں پڑا ہوں، اور میں کارآمد بننے کی کوشش کرتا ہوں، کسی دوسرے میں قلب ماہیت کی، ایک حقیقی آدمی جو کاذب نہ ہو، سارق نہ ہو، جعلی نہ ہو، لیکن یہ سب کیسے حاصل کروں؟ مجھے مدد کی حاجت ہے: ہوسکتا ہے نیند اچھا علاج ثابت ہو، لیکن یہاں سے چلے جانے کا، اپنے سرکوریت میں دبانے کا مجھے حق نہیں، مجھے بس اس وقت کو ہمیشہ کے لیے بھلا دینے کی ضرورت ہے جب میں نے مراکش چھوڑا تھا—کاش کسی طرح میں اس کے بارے میں سوچنا بند کر سکتا... یہ، یہ یاد، میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کی عکاسی نہیں کرتی، میں چاہوں جتنا تلاش کروں، کچھ بھی تو نہیں ملتا، وہ لمحہ جب کوچ کر رہا تھا اور اپنے عزیز وطن کے نام خط لکھ رہا تھا، بھلایا جا چکا ہے، محو ہو چکا ہے...

Scanned with CamScanner

عازل کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح مراکش سے رخصت کی یاد کو یکسر مٹا دے، اور کسی مبارز کی طرح فاتحانہ گھر لوٹے۔ کیا وہ بذاتِ خود اس دہشت پسندی سے نبرد آزما نہیں ہو رہا تھا جس کا یورپ کو خطرہ لگا ہوا تھا؟ اب اس نے خود کو ٹی وی پر پیش ہوتے ہوئے تصور کیا، اپنے کو ایک اچھے مسلمان کی طرح متعارف کراتے ہوئے جس نے ایک خطرناک پلاٹ کو ناکام بنا دیا تھا۔ ان تمام باتوں نے عازل کے جنسی مسائل کو کونے میں ڈال دیا تھا؛ اس نے اب اپنے عضو کی بابت پریشان ہونا، عورتوں کی طرف دیکھنا اور شہوت بھرے خواب دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک مختلف آدمی بن گیا تھا: جرأت مند، لطیف، اور مضبوط۔ وہ دہشت پسندی کی مخالف پولیس اور تشدد پسند اسلامی تحریکوں کے درمیان جنھوں نے پورے مغرب کو بھسم کرنے کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا، بڑی واضح پھرتی اور سہولت سے حرکت کرنے لگا تھا۔ تاہم اسے معلوم تھا کہ یہ توازن بہت عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا۔ میڈرڈ میں اپنی از حد غیر منظم زندگی کے باعث اسے کسی تازہ انہدام کا مسلسل دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس کے اصل کام کی پردہ پوشی کے لیے پولیس والوں نے اسے ایک بڑے بینک کے قانونی شعبے میں جز وقتی ملازمت دلوا دی تھی؛ وہ بقیہ وقت میں جو کچھ کرتا تھا اس کا علم کسی کو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بالآخر، عازل اپنے کو کارآمد اور باعزت آدمی محسوس کرنے لگا تھا۔ اچھا لباس پہنتا، اعتدال سے پیتا، لیکن کیف کا استعمال نہ چھوڑ سکا، بلکہ یہاں اس بری طرح استعمال کرتا کہ اکثر خود کو بیمار کر لیتا۔ شدید سر درد میں تخفیف ہوتی تو صرف اسپرین، پیرا سیٹا مول اور کوڈین کو ملا کر استعمال کرنے سے۔

جب کئی دن گزر گئے اور اس نے خبر نہ لی تو اس کے رابطے کا پولیس والا بھنا گیا اور جا کر خود ملنے کا فیصلہ کیا۔ دربان نے بتایا کہ اس نے عازل کو گزشتہ دن دو آدمیوں —— ''موروں،'' اس نے اضافہ کیا —— کے ساتھ دیکھا تھا۔ پولیس والا مسلسل عازل کی گھنٹی بجاتا رہا، لیکن کوئی دروازے پر نمودار نہیں ہوا۔ سو اس نے تقویت پہنچانے والی نفری بلا کر دروازہ توڑ دینے کو کہا۔

عازل فرش پر پڑا تھا۔ اخوان نے اسے عید الکبیر کی بھیڑ کی طرح ذبح کر کے رکھ دیا تھا۔

Scanned with CamScanner

# 39

## کنزہ

انتظار۔ کنزہ نے اپنی ساری عمر انتظار میں بتا دی تھی۔ اس نے بے کیفی کے سارے اسرار چھان مارے تھے، کیونکہ انتظار کرنا اکتاہٹ کے بحرِ بیکراں میں چھلانگ لگانا ہے۔ یہ، بالفاظ دیگر، عمر کے بڑھتے جانے کی طرح ہے — مستقبل کو بند ہوتے دیکھنا، رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہوتے جانا، آئندہ کی توقعات سے تہی ہونا۔ کاش وہ اتنا ہی جانتی کہ اسے کس چیز کا انتظار تھا... ہر چند کہ کنزہ اپنی زندگی بغیر بہت زیادہ ٹھسا دکھائے کسی نہ کسی طرح گزارتی رہی تھی، ماں اس قسم کی باتیں زبان پر لانے سے باز نہ رہتی:

"ہاں، یہ بتاؤ، آخر دوسری عورتیں کیسے اتنی کامیاب رہتی ہیں، اچھے گھرانے کا شوہر تلاش کر ہی لیتی ہیں، جس کی مالی کامیابی کے آثار خوش آئند ہوتے ہیں، ایک حسین وجمیل، باعزت آدمی؟ اپنے کو دیکھو: تم میں کیا کمی ہے؟ ہر طرح سے خوبصورت ہو، تعلیم کی وجہ سے کلینک میں کام کرنے کے قابل ہو، دیانتدار اور راست باز گھرانے سے ہو جو مالدار نہ سہی، نادار بھی نہیں۔ تو بتاؤ، کسی مرد سے ملنے کے لیے تمھیں آخر کاہے کا انتظار ہے؟ میں تمھارا انتظار کر رہی ہوں — کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب میں یہ دعا نہ کرتی ہوں کہ تمھاری کسی مرد سے ملاقات ہو جائے، میں دعا کرتی ہوں اور خدا سے کہتی ہوں کہ میری حالت، میری عمر، اور میری امیدوں کا خیال کرے..."

اس قسم کی ملامتیں سن سن کر کنزہ کے کان پک گئے تھے۔ بس، وہ بدقسمت تھی۔ اس میں اس گر کی کمی تھی جس کے باعث اس کی شادی شدہ سہیلیاں ہر صورت حال سے نمٹ لیتی تھیں، جو اسے ترجیح دیتی تھیں کہ اپنے شوہروں کی جنسی دغابازیوں کو توجہ میں نہ لائیں۔ کم از کم ان کا گھر تو تھا۔

مراکش چھوڑنے سے پہلے ایک بار کنزہ نے شادی سے متعلق ریڈیو طنجہ کے ایک پروگرام میں شمولیت کی جرأت تک کر ڈالی تھی۔ میزبان نے پچیس سے پینتیس سال کی چار نا کتخدا لڑکیوں کو جمع کیا تھا، اور ان کو متعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ پچیس سال ہو جائیں تو عورت کو واقعی پریشانی لاحق ہو

جانی چاہیے۔ ٹھیک ابھی ابھی کنزہ تیس سال کی ہوئی تھی اور برسوں پہلے اپنی بکارت کھو چکی تھی۔ وہ اس خیال کی حمایت کرنا چاہتی تھی کہ عورت غیر شادی شدہ اور خوش بھی رہ سکتی ہے، آزاد اور ایماندار، محبوب اور باعزت۔ اسے انکار تھا تو شوہر کا نہیں بلکہ محبت کا۔ اس کا محبت اور دونوں جنسوں کے درمیان تعلق کا نظریہ، خاص طور پر ایک دلکش ملک میں، جیسے اس کا اپنا ملک، بہت ارفع تھا، اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ توہمات پال رہی ہے، وہ اپنی جستجو میں ثابت قدم رہی: محبت کی تلاش —— سچی محبت، حقیقی اور اخلاص سے بھرپور، غلبہ آور محبت، اور ایک بار، صرف ایک بار، ان پرشکوہ لمحات کا تجربہ کرنے کی آرزومند جو اس کی پسندیدہ فلموں اور ناولوں میں اتنے اثر انگیز انداز میں پیش کیے جاتے تھے۔ اسے خاص طور پر دی الیگزینڈریا کوارٹیٹ یاد آیا جو فلسفے کے پروفیسر نے اسے پڑھنے کے لیے دیا تھا: گون ود دی ونڈ اور دی لیڈی اوف دی کمیلیا نے بھی اس پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ یہ وہ نگارشات تھیں جن سے اس نے اس چیز کا بے کم و کاست تصور قائم کیا تھا جو اسے دیوانگی کی حد تک مسرت بخش سکتی تھی۔ اور اسی طرح اسے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ اس نوع کی محبت اسے مراکش میں نہیں مل سکتی، اس لیے نہیں کہ مراکشی مرد ایسے جذبات سے عاری تھے، بلکہ اس لیے کہ عادی زندگی اور لوگوں کی آرا بالآخر سچی محبت کا دم گھونٹ کر رکھ دیں گی۔

اس نے حماموں میں مراکش کے بارے میں بہت کچھ جانا تھا، جو سماجیات کے ماہرین، نفسیاتی تجزیہ کرنے والوں، تاریخ دانوں، ناول نگاروں، حتیٰ کہ شاعروں کے لیے بھی مثالی جگہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہاں، نہاتے ہوئے، عورتیں اپنی باتوں میں سب کچھ عیاں کر دیتی ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا 'دیوان' ہے، ٹیکسیوں کی طرح کی ایک مشترکہ جگہ، جہاں ہر کسی کو آزادی سے بولنے کا حق ہوتا ہے، اپنے رازوں میں دوسروں کو شریک کرنے کا، شکوے شکایات کرنے کا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عورتیں صدیوں سے آنسو بہاتی رہی ہیں اور ان حقائق سے پردہ کشائی کرتی رہی ہیں جنھیں باہر کی دنیا سننے کی خواہشمند ہے نہ دیکھنے کی۔ یہی وہ مامن ہے جہاں درزن خدیجہ نے یہ بتانے کی جرأت کی تھی کہ کس طرح اس نے اپنے شوہر کو ان کے گھر میں کام کرنے والی نوعمر لڑکی کو خراب کرتے ہوئے پکڑا تھا، ایک پیاری سی باصلاحیت تیرہ سالہ لڑکی۔ اس کا شوہر چوری چھپے لڑکی کے کمرے میں جا گھستا اور اس میں پیچھے سے داخل ہوتا تاکہ بکارت ضائع نہ ہو، اور اس جرم کی سزا کے طور پر، خدیجہ نے اسے

Scanned with CamScanner

پورے ایک ماہ تک انسولین سے محروم رکھا تھا، جس کے باعث وہ تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ اور یہ حمام ہی تھا جہاں کنزہ نے سعدیہ کی واردات سنی تھی، جس پر اس کے پرانے گھر میں بسے ہوئے جن سوار ہو گئے تھے: وہ جوں ہی دیا جلاتی، ایک غیر مرئی ہاتھ اسے بجھا دیتا۔ سعدیہ ملک کے سارے مرابط سے واقف تھی اور صرف وہی کہتی جو اس پر سوار جن کہلواتے۔ اور حمام ہی میں کنزہ کے ہاتھ وہ معجزاتی نسخہ آیا تھا جس کے استعمال سے مرد کی پوری رجولیت بحال ہو جاتی تھی۔ کم از کم تین عورتوں نے تصدیق کی تھی کہ اس کے استعمال سے ان کے شوہروں میں تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ اور یہیں اس نے یہ بھی سنا تھا کہ افریقی حاملہ عورتیں چوری چھپے جوکھم سے بھرا سمندر اس امید میں عبور کرتیں کہ اگر پکڑی گئیں تو پولیس والے رحم کھا کر انھیں سرزمین اسپین پر بچہ جننے دیں گے۔

اس نے حمام میں مراکش کو اسی طرح سیکھا تھا جس طرح آدمی کوئی اجنبی یا مانوس زبان سیکھتا ہے۔ مثلاً، خاموشیاں، ان کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ وطن میں اگر عورتیں خاموش رہتی تھیں تو اس لیے نہیں کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس لیے کہ جو وہ کہنا چاہتی تھیں کم ہی ایسے تھے جو اسے سننے یا سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اب کنزہ کا یہ تھا کہ وہ ان عورتوں پر توجہ دیتی تھی جو اپنے مشورے پر خود عمل بھی کرتی تھیں۔ عورتیں اپنے درمیان جس قسم کی انگھڑ زبان استعمال کرتی تھیں وہ کنزہ کے لیے بڑی حیرت انگیز دریافت تھی: وہ کھلم کھلا جنسی اعضا کی باتیں کرتیں اور باتوں کے ساتھ ساتھ فحش اشارے بھی، شرم و حیا سے بالکل تہی، گویا سب کی سب بالآخر مکمل آزادی میں شریک ہوں۔ اگر ان کے بس میں ہوتا کہ اپنی ساری زندگی حمام میں گزار دیں تو انھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ حمام عورتوں کی اقلیم بن گیا ہوتا، جہاں وہ مردوں کو طلب کرتیں، تاکہ انھیں ہڑپ کر جائیں، بالکل جس طرح وہ چاہتی ہوں، اور بعد میں انھیں ان کی بے مزہ زندگی میں لوٹا دیں جو، ناگزیراً، بزدلی اور چھوٹی بڑی مفاہمتوں سے بھری تھی، ایک سماجی ڈھرا جہاں دکھاوے کا مقصد طبعاً بقیہ تمام اشیا کی نقاب پوشی تھا۔ ایک وسیع و عریض حمام کا عورتوں کے شہر کے طور پر تصور کریں، جہاں نیم تاریکی میں غبار جیسے پردے پڑے ہوں، ایسی فضا جو آزادی اور اپنے رازعیاں کرنے کے لیے موزوں ہوتی ہے، اور کوٹھڑیوں کے پھیلے ہوئے خفیہ سلسلے، کلال خانے، چور دروازے، ڈیوڑھیاں، جہاں جنسیت آخرکار آزاد ہو گی، شرم و حیا اور اخلاقی فیصلوں کے شکنجوں سے رہا۔ یہاں عورتیں معاشرے کے

Scanned with CamScanner

تعلقات، یا کم از کم مرد و زن کے تعلقات کے اقرار کے لیے جمع ہوں گی۔ یہ چھوٹا سا پر لطف انقلاب ہوگا! ''بیوی، کہاں چلیں؟'' شوہر چلّائے گا۔ ''حمام جا رہی ہوں، خاص تمھارے لیے نہانے، بھنووں سے بال اکھیڑنے، خوشبوئیں لگانے، تا کہ آج رات صرف تمھارے لیے خود کو وقف کروں، جو چاہوں تمھارے ساتھ کروں!'' شوہر شکایت کریں گے، ''ہیں، پھر حمام!'' — اور ان کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ ہوگا کہ کن نعمتوں سے محروم ہو رہے ہیں: ہاں، بیچارے شوہرو، تمھیں کچھ سمجھ نہیں آتا، لیکن تمھیں کچھ اتا پتا نہیں ملے گا، کبھی معلوم نہ ہوگا کہ وہاں کیا ہوتا ہے، جہاں عورتیں شوہروں اور بچوں کی مداخلت سے مامون چند گھنٹے ساتھ گزارنے کے لیے جمع ہونے کی اتنی شوقین ہوتی ہیں۔ ''لعنت ہو ایسی جگہ پر جہاں سے مردوں کو بے دخل کر دیا گیا ہے!'' شوہر واویلا مچائیں گے۔ ''ہم مرد جب حمام جاتے ہیں، تو ہم وہاں ٹلے نہیں مارتے، اٹکے نہیں رہتے۔ نہائے دھوئے، اور بس کام پر چل دیے۔''

تو اس طرح کنزہ نے اپنی تعلیم مارشان کے حمام میں حاصل کی۔ لیکن یہ اس کے باقی وقت انتظار میں گزارنے میں حارج نہیں ہوئی، انتظار، کچھ اور انتظار۔ پھر جبرئیل فرشتہ نازل ہوا: میکیل، وہ دوست جس کی آڑے وقتوں میں ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو اپنے ساتھ نظم اور بدنظمی دونوں لایا۔ نادانستہ، وہ اس کے گھرانے کی زندگی مخدوش حد تک تباہ کر دینے والا تھا، لیکن کوئی اس پر کبھی اس کی مذمت نہیں کرے گا۔ اپنے بھائی کے برعکس، کنزہ میکیل کی ممنون تھی۔ وہ اپنے خود کو تباہ کر دینے والے توہمات کا ذمے دار اسے نہیں سمجھتی تھی۔ اس جلتے ہوئے زخم کی سوزش وہ ایک طویل عرصے سے اپنے اندر محسوس کرتی رہی تھی، میکیل کے نمودار ہونے کے بہت پہلے سے: انتظار کا زخم، بیزاری، اور مستقبل جس کا آئینہ چکنا چور ہو چکا تھا۔

کنزہ سکون کے عالم میں غنودہ ہو گئی تھی: ریڈیو پر ہلکی پھلکی سی موسیقی آ رہی تھی۔ اسے آواز سنائی دی، جیسے خواب میں: ''شاہ مُرد؛ شاہ زندہ باد!'' پھر ایک چیخ، اور اس کے بعد تحسین کے نعرے، اور پھر: ''حسن ثانی اب پر سکون نیند سو رہے ہیں؛ خدا ان کے فرزند پر اپنی برکتیں نازل کرے!'' پیکر اس کے ذہن سے ڈگمگاتے ہوئے گزرنے لگے: سفید پوش مرد و عورت جو کسی دریا میں ڈبکی لگا رہے تھے، پھر روشنی میں نہائے ہوئے وسیع و عریض سبزہ زار میں نماز پڑھنے جا رہے تھے۔ کوئی بھی آنسو

Scanned with CamScanner

نہیں بہار رہا تھا۔ بچے چاروں سمت ''شاہ زندہ باد!'' چلاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔

لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ اٹھتے ہوئے اسے بڑی عمیق خوشحالی کا نامانوس احساس ہوا، بلکہ اس کا جی چاہا کہ خود بھی ''شاہ زندہ باد!'' کا نعرہ لگائے۔ غسلخانے کے آئینے میں جاکر دیکھا تو اس میں ایک دمکتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ یہ اس کا چہرہ تھا۔ وہ پر مسرت تھی، اور اس نے اس ناگہانی سرخوشی کی وجہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ سر پر ٹھنڈے پانی کو بہنے دیا، لیکن بال خشک نہ کرنے کا فیصلہ کیا: اسے پانی کا بالوں سے سینے اور شانوں پر ٹپ ٹپ گرنا بھلا لگا۔ وہ اکیلی تھی، اور کسی دوسرے کی حاجت مند نہیں تھی۔ بعد میں اس شام، اس نے شاہ کے جنازے کی نشرِ مکرر کو دیکھا، جس کے بعد وہ مناظر جن میں لوگ ایک جوان آدمی کے سامنے حلفِ وفاداری اٹھا رہے ہیں جو حاکم خاندان کی صدیوں پرانی روایت کو جاری رکھنے کے فرض سے بہت متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

بس تبھی کنزہ کو خیال آیا کہ بالآخر مراکش واپس گھر لوٹنے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔

# 40

## واپسی

اِدھر کئی دنوں سے ان میں کے چند پہلے سے حرکت میں آچکے ہیں،، سمندر عبور کرنے کی سرکش خواہش کی قیادت میں کہیں دور چلے جانے کے لیے۔ وہ مسلسل چلتے رہتے ہیں، شہر پار کرتے ہیں، کپکپی طاری کر دینے والے سرد خرابے، جنگل، کھیت۔ وہ دن رات چلے ہی جاتے ہیں، ایک ناقابلِ گمان طاقت اتنی تندی سے انھیں دھکیلے جا رہی ہے کہ تھکن تو کیا، بھوک پیاس کا احساس تک نہیں ہو رہا۔ گھر لوٹتی ہوئی ہواؤں کے بل پر وہ کوئی سوال کیے بغیر آگے بڑھتے جاتے ہیں، اس پر غور کیے بغیر کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ قسمت وہیں ہے، اس چلنے میں، جو انھیں ان کی جڑوں کی طرف واپس لے جا رہا ہے، ان کی پیدائشی سرزمین کی طرف، ایک قسمت جو انھیں ایک طرح کا فرمان نظر آتی ہے، ایک غیر متنازعہ حکم، ایک وقت جو وقت سے باہر ہے، پہاڑ کی چوٹی پر چڑھائی، ایک

Scanned with CamScanner

شاندار امید، ایک چمکتا ہوا خواب، وہ بڑھے چلے جا رہے ہیں، افق کے اوپر۔ وہ سڑک پر چل رہے ہیں، سر بلند کیے، ایک گرم سانس ان کے پیچھے: آزادی کی ہوا۔ انھیں احساس ہوتا ہے کہ یہی لمحہ ہے، یہی ساعت ہے۔ یہ ان کا موسم ہے، موسم جو صرف انھی کا ہے، کسی دوسرے کا نہیں، ان سب کا جنھوں نے تکلیفیں اٹھائی ہیں، جنھیں زندگی میں اپنا مقام نہیں مل سکا ہے۔ بغیر ادنیٰ سے پچھتاوے کے وہ ہر چیز پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور ابھی سے بھول چکے ہیں کہ گھر چھوڑا کیوں تھا۔ وہ بندرگاہ کی طرف رواں ہیں، جہاں ایک مانوس باطنی آواز ان سے کہتی ہے کہ "توتیا" نام کی کشتی پر جا سوار ہوں، ایک واجبی سی کشتی جس پر کپتان نے ایک پھول دینے والا درخت لگا رکھا ہے جس کی خوشبو بڑی شیریں ہے، نارنج یا لیموں کا درخت۔

کپتان کسی اور عہد کا آدمی ہے، ایک نوع کا طرحدار آدمی، جس کے گل مچھے ہیں اور نفاست سے تراشیدہ ڈاڑھی۔ جسم نحیف و نزار، اور بھوری، بادامی شکل کی آنکھوں والی ایک خوش وضع جوان عورت اس کی مددگار ہے۔ اس گندم گوں عورت کے لمبے لمبے بھورے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ کچھ لوگ مدعی ہیں کہ یہ ایک کاؤنٹس ہے؛ بعض کے خیال میں برازیل کی کوئی فیشن ماڈل؛ کچھ اور خیال کرتے ہیں کہ یہ کپتان کی بیوی ہے، کیونکہ وہ اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ یہاں نوواردمسافروں کا کشادہ پیشانی سے استقبال کرنے کے لیے ہے۔ پیشانی اور ٹھوڑی پر ٹیٹو کے نشان چمک رہے ہیں، وہ دایاں ہاتھ کپتان کے شانے پر رکھتی ہے، جو اسے "ملکوتی توتیا" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ اور وہ کپتان کے اشارے پر ایک اندلسی عرب گیت بڑی صاف وشفاف اور سچی آواز میں گانے لگتی ہے؛ گیت بڑے دلگیر ناسٹلجیا سے لبریز ہے، اور اس کی آواز جذبات کی شدت سے ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔ توتیا آنکھیں موند لیتی ہے اور اپنے پورے دل سے گاتی ہے۔ ہر متنفس، چاہے عرشے پر، چاہے کشتی پر کہیں اور، اسے سننے کے لیے خاموشی سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

وہ چھوٹی چھوٹی منتشر ٹولیوں کی شکل میں وارد ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں فخر کی دمک ہے: یہ جو انھوں نے ابھی ابھی پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے وہ محض ایک فرض ہی نہیں تھا، بلکہ ایک ضرورت بھی۔ ان میں سے کچھ تھکن سے نڈھال ہو گئے ہیں؛ کوئی سنگین بات نہیں، ذرا سی جوڑوں کی اکڑن ہی تو ہے۔

Scanned with CamScanner

وسطِ گرما کی تمازت میں یہ جلاوطنی کی برودت، یہ موذی ٹھٹھرن، جو آپ پر حملہ آور ہوتی ہے: آپ کھڑے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دائیں ٹانگ ڈھے گئی ہے، تو یونہی ہوتا ہے، کون جانے کیوں؛ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ عمر کا تقاضا ہے، لیکن وہ سچ نہیں کہہ رہا تھا: دماغ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے لیکن جسم اب ساتھ دینے سے عاجز۔ اس کی یہ جرأت کہ مجھ سے یہ کہے، اس حال میں کہ میں ان سڑکوں پر طویل مدتوں سے سرگرداں پھرتا رہا ہوں؟— لیکن مجھے نظر آرہا ہے کہ وہ اس روگ سے مانوس نہیں ہے جو ہمیں خاموشی سے اذیت پہنچاتا ہے... چلو اس کے لیے یہ اچھا ہی ہے: فی الوقت میں بالکل بھلا چنگا ہوں، مجھے معلوم نہیں کہ کون ہوں، لیکن اپنے کو چاق و چوبند محسوس کر رہا ہوں، ڈاکٹر کی رائے کے برخلاف۔ میں نے اپنا نام کھو دیا ہے، لوگ کہتے ہیں میرا چہرہ نہیں رہا— عجیب بات ہے، لوگ اتنے کمینے بھی ہو سکتے ہیں — اور میرا جوڑوں کا درد بھی غائب ہو گیا ہے۔ یہ کشتی مانوس اور اجنبی دونوں ہی لگتی ہے: شاید یہ کشتی نہیں، صرف کشتی کا مجسمہ ہی ہے، کوئی فریبِ نظر، ایک صورتِ محض جس کا عکس پانی پر ڈالا جا رہا ہو؛ یہ پہلی بار ہے کہ میں ایسی کشتی پر سوار ہوا ہوں جس کی منزل سے بے خبر ہوں، جو بڑی دل آویز بات ہے، سچ... میں موجوں پر اس دن تک بہتا چلا جاؤں گا جب سورج آخری بار نکلے گا، اس لمحے تک جب روح کا مالک اپنا حق واپس لینے آجائے گا، اور جہاں تک میرا تعلق ہے، میں تیار ہوں، میں تو ایک زمانے سے تیار ہوں، ٹھیک اس دن سے جب ماں نے سکھایا تھا کہ رخصتِ عظیم کا خوف کیسا، واقعی قابلِ خوف چیزیں تو صرف بیماری اور انسانوں کی کمینگی ہے۔ ایک پَر پہلے نیچے غوطہ لگائے گا اور تمھیں اپنی آغوش میں بھر لے گا تاکہ تمھیں آسمانوں میں لے جائے، موت یہی ہے، ایک خواب جس میں دکھوں کا اور وجود نہیں ہوتا۔

میگیل چھتری پکڑے چل رہا ہے۔ وہ ابھی تک بڑی زیبا پوشاک پہنے ہوئے ہے، لیکن اس کے چہرے پر پژمردگی کی چھوٹ پڑ رہی ہے اور بیماری کے نشان ہیں؛ وہ تن تنہا خاموشی سے آگے بڑھتا ہے۔ وہ بھی بلاوے کا جواب دے رہا ہے۔ اسے کس نے پیش آگاہ کیا ہے؟ اس مہم کے بارے میں بتایا ہے؟ اس نے گھر چھوڑنے سے پہلے اپنے سارے معاملات نظم و ضبط سے سلجھا لیے ہیں۔ اس نے اتنی جزرسی سے جو کچھ تیار کیا ہے اس کا کسی کو علم نہیں۔ ہر چیز اس خط میں تفصیل سے درج کر دی گئی ہے

Scanned with CamScanner

جو وہ کارمن اور گبریئل کے لیے چھوڑے جا رہا ہے۔

چند دنوں میں، شاید چند ہفتوں میں، میں رخصت ہو رہا ہوں گا۔ مہربانی کریں اور میرے حال پر آنسو نہ بہائیں: مجھ پر یہ اعتراف لازم ہے کہ مجھے مسرت میسر آئی ہے، اور زندگی میں مشکل لمحے آئے ہیں، ساتھ ساتھ غیر معمولی خوشیاں بھی۔ آج مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے، میں اس دنیا سے مطمئن جا رہا ہوں، دل پر کوئی بوجھ نہیں۔ تم سے صرف ایک بات کا ملتجی ہوں: کسی کو اس بیماری کا علم نہ ہو جو مجھے فنا کر رہی ہے اور ایک دن میرا خاتمہ کر دے گی۔ میں تمھارے احساسِ ذمے داری، محبت، اور دوستی پر بھروسا رکھتا ہوں کہ میری رخصت بھی اتنی ہی حسین اور شاندار ہو جتنی میری زندگی تھی۔ حزم واحتیاط، مبالغے سے گریز، وقار، فیاضی: یہی میری تمنا ہے۔ مجھے شور وشغب اور زحمت دینا پسند نہیں۔ وہ دن جب مجھے احساس ہوگا کہ میرا وقت آ گیا ہے، میں برونکائٹس کی شکایت کے ساتھ ہسپتال میں داخل ہو جاؤں گا اور وہیں اپنے بستر میں آنکھ بند کر لوں گا۔ تمھیں اطلاع کر دی جائے گی، اور آ کر مجھے لے جانا، چاہے آدھی رات ہی کیوں نہ ہو۔ کچھ بھی ہو جائے، مجھے مردہ خانے میں نہ رکھنا، یہ نہیں کہ مجھے اس کی یخ بستہ فضا سے ڈر لگتا ہے، بلکہ یہ ایک غلیظ اور بے کیف مقام ہوتا ہے، اور تم مجھے فوراً گھر لے آنا، میرے پرانے گھر، اور وہاں میرے پڑوسی لحسین [الحسین] سے کہنا، جو بڑا مذہبی آدمی اور دیانت داری کی روح ہے، کہ آ کر میرے جسم کو تیار کرے۔ اس کے بعد تم پھول خریدنا، فاس کے بازار کے سارے پھول: انھیں ہر جگہ سجا دینا، صندل جلانا، اور تم چاہے جو بھی کرو، کاہن کو مت بلانا: یاد رکھنا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ آخراً، میرے سارے دوستوں کو بلا کر ان کی طعام وشراب سے تواضع کرنا۔

میں نے قبر کی جگہ پہلے سے خرید رکھی ہے، جو مجاہدین کے قبرستان میں ہے، داخلے کے بعد بائیں طرف سو قبروں کے بعد: یہ مقام اونچائی پر ایک پیڑ کے نیچے ہے جہاں سے شہر نظر آتا ہے اور پہاڑ، سمندر اور قدیم طنجہ کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ مجھے مسلمانوں کے قبرستان پسند آتے ہیں، یہ دوسرے مذاہب کے منظم قبرستانوں کے مقابلے میں کم افسردہ کن ہوتے ہیں، بہت سادہ سے، انکسار آمیز، اور کھلے کھلے: زندگی ان پر بڑی شاندار ضوفشانی کرتی ہے۔ میں ٹھیٹھ مذہبی آدمی نہیں ہوں، تم جانتے ہو،

Scanned with CamScanner

لیکن میں مذاہب کا احترام کرتا ہوں۔ جب مجھے قبر میں اتار دیا جائے (میں تابوت نہیں چاہتا، صرف کفن)، تو تم وہ دعائیں پڑھنا جو تم نے مجھ سے اپنی محبت کے باعث منتخب کی ہوں، اور ہو سکے تو چند تصوفانہ نظمیں۔ اس کے بعد، ایک دوسرے سے الوداع کہنے کا وقت آجائے گا۔

جہاں تک میری املاک کا تعلق ہے، میرا وکیل، مسٹر گارسیا، تمھیں باخبر رکھے گا۔ ایک اور بات: میں گبریئل سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ میرے بچوں حلیم اور حلیمہ کی تعلیم کی نگرانی کرے۔ اسے معلوم ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں اور اسے صرف میری خواہشات کے مطابق ہی عمل کرنا ہے۔ باقی رہی کنزہ، تو وہ پکا اطمینان کر لے کہ اسے اس کا جائز ورثہ ملے۔

میٹیل کسی سہارے کے بغیر کشتی میں سوار ہوتا ہے، کپتان کو سلام کرتا ہے، تو تیا کے ہاتھ پر بوسہ دیتا ہے، اور درخت کے نیچے ایک دستے والے صوفے پر آرام کرنے چلا جاتا ہے۔ یہاں اسے ایک آواز اپنے سے سرگوشی کرتی ہوئی سنائی دیتی ہے:

تم اُس دنیا میں ہو جہاں وہ تمام ہیجانی جذبے جن کا زور ٹوٹ چکا ہو، عظیم محبت کا اختصاص اختیار کر لیتے ہیں جو ہنوز اندھیرے میں ان پھولوں کے ساتھ درخشاں ہوتی ہے جو تمھیں اس قدر عزیز تھے، پھول جو زندگی کے حامل ہیں، زندگی جو یادوں سے چھلک رہی ہے۔

کنزہ اکیلی پہنچتی ہے۔ اتنی تاباں، سفید کپڑوں میں ملبوس، بال نیچے گرے ہوئے، اور وہ کسی سے بات نہیں کرتی، پھر بھی مسرور اور پرسکون دکھائی دیتی ہے۔ وقت اپنا کام کر چکا ہے؛ بہار اپنے زرِگل کا کچھ سفوف چھوڑ کر جا چکی ہے۔ کنزہ کی زندگی تہہ و بالا ہو گئی ہے، اور کچھ یادیں پیڑ سے پھلوں کی طرح جھڑ چکی ہیں۔ کچھ خوشگوار یادیں، کچھ سوگوار۔ اس میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ انھیں چھانٹ سکے۔ انھیں منظم اور مرتب کرنے کے لیے بہت وقت ہوگا۔ اسے اب کوئی تشویش نہیں رہی اور وہ خود کو مطمئن محسوس کرتی ہے، اتنی ہی لطیف جتنی اپنی پہلی ماہواری کے دن، جب وہ سڑکوں سے یوں بھاگتی ہوئی گزری تھی جیسے ابابیل کی طرح محوِ پرواز ہو۔ آج صبح بھی اسے بالکل وہی احساس ہوا تھا۔ یہ کتنا بھلا تھا: جسم کا بدلنا، اپنے اور دنیا اور اس کی بدبختیوں کے درمیان کچھ فاصلہ رکھنا، اُس جاں گسل حزن کے

Scanned with CamScanner

ماورا جانا اور سوتے میں شرم وحیا سے بے دم نہ ہو جانا۔ کنزہ بڑے سکون کے ساتھ کشتی پر چڑھتی ہے؛ بحری عملے کا ایک آدمی اسے ایک خوشگوار کیبن تک پہنچاتا ہے۔ اس کیبن سے سمندر کا منظر نظر آتا ہے، وہ بتاتا ہے، اور یہ ڈولفنیں، جو ہماری پاسبانی کرتی ہوئی ساتھ ساتھ چلتی ہیں — بلا کی ذہین ہیں، یہ آپس میں گفتگو کرتی ہیں اور ہم ان کی بات سمجھ لیتے ہیں۔ یہ تمھارا سواگت کرنے آئیں گی، لیکن اگر کبھی کبھار شارک مچھلیاں انھیں دور بھگا دیں اور کچھ دور تک ہمارے برابر برابر تیرتی چلیں تو پریشان مت ہونا۔ اب آرام کرو؛ اور ہاں، یہ دیکھو، چائے سے بھری تھرمس رکھی ہے، اور کچھ بسکٹ۔ کنزہ بڑی تیزی سے گہری نیند سو جاتی ہے، مسرور کہ دوبارہ گھر جا رہی ہے۔ تو تیا اس پر جھک کر اس کے سرد چہرے کو دھیرے دھیرے تھپکیاں دیتی ہے۔ پھر پیشانی چومتی ہے اور توشک اڑھا کر شانوں کے گرد اڑس دیتی ہے۔

سمیہ، حسینہ، وہ عورت جو مردوں کی ہر بات پر یقین کر لیتی تھی، جو بے جھجک خود کو پوری طرح ان کے سپرد کر دیتی تھی، سمیہ، جو موت کے منھ میں جا چکی تھی لیکن واپس نکل آئی تھی، کشتی پر آتی ہے، سرتاپا ڈھکی ہوئی۔ کوئی اس سے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ ریف کی دہقان عورتوں کا سفید حیک پہنے ہے جو اس کے پورے جسم کو ڈھانپے ہوے ہے، وہ جسم جسے پچھلے چند سالوں نے اس کی ساری کشش انگیزیوں سے محروم کر دیا ہے۔ وہ خود اپنی کشتہ ہے، اور بلاوے کے جواب میں وہ بھی کشتی پر آ پہنچی ہے۔ سمیہ کوئی مسلمان سسٹر نہیں بن گئی ہے؛ اگر اس نے اپنا چہرہ ڈھک رکھا ہے تو یہ اسے چھپانے کے لیے ہے: دائیں رخسار پر زخموں کے نشان ہیں، اور اس کے کچھ دانت بھی جھڑ گئے ہیں۔ کوئی پوچھتا ہے تو کہتی ہے کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ "ہاں، بڑا بھیانک تصادم، طلیطلہ اور میڈرڈ کے درمیان سڑک پر، وہ پاگلوں کی طرح گاڑی چلا رہا تھا، بے تحاشا پیے ہوے تھا، سامنے سے آتا ہوا ٹرک ٹھیک ہم سے ٹکرا گیا اور مجھے بس اتنا ہی یاد ہے؛ بعد میں جب ہوش آیا، میں نے آئینہ دیکھا اور میری چیخ نکل گئی۔ مسخ . . . بیمہ کمپنی نے کچھ رقم دے دی، اور ڈاکٹر بولا، 'گھر واپس جاؤ، طریفہ میں ایک کشتی تمھاری منتظر ہے، تم دیکھو گی، اس پر سوار ہونے والی تم تنہا نہیں ہو گی: یہ ایک جادوئی کشتی ہے، اور اس پر تمھیں زندگی بڑی حسین نظر آئے گی، تمھارے لیے سورج ہمیشہ چمکتا رہے گا، سو جاؤ، میری

Scanned with CamScanner

واماندہ حسینہ۔' میں نانی کا حیک اوڑھ کر چل دی؛ یہ اس کا کفن بننے والا تھا، لیکن جب مکہ میں اس کا انتقال ہوا تو مجھے ورثے میں مل گیا؛ مصری روئی، بے حد نرم، بے حد مضبوط، اور کمال یہ کہ میں کسی کو نظر نہیں آئی، میں اس کفن میں غائب ہو سکتی ہوں، یہ پولیس کے ہاتھوں پریشان ہوئے یا ان کی باز پرس کیے بغیر ملک سے گزر جانے کے لیے لاجواب تھا، سو میں نے نانی کو اس بات پر دعا دی کہ اس نے اچھی عقل استعمال کی اور مکہ میں مری۔ لوگوں نے بتایا کہ جس جگہ شیطان پر کنکریاں برسائی جاتی ہیں وہاں جم غفیر کی دھکم پیل میں اس کا دم گھٹ کر رہ گیا تھا؛ لگتا ہے ایسا اکثر ہوتا ہے، لوگ بے قابو ہو جاتے ہیں، ناتواں لوگوں اور بوڑھوں کو روند ڈالتے ہیں . . . لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں موت آئے تو آدمی سیدھا جنت بھیج دیا جاتا ہے! رہی میں، تو میں مرنا نہیں چاہتی، میں تو ابھی جوان ہوں، میں گھر بار شروع کرنا چاہتی ہوں، میرے بچے ہوں اور انھیں کہانیاں سناؤں . . . ''

جب پسینے میں شرابور فلوبیئر وارد ہوتا ہے تو کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ وہ اس خوف سے بھاگتا ہوا آیا ہے کہ کہیں کشتی نہ چھوٹ جائے۔ دراز قد اور دبلا پتلا، اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں، ایک پل نچلا کھڑا نہیں رہ سکتا، اور خوب زور زور سے بول رہا ہے۔ ''جس دن مجھے پتا چلا کہ طریفہ میں واپسی کی کشتی انتظار میں ہے، میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر روانہ ہو گیا۔ یہاں پہنچنے میں پورا ہفتہ لگا۔ دوڑتے ہوئے آنا پڑا، اس میں میرا وزن چند پاؤنڈ گھٹ گیا ہے، لیکن میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ہاں، تو ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کوئی جواب کیوں نہیں دیتا؟'' وہ کسی مانوس چہرے کی تلاش میں نظریں دوڑاتا ہے۔ ہر شخص اپنی نجی دنیا میں گم ہے۔ اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں، سوائے اس کے کہ جو کچھ لوگ کر رہے ہیں خود بھی کرے۔ تاہم فلوبیئر کو خیال آتا ہے: ''اگر یہ کشتی صرف ایک من گھڑت ہی ہو تو . . . ایک ناول جسے پانی پر پھیلا دیا گیا ہو، بوتل کی شکل میں ایک کتاب جسے ان تمام آہ و زاری کرتی ہوئی ماؤں نے سمندر میں پھینکا ہو جو راہ تکتے تکتے بیزار ہو گئی ہوں؟ اگر میں درست خیال کر رہا ہوں، تو اب بالآخر سمجھ میں آ رہا ہے کہ میرے والدین نے میرا نام فلوبیئر کیوں رکھا تھا۔ تو اب مجھے اتنا ہی کرنا ہے کہ ناول میں داخل ہو جاؤں۔ لیکن ایک فکشنی کردار کیسے بنا جاتا ہے؟ محبت اور جنگ کی کہانی کے صفحوں کے درمیان چپ چپاتے داخل ہو کر اس کے سب سے مزیدار باب میں جاگرفتہ ہونے کا

Scanned with CamScanner

کیا طریقہ ہے؟ مادام بووادی — اس میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی، پہلے ہی سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے، پھر یہ بھی کہ کہانی میں کوئی سیاہ فام سرے سے ہے ہی نہیں... چھپنے کی جگہ کہاں تلاش کروں؟ خیر، گون وِدَ وِنڈ کہیں گئی نہیں، لیکن اس میں کون ہونا چاہے گا؟ اگر مجھے یہ مل جائے، میرا مطلب ہے ایسا ناول جس میں میں ایک کردار بن سکوں، تو مجھے مزید کام کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی: میری ذمے داری ناول نگار کے سر ہوگی، مجھے کوئی کردار خود ہی سونپ دے گا، کہانی میں جما دے گا، مجھے زندہ رکھے گا، مجھ سے محبت کروائے گا، چیخیں لگوائے گا، اور آخر میں مار دے گا، چونکہ اسے معلوم نہیں ہوگا کہ کہانی کو اور کیسے ختم کرے۔ لیکن میں مرنا نہیں چاہتا، کاغذی کردار کی حیثیت سے بھی نہیں؛ میں نہیں چاہتا کہ جلا دیا یا لگدی بنا دیا جاؤں، ایسا بہت ہوتا ہے، ایسی کتابوں کے ساتھ جنھیں قاری نہیں ملتے اور انھیں کاغذ بنانے کی فیکٹری بھیج دیا جاتا ہے یا کارڈ بورڈ کے ڈبے بنانے کے لیے تارتار کر کے 'پاپیے ماشے' تیار کیا جاتا ہے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں! میرا کردار، جسے ہزاروں جلدوں میں ضرب دیا گیا ہو، صرف اس لیے کہ اسے کچومر نکال دینے والی مشین میں ڈال دیا جائے جو یہاں میری کھوپڑی کے پرخچے اڑا رہی ہے، وہاں میرے خصیے دبا رہی ہے، اور اب پیروں کی باری ہے، الغرض مجھے کاغذ کی کروڑوں ننھی دھجیوں میں مزید تقسیم کرنے میں محض چند منٹ ہی لگتے ہیں: میں اور میرا انجام کن فیتی (confetti) کی شکل میں نکلے! یا لکھنے کے کاغذ یا فلمی پوسٹر حتیٰ کہ ٹوائلٹ پیپر کی شکل میں! نہیں جناب، بھول جائیے۔ یہ کہیں بہتر ہوگا کہ کسی رزمیہ ناول میں جگہ تلاش کروں جو ابھی لکھا جا رہا ہو، اور اس کے اہم کرداروں میں چپکے سے شامل ہو جاؤں — جیسے کسی میوزیم کا دربان — اور ہیروئن اور اس کے عاشق کے درمیان جو عشقیہ معاملات ہو رہے ہیں ان کا مشاہدہ کروں، یا پھر کوئی ڈپلومیٹ جس کی بیوی اس کی ٹوہ لگا رہی ہو اور خود شوہر کی ڈپلومیٹک کور کے سربراہ کا بستر گرما رہی ہو... اچھا، اگر میں اس انگریز عورت سے پوچھوں جس کی نوشتہ کتاب ان دنوں ہر کوئی پڑھ رہا ہے، یہ ایک جادوئی کردار کے بارے میں ہے — ہاں، وہی موصوف، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس کی کتاب لیرے لیرے کرنے والی مشین کا لقمہ بنے! یہ ناول مجھے راس آئے گا؛ لیکن چکر یہ ہے، یہ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے، سو اس کا نیا قالب کیسے پیدا ہو سکتا ہے جس میں جا سماؤں؟ کیوں نہ اسے پڑھنے سے ابتدا کروں؟ اس کشتی پر کسی نہ کسی کے پاس تو ہوگا ہی، کروڑوں کا بیاں بکی تھیں، مجھے یقین

Scanned with CamScanner

ہے کہ چوہوں کے کسی نہ کسی بل میں کڑی سردیوں کے موسم کے لیے رکھا ہوگا، یقیناً — چوہے گرمیوں میں آنے والی طویل سرد راتوں کے لیے ذخیرہ اندوزی کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم انسانوں سے اتنا ہی فرق ہے کہ چوہے پڑھتے نہیں، بس کاغذ کترتے ہیں تاکہ روشنائی میں جذب سارے وٹامن چوس لیں، یہی میرے رشتے کے بھائی ایمیل زولا نے ایک دن بتایا تھا جو دو والا کا کتاب دار ہے۔ اب کہ اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی ناول کا کردار بن جانا ہی میرے لیے بہترین نسخہ ہے۔ رِندہ میں جو میرے رشتے کے بھائی وغیرہ ہیں انھیں یقین نہیں آئے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ جلاوطنی کی دہشت ناکیوں نے میرا دماغ کھسکا دیا ہے۔ میں انھیں چپکے چپکے ہنستا ہوا صاف دیکھ سکتا ہوں۔ 'فلوبیئر؟ ہو ہو، ہاں! بھاگ نکلا! عین اس دنیا سے! اسے فکشن کے کام میں فکشنی کام مل گیا ہے! وہ کتابوں میں کدکڑے مارتا پھرتا ہے، ان اوراق میں سوتا ہے جنھیں خوشبوؤں میں بسی عورتیں پڑھنے کے لیے بڑی نزاکت سے کھولتی ہیں۔ آیا سمجھ میں! سارا دن کسی شاندار عورت کے جھولے میں پڑا سوتا رہتا ہے، ہر جگہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے، اس وقت بھی جب نہا رہی ہو: وہ اسے پڑھتی ہے، اور یہ اس کی نظر بازی کرتا ہے، اپنے ہونٹ چاٹتا ہے، اور ایک ہم ہیں کہ یہاں بیٹھے حیران ہو رہے ہیں کہ ورثے کی بابت کیا کریں، کیونکہ اس ٹون ٹائن کا سر درد ابھی باقی ہے ... کیا زبردست آدمی ہے، یہ فلوبیئر — اس نے حقیقت سے آنکھیں نہ چار کرنے کا راستہ تلاش کر لیا، ہاں، 'حقیقی' حقیقت، جو ہم سے گوند کی طرح چپکی ہوئی ہے، اور تکلیف پہنچا رہی ہے۔ اور وہ، وہ تو تجربے کار لومڑی ہے، اپنا کام نکال لیا، لائبریری کی شیلف پر بڑی شان سے بیٹھا اپنی جستجو میں بڑھتے ہوئے ہاتھ کا منتظر، جو اسے کھولے، اس کے ورق الٹائے، اور پھر واپس اپنی جگہ لوٹا دے کیونکہ اس ناول میں کوئی جنس ونس نہیں، کوئی شہوت انگیز چیز نہیں، لے دے کر سیاست بھری ہے جس سے کسی کو مشکل ہی سے دلچسپی ہوگی، کم از کم ہم نے سنا تو یہی ہے ...'''

اور اب یہ فلوبیئر کی باری ہے کہ لیموں کے درخت کے برابر اپنے لیے تھوڑی سی جگہ تلاش کر لے، جہاں اس کی بھینی بھینی مہک کی لوریوں پر وہ کسی بچے کی طرح نیند میں ڈوب جاتا ہے۔ لیموں کے غنچے بس چند لمحوں میں اپنی خوشبو کے دوش پر اسے فاس کی ٹیرسوں پر اٹھا لاتے ہیں، اس قدیم شہر میں جہاں عورتیں ترنج اور یاسمین کے خوشبودار پھول بڑی بڑی سفید چادروں پر سکھانے کے

Scanned with CamScanner

لیے پھیلا دیتی ہیں، جس کے بعد بھاپ دکھا کر ان سے وہ روغن نکالا جاتا ہے جس سے نفیس ترین عطر بنائے جاتے ہیں۔

❁

کپتان بڑی سی بید کی آرام کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ پائپ پی رہا ہے اور ایک پرانا اخبار پڑھ رہا ہے جس میں نارمنڈی میں فوجوں کے اترنے کی رپورٹ پیش کی گئی ہے۔ تو تیا اسے ٹھنڈک پہنچانے اور مکھیوں کو دور رکھنے کے لیے اشبیلیہ کا بنا ہوا پنکھا جھل رہی ہے۔ گاہے گاہے وہ ایک نوع کے مقدس پانی چھڑکنے کے برش سے اس پر عرقِ گلاب کے چھینٹے دیتی جاتی ہے۔ وہ کبھی اخبار سے سر اٹھاتا بھی ہے تو صرف نو واردوں کا حساب رکھنے کے لیے۔ جیسے ہی مقررہ پچیس مسافر سوار ہو جائیں گے، کشتی لنگر اٹھا دے گی؛ تین ہنوز لا پتا ہیں۔ اچانک ایک گیم شحیم شخص آ پہنچتا ہے اور اس کا مدعی ہے کہ اس کا نام ایس پانزا (S. Panza) ہے۔ تو تیا سے مشورہ کرنے کے بعد، کپتان اس شخص سے اس کے آقا، دون کیہوتے، کے بارے میں پوچھتا ہے۔ ''وہ آ رہا ہے، وہ آ رہا ہے، کپتان؛ سرحدی پولیس نے اسے روک لیا تھا کیونکہ اس کے سفری کاغذات قاعدے کے حساب سے درست نہیں تھے — سچ پوچھیں تو اس کے پاس کاغذات سرے سے ہیں ہی نہیں! اس پر یہ کہ کسٹم والوں نے اس کی تلوار بھی ضبط کر لی جس کا وہ بے حد دلدادہ ہے۔ تو، آپ سمجھیں، معاملہ کچھ پیچیدہ ہو گیا ہے . . . لیکن فکر نہ کریں، وہ کوئی ترکیب لڑا کر وہاں سے گلوخلاصی کی راہ نکال ہی لے گا۔''

کپتان دنگ رہ گیا ہے۔ ''تو گویا تمھارا آقا یوں سفر کرتا ہے جیسے یہ سولھویں صدی ہے، بلا پاسپورٹ، بلا پروانہ راہداری۔ لیکن وہ کیا سمجھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور تم — آخر تم کس طرح کھسک لیے؟''

''میں نے ان سے کہا کہ آپ کو خبر کر کے آتا ہوں کہ میرے آقا کو دیر لگے گی۔''

فلوبیئر، جو اپنی ایک آنکھ ہمیشہ کھلی رکھتا ہے، پانزا کے قدموں کی آہٹ سن کر جاگ اٹھتا ہے۔

''فلوبیئر، آپ کی خدمت کے لیے حاضر!''

''براہ کرم، کھڑے ہونے کی زحمت نہ کریں،'' پانزا معذرت کرتا ہے۔ ''بس مجھے اتنا بتائیں

کہ کشتی پر سوار ہونے کے لیے آپ نے کون سی دستاویزی شہادتیں پیش کی ہیں۔"

"دستاویزی شہادتیں؟ میرا نام فلوبیئر ہے، بس، اتنا ہی کافی ہے۔ کاغذات وغیرہ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔ ہم تقدیر کے مہمان ہیں۔ تو دستاویزات کس کام کی؟ جاؤ، جا کر اپنے آقا کو لے آؤ، کہنا فلوبیئر انتظار کر رہا ہے، آنکھ چوکنی کیے ثابت قدم کھڑا ہے، اس کے ہوش حواس قائم ہیں، سر ٹھیک کندھوں پر جما ہے، اور سب سے بڑھ کر — کھلے سمندر کے جوکھم پر نکلنے کے لیے چاق و چوبند ہے!"

کپتان زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتا اور پائپ پینا جاری رکھتا ہے اور اپنی باوا آدم کے زمانے کی دوربین سے گاہے گاہے افق کا جائزہ لے لیتا ہے۔ فلوبیئر تو تیا سے اس کا پنکھا عاریتاً مانگتا ہے۔ وہ جواب نہیں دیتی۔ جب دون کیہوتے — کم از کم وہ مدعی ہے کہ یہی اس کا نام ہے — نمودار ہوتا ہے، کپتان مستعدی سے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"خوش آمدید، موں سینیور! ہم لنگر اٹھانے کے لیے صرف آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ کی خواہش ہمارا حکم ہے۔"

"آپ کا شکریہ، جناب! تاہم مجھے یقین ہے کہ ابھی ایک نفر کم ہے، یا بلکہ، میں کہوں گا، ایک ممتاز شخصیت۔ اس کشتی کا تصور خاص اس مشن کے لیے کیا گیا تھا، اور اس میں ٹھیک بیس اور پانچ مسافروں کی گنجائش رکھی گئی تھی؛ جب تک سب نہیں آ جاتے، یہ ہلنے کی نہیں۔"

کپتان اپنی فہرستوں پر نظر ڈال کر تائید کرتا ہے۔

"تو چلیے، آخری لمحے میں وارد ہونے والوں کا انتظار کریں۔"

چند گھنٹے بعد، جب سورج دھیرج کے ساتھ افق سے نیچے پھسل رہا تھا، مسافروں کو دو آدمی فوجی لباس میں نمودار ہوتے ہوئے نظر آئے۔ یہ اپنے درمیان ایک بہت بڑا کریٹ اٹھائے ہوئے تھے جو بالکل تابوت جیسا دکھائی دیتا تھا۔ یہ انھوں نے عرشے پر رکھ دیا، اور پیچھے ایک بھی نظر ڈالے بغیر لوٹ لیے۔ جلد ہی، ایک آدمی — یا بلکہ، درخت — آگے بڑھتا ہے اور کریٹ کے گرد چکر لگانے لگتا ہے۔ اس کی چھال میں تراشے ہوئے سوراخ سے ایک چہرہ نظر آ رہا ہے، اور تنے سے دو لچکدار بازو باہر

نکلے ہوئے ہیں۔ جب یہ درخت-آدمی (یا درخت میں رہنے والا آدمی) کشتی میں سوار ہونے کی کوشش کرتا ہے، ساحلی پولیس کے دو افسر اسے روکنے کے لیے پھرتی سے آگے بڑھتے ہیں۔

''ہالٹ، او، تم! کیا سمجھتے ہو کہ کہاں ہو؟ چڑیا گھر میں؟ سرکس میں؟ تمھارے کاغذات کہاں ہیں؟''

درخت سرسراتا ہے، اور ہلا کر اپنی پتیاں برسانے لگتا ہے جو ابھی تک ہری ہیں: کئی ملکوں کے شناختی کارڈ، ہر رنگ کے کارڈ، پاسپورٹ، انتظامی دستاویزات، اور کسی نامعلوم زبان میں لکھی ہوئی کسی کتاب کے چند صفحے۔ یکبارگی، ان صفحوں سے ہزارہا سلیبل (syllables) نکل کر اڑتے ہوئے افسروں کے چہروں پر جا لگتے ہیں اور انھیں اندھا کر دیتے ہیں۔ پھر یہ ہجّی کے ارکان مجتمع ہو کر ایک بینر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس پر لکھا ہے: ''آزادی، یہی ہمارا کام ہے''۔ افسروں کو نظرانداز کر کے درخت کشتی پر چڑھ جاتا ہے اور آ کر دون کیہوتے کے برابر کھڑا ہو جاتا ہے، جس سے کپتان دبی زبان میں اس شخصیت کی شناخت کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

''کس کی؟ وہ جو درخت میں ہے یا وہ جو تابوت میں ہے؟''

''جو درخت میں ہے۔ میرے آدمی تابوت کشتی پر لے آئیں گے۔ یہ پہنچنے پر اربابِ اختیار کے حوالے کرنا ہے، لیکن چونکہ میرے پاس زمان کا کوئی تصور نہیں، بلکہ مکان کا بھی، میں کسی قسم کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ سو بتاؤ، اس بھروپ میں کون چھپا بیٹھا ہے؟''

''یہ اپنے کو 'موحا' کہتا ہے، لیکن اس کے بارے میں آدمی کسی بات کا یقین نہیں کر سکتا۔ یہ وہ مہاجر ہے جس کا کوئی نام نہیں! یہ وہ ہے جو میں کبھی تھا، جو تمھارا باپ تھا، جو تمھارا بیٹا بھی ہوگا، اور، بہت پہلے، وہ آدمی بھی جو محمد نبی تھا، کیونکہ ہم سب کو اپنا گھر چھوڑنے کا اذن ہے، ہم سب کو کھلے پانیوں کا یہ مدھر بلاوا سنائی دیتا ہے، سمندر کی یہ طلب، دور سے آنے والی صدائیں جن کا مسکن خود ہماری ذات ہے، اور ہم سبھوں کو اپنی پیدائشی سرزمین چھوڑنے کی حاجت محسوس ہوتی ہے، کیونکہ ہمارا ملک اکثر کافی امیر، کافی بامحبت، یا کافی فراخدل نہیں ہوتا کہ ہمیں اپنے گھروں میں رہنے دے۔ سو چلو، رخصت ہوں، چلو اس وقت تک بہتے جائیں جب تک کہیں بھی ایک بھی آدمی کی روح میں رتی بھر روشنی کی ٹمٹماہٹ باقی ہے، اب چاہے یہ بھلی روح ہو یا کوئی گمشدہ روح جس پر بدی کا آسیب سوار ہو:

Scanned with CamScanner

ہم اس اساسی چنگاری کا تعاقب کریں گے، چاہے یہ کتنا ہی ڈگمگائے، کتنی ہی کمزور ہو، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس دنیا کی خوبصورتی ابھرے، وہ خوبصورتی جو دنیا کے سارے دکھ درد اور غم و اندوہ کا خاتمہ کردے گی۔

❁❁

(طنجہ اور پیرس، ستمبر 2004 تا نومبر 2005)

Scanned with CamScanner

جعفر زٹلی

# زٹل نامہ

## (کلیات)

## مرتب: رشید حسن خان

قیمت: 300 روپے

اردو زبان اور ادب کے تاریخ نگاروں نے دو بڑی غلط فہمیوں کو رائج کر رکھا ہے؛ ایک یہ کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا، اور دوسری یہ کہ شروع ہی سے غزل اردو شاعری کا اصل سرمایہ رہی ہے۔ جعفر زٹلی اور ولی دکنی کا تعلق ایک ہی زمانے سے ہے، اور زٹل نامہ کے عنوان سے جعفر کا دیوان ولی کے دہلی آنے سے برسوں پہلے مرتب کیا جا چکا تھا۔ جعفر کے کلیات میں ایک بھی غزل نہیں۔ اس طرح یہ بات مسلّم ہو جاتی ہے کہ دہلی میں اردو کی شعری روایت کی بنیاد رکھنے والوں میں جعفر کو اولیت حاصل ہے، اور یہ بھی کہ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے نہیں، سماجی حقیقت نگاری سے معمور شاعری سے ہوا جو سرتاسر نظموں پر مشتمل ہے۔

جعفر زٹلی کا کلام ایک طرف شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی پہلی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے، اور دوسری طرف سماجی مسائل و مشکلات کے پُرزور اور پُرشور بیان کے لحاظ سے وہ اردو کا اولین شاعر ہے جس نے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے۔ کلامِ جعفر کی یہ بڑی اہمیت ہے کہ اس کی بنیاد پر اردو زبان اس پر فخر کر سکتی ہے کہ شروع ہی سے اردو شاعری میں سماجی مسائل و مشکلات کا بے لاگ بیان موضوعِ سخن کے طور پر ملتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے لہجے میں بے باکی ہے اور کھردراپن۔ جعفر اس روایت کا بنیاد گزار ہے۔ بگڑتے ہوئے سیاسی حالات، بیکاری، بدنظمی، افلاس، ان سب کے ہلکے گہرے بیانات اس کی شاعری میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ وہ بااقتدار افراد جن کے نکمے پن کے نتیجے میں یہ حالات پیدا ہو رہے تھے، ان کا نام لے کر ان کو اس کا ذمے دار کہنا، یہ صاف گوئی اور بے باکی بھی اس شاعری کا حصہ رہی ہے۔ وہ زمانہ مطلق العنان شخصی حکومت کا تھا، آج کل جیسی جمہوریت کا نہیں تھا، اُس زمانے میں واقعتاً بات پر زبان کٹتی تھی؛ ایسے زمانے میں یہ بے باک بلند گفتاری داد کے قابل ہے۔ دورِ اول کی اس روایت نے، جس کا سب سے بڑا نمائندہ جعفر ہے، ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ اس کے اثر سے لسانی سطح پر اُس کھردرے پن نے فروغ پایا جس کے بغیر احتجاجی شاعری سرسبز نہیں ہو پاتی؛ لہجے کے بھاری پن کو برقرار رکھا، پُرشور لفظیات کا ذخیرہ فراہم کیا، بیان کو ریشمی پن سے محفوظ رکھا اور اُس آہنگ کی تشکیل کی جو رومانیت سے دور ہے۔

جعفر زٹلی کا کلام شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی ابتدائی شکل صورت کو پیش کرتا ہے۔ اس میں 'ریختہ' کی ابتدائی مثالیں محفوظ ہیں اور لفظیات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جس کو ادب، زبان، لغت اور لسانیات کا کوئی سنجیدہ طالب علم نظرانداز نہیں کر سکتا۔

Scanned with CamScanner

افضال احمد سید

# ناظم حکمت کے ساتھ ساڑھے تین سال

(ایک کتاب کا تعارف)

تلاشی پر اس کے پاس سے گورکی کی ایک کتاب، مارکسی مضامین پر مشتمل کچھ اخباری تراشے اور ناظم حکمت (Nâzım Hikmet) کے نام لکھی ہوئی ایک نظم نکلی۔ اورحان کمال (Orhan Kemal)[1] کی مخبری اس کے ہم جماعت، انقرہ کی ملٹری اکیڈیمی کے طالب علموں نے کی تھی۔ ایک غیر ملکی طاقت کے نظریات پھیلانے اور بغاوت پر اکسانے کے جرم پر اسے پانچ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ یہ سنہ 1939 کی بات ہے۔

اسے برسہ[2] جیل بھیجا گیا، جہاں کچھ دنوں بعد اسے اطلاع ملی کہ ناظم حکمت کو چانکیری[3] جیل سے برسہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ ناظم کو اگست 1938 میں بری اور بحری افواج کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے الگ الگ مقدموں میں اٹھائیس سال کی قید کی سزا ملی تھی۔ یہ مقدمہ ایک بحری جہاز میں قائم کی گئی عدالت میں چلا تھا۔ ناظم نے رہائی کے بعد پابلو نرودا کو اس کی روداد سنائی تھی جو نرودا نے اپنی یادداشتیں میں درج کی ہے۔ حکومت خاص طور پر اس کی طویل نظم ''شیخ بدرالدین کا رزمیہ''، جو پندرھویں صدی میں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف کسانوں کی بغاوت پر ہے، خوفزدہ تھی۔ ناظم اس سے پہلے بھی 1933 میں غیر قانونی پوسٹر لگانے کے جرم میں سزا پا چکا تھا۔

اورحان کمال کو برسہ جیل میں ناظم حکمت کو انتہائی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ دونوں ایک

Scanned with CamScanner

ہی کوٹھری میں مقید تھے۔ اور حان کی یادداشتوں میں سے کچھ یہاں پیش ہیں۔

ناظم کو اپنی بیوی خدیجہ ذکیہ پیرائیندہ (Hatice Zekiye Pirayende)[4] اور دوست کمال طاہر[5] کی کفالت کی فکر تھی۔ اس کی اپنی ذات کے لیے اس کی ماں کی طرف سے بھجوائی جانے والی رقم کافی تھی۔ ایک دن ان کے وارڈ کے قیدی ارتوگل نے، جسے جیب کترنے کے جرم میں سات سال کی سزا ہوئی تھی، اطلاع دی کہ رہائی کے قریب ایک قیدی کے پاس کچھ کرگھے برائے فروخت ہیں۔ ناظم اور اس کے دوستوں نے انھیں خرید لیا اور جیل میں کپڑے بننے کا کام شروع کیا۔ اپنی یافت سے ناظم خدیجہ اور کمال کو باقاعدگی سے رقم بھجواتا رہا۔

خدیجہ سال میں دو تین بار ناظم سے ملنے آتی۔ وہ برسہ میں ایک رات ہوٹل میں ٹھہرتی اور دوسرے دن ملاقات کے بعد چلی جایا کرتی تھی۔ ایک بار خدیجہ نے برسہ پہنچ کر ٹیلیفون پر ناظم کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ اس نے اس ہوٹل کا نام بھی بتایا جہاں وہ رکی تھی۔ ناظم نے اس ہوٹل کو نامناسب قرار دیا اور اسے کہا کہ وہاں سے منتقل ہو جائے۔ خدیجہ ہوٹل کے حق میں دلیلیں دینے لگی۔ ناظم سختی سے اپنی بات پر قائم رہا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر وہ ہوٹل نہیں چھوڑ سکتی تو صبح اس سے ملنے کی زحمت نہ کرے۔ خدیجہ نے بھی ضد میں کہا کہ وہ ہوٹل نہیں بدلے گی اور اس سے ملے بغیر چلی جائے گی۔ مگر دوسرے دن وہ علی الصباح ہی جیل پہنچ گئی۔ ناظم ملاقات کو بالکل آمادہ نہیں تھا۔ اور حان اور دوسرے دوستوں نے کسی نہ کسی طرح اسے ملنے کے لیے بھیجا۔ خدیجہ سے ملتے ہی ناظم اپنی ناراضگی کو بھول گیا۔

ناظم کی ماں ایک مصور تھی۔ اس کا ملاقات کو آنا قیدیوں کے لیے ایک دلچسپ تقریب ہوتی۔ ہر بار وہ ناظم کو سامنے بٹھا کر اس کا اسکیچ بناتی اور تماشائی اسے اسکیچ بناتا دیکھتے۔ ناظم خود بھی اسکیچ بناتا تھا۔ جب وہ جیل کے قیدیوں کے اپنے بنائے ہوئے اسکیچز اپنی ماں کو دکھاتا، وہ اس کی مصورانہ صلاحیتوں کا خوب مذاق اڑاتی۔

اورحان کمال نے دو مختصر باب ''خرگوش'' اور ''اسٹرابری'' کے عنوان سے قائم کیے ہیں۔

اورحان کو دیگر چند قیدیوں کے ساتھ مزدور کی حیثیت سے مضافات میں ایک سڑک بنانے کے کام پر لے جایا جاتا تھا۔ ایک دن اس کے پاس ایک لڑکا خرگوش بیچنے آیا۔ اورحان کو خیال آیا کہ ناظم خرگوش پا

کر بہت خوش ہوگا۔ اس نے پچاس قرش میں وہ خرگوش خرید لیا۔ خرگوش دیکھتے ہی ناظم نے لپک کر اسے اس کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ کافی دنوں تک ناظم کی ساری توجہ بس خرگوش پر رہی۔ جب خدیجہ آئی تو اس نے وہ خرگوش ناظم سے لے لیا اور ناظم پھر سے اپنی نظموں اور مصوری کی طرف لوٹ آیا۔

اسٹرابری کا قصہ یوں ہے کہ ایک دن کسی نے ناظم کو اسٹرابری کی ٹوکری تحفے میں بھجوائی۔ اس نے انھیں اہتمام کے ساتھ کھانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک وارڈ کی خوشامد کر کے آئسنگ شوگر منگوائی گئی اور ابھی انھوں نے کھانے کے لیے چمچہ اٹھایا ہی تھا کہ ناظم کو ایڈمن آفس میں طلب کر لیا گیا۔

ناظم کو لوگوں کی مدد کر کے بہت خوشی ہوتی تھی۔ وہ قیدیوں کو قرضے دیا کرتا، اکثر خود دوسروں سے مانگ کر؛ یہاں تک کہ کچھ وارڈرز بھی اس کے مقروض تھے۔ بہت سے قیدی حمام یا دندان ساز کے پاس یا بڑے اسپتال میں ایکسرے کے لیے جانا چاہتے تھے، جو در اصل قید خانے سے کچھ دیر کے لیے باہر نکلنے کا بہانہ ہوتا تھا۔ اس کے لیے انھیں ڈاکٹر یا پراسیکیوٹر یا قید خانے کے گورنر کی اجازت درکار ہوتی تھی، مگر ان حکام کے سامنے پیش ہونے کے خیال سے ان کی ہمت جواب دے جاتی۔ تب وہ ناظم کے پاس آتے اور ناظم ان کے لیے اجازت نامہ لے آتا۔

ناظم کی آمد سے پہلے تک اورحان خود کو برسہ جیل کا ملک الشعرا سمجھتا تھا۔ وہاں دو قیدی شاعر اور تھے: عزت اور نجاتی۔ اورحان ان سے بہتر شاعر تھا۔ اس نے ناظم کو اپنی نظمیں سنائیں۔ نظمیں ناظم کو متوجہ نہیں کر سکیں۔ اس نے اورحان کو اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کا مشورہ دیا اور اسے فرانسیسی سکھانے کی پیشکش کی۔ جیل میں بہت دنوں تک اورحان ناظم سے فرانسیسی کے سبق لیتا رہا۔ ناظم تینوں شاعروں کو کبھی کبھی شاعری سے متعلق اپنے نظریات سے بھی آگاہ کرتا تھا۔ ایک دن اس نے انھیں ایک نظم دی اور اس کی لائنوں کی ترتیب بدل کر اسے ایک بہتر نظم کی شکل دینے کو کہا۔ اس امتحان میں اورحان کی کوشش نے تفوق حاصل کیا۔

اورحان کی ادبی زندگی کا سب سے اہم واقعہ ایک دن جیل کے میدان میں پیش آیا۔ اس نے ناظم کو دوڑتے ہوئے اپنے پاس آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں اورحان کے ایک ناول کے ابتدائی صفحات تھے۔ ''یہ تم نے لکھا ہے؟'' اس نے پوچھا، اور اورحان کے اعتراف کے بعد اس نے کہا، ''تمھیں نثر لکھنی چاہیے۔'' اور اس نے نثر لکھی: چھبیس ناول، اٹھارہ افسانوں کے مجموعے، دو ڈرامے،

Scanned with CamScanner

دو جلدوں پر مشتمل اپنی یادداشتیں اور متعدد فلموں کے اسکرپٹ۔

26 ستمبر 1943 کو اورحان رہا ہو گیا۔ ناظم کو 1950 میں جمہوری حکومت نے عام معافی کے تحت آزاد کیا۔

برسہ میں اسیری کے دوران ناظم نے شعر کہنا جاری رکھا تھا۔ یہاں اسے میرے ملک کا انسانی منظر نامہ کا مواد ملا جو نظم کی شکل میں ایک رزمیہ ناول ہے۔ اس نظم میں بیان کیے گئے کئی کردار وہ ہیں جو برسہ میں اس کے ساتھ مقید تھے۔

اورحان کی ناظم سے 1943 کے بعد 1951 میں استنبول میں ملاقات ہوئی۔ یہ آخری ملاقات تھی۔ ناظم ترکِ وطن کر کے روس چلا گیا جہاں ماسکو میں دل کا دورہ پڑنے سے 1963 میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی وصیت تھی کہ اسے اناطولیہ میں کہیں بھی صنوبروں کے سائے میں دفن کیا جائے۔ اس کے پسماندگان میں سے کسی نے حکومتِ روس سے اس کے جسدِ خاکی کو ترکی بھجوانے کی درخواست نہیں کی۔

اورحان کو زندگی میں ایک بار پھر قید و بند کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ 9 مارچ 1966 کو استنبول کے ایک ریستوران میں خفیہ دفتر قائم کر کے کمیونسٹ نظریات کو فروغ دینے کے الزام پر گرفتار ہوا۔ 13 اپریل کو عدالت نے اسے اور شریک ملزموں کو رہا کر دیا۔ اس مقدمے میں استغاثہ نے سب سے اہم ثبوت کے طور پر اورحان کمال کی 1965 میں شائع شدہ ایک کتاب پیش کی تھی۔ کتاب کا نام تھا: ناظم حکمت کے ساتھ ساڑھے تین سال۔[6]

## حواشی

[1] اورحان کمال (1919-1970) کا اصل نام محمد رشید اوعوتچو (Mehmet Raşit Öğütçü) تھا۔ وہ ادنہ میں پیدا ہوا۔ اس کے والد عبدالقادر کمالی بیگ ترکی کی پہلی قومی اسمبلی کے رکن تھے۔ سیاسی اختلافات کی وجہ سے انھیں 1930 میں اپنے خاندان کے ساتھ جلاوطن ہونا پڑا۔ ان کا قیام شام اور لبنان میں رہا۔ اورحان کمال اپنی ثانوی تعلیم مکمل نہیں کر سکا۔ ترکی لوٹنے کے بعد اس نے مزدوری اور معمولی ملازمتیں کیں۔ 1937 میں اس کی شادی ایک یوگوسلاوی پناہ گزین لڑکی سے ہوئی۔ 1939 میں اسے پانچ سال قید کی سزا

ہوئی۔ 1943 میں رہائی کے بعد وہ مختلف شہروں میں رہا اور مختلف پیشے اختیار کیے۔ انتقال صوفیہ (بلغاریہ) میں ہوا۔ وہ استنبول میں دفن ہے۔

2 برسہ استنبول سے 116 کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب میں بحیرۂ مرمرہ کی دوسری طرف واقع ہے۔ گرم پانی کے چشموں کی وجہ سے یہ ایک صحت افزا مقام ہے۔ ان دنوں آٹو موبائل انڈسٹری کا مرکز ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہی دولتِ عثمانیہ کا پہلا دار السلطنت تھا۔ 1975 سے برسہ اور ملتان جڑواں شہر قرار دیے گئے ہیں۔

3 جانکیری (Cankiri) وسطی اناطولیہ میں انقرہ سے شمال مغرب میں 131 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

4 ناظم کی پانچ بیویوں میں سے تیسری۔ ناظم نے اپنی قید کے دوران اسے طلاق دے دی تھی۔

5 کمال طاہر (1910-1973) ترکی کا مشہور ناول نگار۔ ناظم حکمت کا قریبی دوست تھا۔ جانکیری جیل میں دونوں ایک ہی کوٹھری میں تھے۔ ناظم کو برسہ بھیج دیا گیا۔ کمال طاہر جانکیری جیل میں ہی تھا۔ ترکی میں قیدیوں کو اپنے مصارف خود برداشت کرنے پڑتے تھے۔

6 انگریزی میں بنگیسو بونا (Bengisu Bona) کا ترجمہ *In Jail with Nazim Hikmet* کے عنوان سے 2012 میں ایورسٹ پبلی کیشنز استنبول سے شائع ہوا۔

❄

# شاعرلر پارک

میرا سر بلبلے بناتا ہوا بادل، میرے اندر اور باہر سمندر
میں اخروٹ کا درخت ہوں گل خانے پارک میں
ایک بوڑھا اخروٹ کا درخت، گرہ در گرہ، ریشہ بہ ریشہ
یہ نہ تمھیں پتا ہے اور نہ پولیس کو

Scanned with CamScanner

یہ ناظم حکمت کی نظم ''اخروٹ کا درخت'' کا ابتدائی بند ہے۔ شاعر نے یہ نظم اسیری کے دوران لکھی تھی۔ نہ جانے کتنی شامیں اس نے گل حانے میں گل گشت کی ہوگی۔ اس باغ کا حق تھا کہ زنداں میں اسے یاد کیا جائے۔

گل حانے — یہ نام بھی کسی شاعر نے دیا ہوگا، توپ کاپی کے شاہی محل کے احاطے میں واقع چنار، شاہ بلوط، نارون، جنگلی ناشپاتیوں اور دوسرے بہت سے درختوں سے گھرے اس قطعۂ زمین کو جونشیب میں باسفورس تک پھیلا ہوا ہے۔

اسی تاریخی علاقے سلطان احمد میں، توپ کاپی محل سے کچھ فاصلے پر، ہیوڈرم کی مغربی سمت میں ایک پارک محمد عاکف ارسوئے (Mohamet Akif Arsoy)(1873-1936) سے منسوب ہے۔ ارسوئے دوممالک کے قومی ترانوں کا خالق ہے: ترکی اور شمالی قبرص۔ ترکی کا قومی ترانہ ''استقلال مارچ'' اس طرح شروع ہوتا ہے:

ڈرومت! یہ سرخ پرچم جو سربلندی میں ان صبحوں پر لہرا رہا ہے
کبھی نیچا نہیں ہوگا
میں ازل سے آزاد تھا اور ابد تک رہوں گا

ترکی کے مختلف شہروں میں مشاہیر کی یاد میں تعلیمی ادارے، میوزیم، ثقافتی مراکز اور پارک بنائے گئے ہیں۔ ان مشاہیر میں شاعر بھی شامل ہیں۔ اہم شاہراہوں پر ان کے مجسمے نصب ہیں اور بہت سی شاہراہوں کے نام بھی ان کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ ڈاک کے یادگاری ٹکٹوں اور کرنسی نوٹوں پر ان کی تصاویر آئی ہیں۔ مگر ایک ساتھ دس شاعروں کو خراج تحسین صرف ایک جگہ پیش کیا گیا ہے، اور وہ ہے استنبول کا ''شاعرلر پارک'' (Şairler Parkı)۔

استنبول کے علاقے بیسکتاش میں، جہاں دولما باشے محل، چراغاں محل، فنونِ لطیفہ کی اکادمی، مجسموں کا میوزیم، بحریہ میوزیم، مشہور اسٹیڈیم اور دیگر تاریخی اور عوامی دلچسپی کی عمارتیں واقع ہیں، دولما باشے محل سے کچھ آگے مخالف سمت شمال مغرب میں اوپر جاتی ہوئی سلیمان صباجادیسی پر ''شاعرلر پارک'' آتا ہے۔

Scanned with CamScanner

داخلی دروازے کے قریب پارک کی حدود سے باہر فٹ بال کے مشہور کھلاڑی اور بیسکتاش کلب کے سابق صدر سلیمان صبا (Süleyman Seba) (1926 - ) کا مجسمہ ہے۔ صبا نے 2000 میں کلب کی خدمات سے سبکدوشی کے بعد خفیہ سروس میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اس کے بعد اور اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔

اندر جاتے ہی سب سے پہلے ایک بنچ پر نے زن توفیق (Neyzen Tevfik) (1953-1979) الغوزہ بجاتے ہوئے مجسم نظر آتا ہے۔ نے زن شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ الغوزہ بجانے کا بھی ماہر تھا۔ اس سے دو مجموعے ''بیچ'' اور ''عذابِ مقدس'' یادگار ہیں۔

روشوں پر گھڑی کی سوئی کے مخالف چلتے ہوئے تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر مجسموں کی تقدیم کچھ یوں ہے:

''مجھے ایک ملک چاہیے، جہاں آسمان نیلا، شاخیں سبز اور مکئی کے کھیت زرد ہوں، جو پھولوں کا پرندوں کا وطن ہو'' کے خالق جاہت ستک تارانج (Cahit Sıtkı Tarancı) (1910-1956) کا مجسمہ سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ اوکتائے رفعت (Oktay Rifat) (1914-1988) کا مجسمہ اس کے بعد ہے جس نے اپنی نظم ''غیر ترقی یافتہ'' میں کہا ہے:

پیچھے رہ جانا سائنس میں
آرٹ میں
بہار میں بے برگ و بار
پیشانی ایک سسکتے ہوئے ستارے سے داغی ہوئی
مذہب کے غاروں میں دفن

اسی نے اپنی مختصر نظم ''تقدیر'' اس طرح سادگی سے ختم کی تھی:

میں ایک لڑکی کو جانتا ہوں
جس کے چہرے پر چھائیاں ہیں
میں اس سے محبت کرتا ہوں
اور وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی

Scanned with CamScanner

اگلا مجسمہ اوزدیمیر آصاف (Özdemir Asaf) (1923-1981) کا ہے جو اس طرح کی تہہ دار نظمیں لکھتا تھا:

تمام رنگ یکساں رفتار سے میلے ہو رہے تھے
سفید کو پہلا انعام دیا گیا

دوسطروں کی اس نظم کا عنوان ہے "جیوری"۔

بہجت نجاتی گل (Behçet Necatigil) (1916-1979) کا مجسمہ اس کے بعد ہے۔ بہجت "پوشیدہ محبت" میں کسی دوست سے مخاطب ہو کر اسے اس کی محبوبہ سے اپنی اتفاقیہ ملاقات کے بارے میں بتاتے ہوئے نظم کو اس طرح ختم کرتا ہے:

وہ خوش ہے اور اپنے شوہر کو چاہتی ہے
اس کا اپنا مکان ہے
اس نے تمھیں سلام بھیجا ہے
وہ ٹوٹی ہوئی سی لگ رہی تھی
جیسے کہ خود کو قصوروار سمجھتی ہو

اسی کی نظم "بندرگاہ" اس طرح سے شروع ہوتی ہے:

کشتیاں جن کے بادبان تند و تیز طوفانوں میں پھٹ گئے ہیں
پناہ کے لیے آتی ہیں
ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے ہاتھ آ گئی ہیں

صباحتین قدرت اکسال (Sabahattin Kudret Aksal) (1920-1993) کے مجسمے کو بہجت نجاتی گل کے مجسمے کے بعد جگہ ملی ہے۔ اکسال ہی کہہ سکتا تھا:

جہاں ایک بادل کھلتا ہے
وہاں موت کا اطلاق نہیں ہوسکتا

پھر نجاتی جُمال (Necati Cumalı) (1921-2001) کا مجسمہ ہے۔ اس نے لکھا تھا:

مجھے معلوم ہے

Scanned with CamScanner

یہ سورج کی روشنی میں زندہ نہیں رہ سکتے، نہ محبت کے ہالے میں —
ناانصافی، خوف، بھوک

اسی کا کہا ہوا ہے:

جلاد آخر جلاد ہوتا ہے
کوئی خانہ بدوش نہیں—

پارک کے عقبی حصے میں ملیح جودت اندائے (Melih Cevdet Anday) (1915-2002) کا مجسمہ ہے۔ یہ پارک کی تعمیر کے بعد 2002 میں اندائے کے انتقال کے بعد رکھا گیا ہے۔ یہ نظم اندائے کی ہے:

## پریشان درخت

ایک درخت ہے جسے میں جانتا ہوں
استلیک باغ کے پاس
اس نے 'خوشی' کا لفظ تک نہیں سنا
خدا کی مصلحتیں عجیب ہوتی ہیں
اسے معلوم ہے، دن کیا ہوتا ہے اور رات کیسی
اس کے ساتھ ساتھ وہ چار موسموں، ہوا اور برف باری کو بھی جانتا ہے
اسے چاندنی اچھی لگتی ہے
مگر پھر بھی اس نے اندھیری رات کو برا نہیں کہا
اسے پریشان کرنے کے لیے
میں اسے ایک کتاب دوں گا
جس سے وہ محبت کے بارے میں جان سکے گا
پھر اس کے بعد آپ اس کی حالت دیکھیں گے

Scanned with CamScanner

شاعرلر پارک میں سب سے نمایاں ایک بڑے پتھر میں تراشی ہوئی بہجت نجاتی گل، صباحتیین قدرت اکسال، شاہد تنگی تارانجی، اوکتائے رفعت، اورحان ولی کنک (Orhan Veli Kanık)، نے زن توفیق اور نگار حانم (Nigâr Hanım) (1856-1918) کی شبیہیں ہیں۔ نگار حانم کے قدموں میں ایک کتا بھی بیٹھا ہوا ہے۔ یہ شاعر زندگی میں کبھی اس طرح یکجا نہیں ہوے۔ نگار حانم ان سے بیشتر کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکی تھی۔ شاعری نے انھیں یکجا کر دیا ہے—ان سب میں ایک تعلق اور بھی ہے: یہ تمام شاعر بیسکتاش کے علاقے میں رہتے تھے۔

نگار حانم اور اورحان ولی کنک کے مجسمے الگ سے نہیں نظر آئے۔ نگار حانم کی وفات 1918 میں ہوئی۔ وہ جدید تر کی شاعری میں پہلی توانا نسوانی آواز تھی:

میرے محبوب آؤ اور میرے دل میں انڈیل دو
وہ بات جو تمھیں استادکھ پہنچا رہی ہے

اورحان ولی کنک 1916 میں پیدا ہوا اور 1950 میں مر گیا، مگر اس کی شاعری کے نقوش کبھی محو نہیں ہوں گے۔ اس کی ایک مشہور نظم ہے:

## پرانے کپڑے

میں پرانے کپڑے خریدتا ہوں
میں پرانے کپڑے خریدتا ہوں اور انھیں تراش کر ستارے بناتا ہوں
''موسیقی محبت کی غذا ہے''
مجھے موسیقی سے محبت ہے
میں شاعری لکھتا ہوں
میں شاعری لکھتا ہوں اور پرانے کپڑے خریدتا ہوں
میں پرانے کپڑے بیچتا ہوں اور موسیقی خریدتا ہوں
بس کاش میں راکی کی بڑی سی بوتل میں
ایک چھوٹی سی مچھلی ہوتا

Scanned with CamScanner

(راکی: سونف کی شراب۔)

شاعروں کے ان مجموعوں میں، جنھیں ترکی زبان میں 'ہیکل' کہتے ہیں، ان کے پیکر اور خدوخال کو مہارت کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ لباس اور ان کی شکنیں، ان کے جوتے بھی بہت کچھ بتاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شاعرلر پارک کی سیر نظموں کی ایک انتھالوجی سے گزرنے کی طرح ہے۔

❁

# معصومیت میوزیسی

Masumiyet Müzesi۔ اسے یہیں ہونا چاہیے تھا۔

چوکر جمعہ (Çukur Cuma) کے محلّے میں اپنے عنفوانِ شباب میں اورحان پامک (Orhan Pamuk) رات گئے تقسیم میں آوارہ گردی کرنے کے بعد، جہانگیر اور بےاوغلو کے درمیان، اسی طرح کی تنگ گلیوں میں سے گشت کرتا ہوا گھر لوٹا کرتا تھا۔ یہ متوسط طبقے کے لوگوں کا علاقہ ہے جہاں اُن دنوں سستے شراب خانے اور نہ جانے کتنی بے کشش اور نیم پر کشش جسم فروش لڑکیوں اور عورتوں کے ٹھکانے ہوا کرتے تھے۔ اس حُزن کی جو اورحان نے استنبول میں محسوس کیا تھا، تہہ یہاں ضرور بہت دبیز رہی ہوگی اور جب، انھی گلیوں سے گزر کر کسی آدھی رات کو پامک نے فیصلہ کیا کہ وہ تصاویر کے بجائے الفاظ میں محفوظ کرے گا۔

معصومیت کا یہ میوزیم ایک تین منزلہ گھر میں ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں بنا تھا اور جس کی دیواریں ''خونِ کبوتر'' کے رنگ کی ہیں۔ یہیں فسوں (Füsun) رہتی تھی۔

ناول کے مطابق 19 مئی 1976 کو شام کے وقت کمال باسماجی (Kemal Basmaci) چوکر جمعہ میں فسوں کے اس نئے گھر میں گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

فسوں کی موت کے بعد کمال نے اورحان کے ساتھ کئی نشستیں کی تھیں اور اس سے اپنی زندگی پر ایک ناول لکھنے کا خواستگار ہوا تھا۔ اورحان کو ناول کے ابتدائی جملے کا خیال 15 مارچ 2003 کو نیویارک کی 42 ویں اسٹریٹ کی ایک مشہور لائبریری میں آیا، جس کے بعد اس نے باب در باب، ہر نمائشی ویٹرین (vitrine) اور ان اشیا کے جوان میں موجود ہوں گی، خاکے بنانے شروع کیے۔ میوزیم کی بالائی دو منزلوں پر اسی طرح باب در باب ویٹرینوں میں وہ اشیا مادّی شکل میں موجود ہیں۔ فسوں کے ایک ایرنگ، جو پہلے باب ''میری زندگی کا سب سے پر مسرت لمحہ'' میں کھو جاتا ہے، سے شروع ہو کر طرح طرح کی ہیر پنیں، بروچ، چھوٹی بڑی گھڑیاں، فسوں کی سنگر مشین، لال ربن سے بندھی ایک چھوٹی سی قینچی، حساب کرنے کی مشین 989 کے ہندسے کے ساتھ، اپنی نمائش کر رہی ہیں۔ اورحان اس میوزیم کو استنبول کی نصف صدی کی عام زندگی کی یادوں کا ذخیرہ سمجھتا ہے۔ انھی شیشوں کے پیچھے ٹینس شوز، بچوں کے کھلونے، ٹائپ رائٹر، مہر لگے ہوئے پوسٹ کارڈ، فوٹوگراف، پرفیوم کی بوتلیں، راکی کا گلاس، استنبول کی تصاویر، اخباری تراشے، فلم کا پوسٹر، پراسرار نمکدان اور ان کے ساتھ ساتھ کمال اور فسوں کی ملاقات کا سبب، جینی کولوں کا جعلی ہینڈ بیگ اور اس گاڑی کا اسپیڈومیٹر جسے دوڑاتے ہوئے فسوں حادثے کا شکار ہوئی، بھی ناول کے اوراق سے نکل کر چھپ گئے ہیں۔

ناول کی طرح، اورحان کے خود اپنے الفاظ کے مطابق، میوزیم بھی استنبول کے حزن کی تشریح کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اٹیک سے زیادہ دل شکستگی اور کہاں نظر آ سکتی ہے۔ کمال یہاں 2000 سے 2007 تک رہا۔ اس کے استعمال میں آنے والی معمولی سی آہنی مسہری، جس کے پاس میز پر ایک لیمپ، تنگ بنچ اور مختصر درازیں پڑی ہیں اور بچوں کی تین پہیوں کی وہ سائیکل بھی جسے لوٹانے کے بہانے وہ پہلی بار فسوں کے اس گھر میں آیا تھا۔

''معصومیت کا میوزیم'' بنا کر اورحان اپنے کردار کمال میں ضم ہو گیا ہے۔ فسوں کی جس امانت کو کمال نے اس کے سپرد کیا تھا، اورحان نے اس کا بار اپنے ناول اور اپنے میوزیم دونوں میں خوش سلیقگی سے اٹھایا ہے۔

کمال باسماجی فسوں کیسکن سے عشق میں فنا ہو گیا تھا۔ بجا طور پر پامک نے معصومیت کے میوزیم کی کسی ویٹرین میں کمال سے کوئی ذاتی یادگار نہیں رکھی۔

سب سے زیادہ دلسوز دو اشیاے نمائش ہیں۔ زمینی منزل پر دیوار تا دیوار سلیب پر بظاہر پیکانی حروف میں کوئی عبارت ہے۔ قریبی مشاہدے سے پتا چلتا ہے کہ سگریٹوں کے بچے ہوے ٹکڑوں کو آڑے، ترچھے، افقی اور عمودی انداز میں چپکا کر حروف کی سی شباہت دی گئی ہے۔ فسوں کے چھوڑے ہوے سگریٹوں کے ٹکڑے جن پر اس کی لپ اسٹک کے نشان ہیں۔ پلیکسی شیشوں کی اس ویٹرین میں ہر عمودی سطر کے اوپر سنہ اور سگریٹوں کے قریب باریک حروف میں فسوں کا کہا ہوا کوئی فقرہ لکھا ہے۔

تیسری منزل پر ایک بڑی ویٹرین میں وتری طور پر آویزاں ایک فراک ہے، گلابی رنگ کے ساٹن کی، جس پر چھوٹے چھوٹے سفید پھول اور ہلکے ہرے رنگ کی پتیوں کا ڈیزائن ہے۔ کسی حد تک کشادہ گلے، بہت تنگ آستینوں والی اور کالر لگی یہ فراک استنبول کے اہم ترین فیشن ڈیزائنر سے بنوائی گئی ہے۔ میوزیم میں فسوں، کمال یا کسی بھی کردار کی تصویر نہیں ہے، مگر فراک فسوں کو نگاہوں کے سامنے لے آتی ہے۔ یہ فراک ان تمام محبت کرنے والوں کے لیے جن کے محبوب ان سے بچھڑ گئے ہیں، قمیص یوسف ہے۔

ایٹک ہی میں ناول کے مسودے کے چند اوراق اور ویٹرینوں کے خاکے رکھے گئے ہیں۔ مسودہ سرخ روشنائی سے بے طرح مجروح ہے۔

❄

# معصومیت کا ایک اور میوزیم

میں اسے تلاش کر رہا تھا جو نہیں تھا۔ غلطہ ٹاور کے اطراف میں مولیز کیفے (Molly's Cafe)، جہاں استنبول کے نوجوان شاعر جمع ہوتے تھے۔ جس شخص نے کیفے کے بک جانے کی اطلاع دی، اس نے یہ بھی بتایا کہ تم الف سے مل لو، وہ مولی کی دوست ہے اور تمھیں مولی تک پہنچا دے گی۔ الف

کون ہے اور کہاں، یہ بتانا بھی اب اسی پر لازم ہو گیا تھا۔

الف اسی تنگ گلی میں مخالف سمت کی صف میں ایک چھوٹی سی دکان میں ہوتی ہے۔ میں داخل ہوا، الف نے استقبال کیا۔ وہ پتلی دبلی، نازک، کسی حد تک حسین عورت تھی۔ عمر تقریباً چالیس سال۔ زندگی جنھیں بہت سی تلخیوں اور شدائد سے گزار کر کسی سکون سے آشنا کرتی ہے انھیں ان کی آنکھوں کی کیفیت اور ہونٹوں کی جنبش سے پہچانا جا سکتا ہے۔ الف بھی انھی میں سے تھی۔

الف جہاں تھی وہ ایک بہت چھوٹی سی فروش گاہ تھی جس میں بے شمار اشیا بے ترتیبی سے پڑی تھیں، جن کا وقت کے ساتھ تعلق بہت مبہم سا تھا۔

یہ میوزیم ہے، میں نے سوچا۔ ویسا میوزیم نہیں جہاں نفاست سے اشیا ویٹرینوں میں شیشے کے پیچھے سجا کر رکھی جاتی ہیں، طاقچے اختراع کیے جاتے ہیں اہم نوادر کے لیے، ہر شے کا نمبر شمار ہوتا ہے اور تعارفی چھوٹی تختیاں ان کے نیچے لگائی جاتی ہیں؛ جہاں یہ متعین ہوتا ہے کہ آپ کس طرف سے داخل ہوں گے، کدھر مڑیں گے اور باہر جانے کا راستہ کون سا ہے۔

یہاں ہر شے اپنی روح کے ساتھ موجود تھی۔ اور کیا تھیں وہ اشیا: حمام میں چار عورتوں کا نہاتے ہوئے ایک مِنی ایچر؛ ایک بڑا بیضوی آئینہ آرائشی فریم کے اندر؛ انطاکیہ کے دست بافی خام ریشم کے اسکارف؛ لمبی ٹہنی کے ساتھ ایک سورج مکھی کا پھول؛ درختِ تبریزی کی چھال سے بنی کپیوں میں زیتون کے تیل کا صابن؛ تولیے؛ ایک تار سے لٹکے ہوئے تین قمقمے جس کے آخری سرے پر ایک سبک سی گھنٹی؛ چھوٹے فریموں میں کچھ پرانی تصویریں — فہرست بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ آرائشِ جمال کی دکان ہے، یہاں خوشبودار نباتاتی صابن اور اشیائے حمام ملتی ہیں۔ اس کا ایک نام بھی ہے، مگر بہتر ہے کہ اسے محو سمجھا جائے۔

الف نے سیل فون پر مولی سے بات کی۔ پندرہ سال استنبول میں رہنے کے بعد مولی کناڈا واپس جا رہی تھی، دو دنوں کے بعد۔ وہ شاعروں سے ملانے کے لیے وقت نہیں نکال سکتی تھی۔ پتا نہیں کیوں، میں نے الف سے شاعروں سے رابطہ کرنے کی درخواست نہیں کی، اور نہ اس نے ازخود یہ پیشکش کی۔

Scanned with CamScanner

خدا حافظ کہنے سے پہلے، میرے اس سوال کا جواب کہ کیا وہ شاعر ہے، الف اور ان نے اپنی مسکراہٹ میں کہیں گم کر دیا۔

❁

# معمارِ اعظم کا کاسۂ سر

ترک ہسٹاریکل سوسائٹی کے ماہرین 1935 میں ایک خفیہ مہم کے تحت اس کی قبر کھود کر اس کا کاسۂ سر لے گئے تھے۔ پیش رخ، پشتِ سر، عظم صدغی، زائیکو میٹک قوس، ناک کے بانسے اور دیگر استخوانوں کے معائنے اور پیمائش کے بعد یہ ثابت کر دیا گیا کہ وہ ترکی النسل تھا۔ آرمینی، یونانی اور البانوی ماہرین چونکہ اس مہم میں شریک نہیں تھے اس لیے سِنان (Sinan) پر ان نسلوں کا دعویٰ اسی طرح برقرار رہ گیا۔ مذہب، جو کاسۂ سر یا کسی اور استخواں کی ساخت سے متعین نہیں ہو سکتا، سِنان کے تعلق سے متضاد روایتوں کے درمیان معلق ہے۔ اس کے بنائے ہوئے لاتعداد محل، دار الشفا، حمام، خان سرا، عسکری اور شہری پل اور آب ریز اس کی نسل اور مذہب کی نشاندہی سے بجا طور پر بری الذمہ ہیں، مگر سلطنت کے طول و عرض میں ایک خدا کے 84 بڑے اور 51 چھوٹے معبد بھی صرف اس کی صناعی کے گواہ ہیں۔ اس کی تدفین سلطان کے عقائد کے مطابق کی گئی۔ اسے ایک سادہ سا مقبرہ نصیب ہوا۔

❁

Scanned with CamScanner

# جو سرِ نخلِ صنوبر ہے، لحد کس کی ہے

بے پناہ سبز پہاڑیوں کے سلسلے میں، جو ابوایوب انصاریؓ کے مزار سے پیئر لوتی تک پھیلے ہوے ہیں، بہت سی سفید لوحیں نظر آتی ہیں۔ شاید یہ دنیا کا سب سے زیادہ خوشنما مدفنستاں ہے۔ باسفورس کے نیلگوں حسن اور استنبول کا شہر یہاں سے اور دلکش نظر آتا ہے۔ صنوبر، تبریزی، سرو، چیڑ، سیکران، سفیدے اور ان کے درمیان کہیں کہیں زیتون کے درخت، پھولوں کے خودرو اور باضابطہ اگائے گئے پودے۔ لوحوں پر عبارت انتہائی مختصر، بس نام، سنہ پیدائش اور سنہ وفات۔ یہاں یہ کتبہ کیسا رہے گا؟

AFZAL AHMED SYED

PEDAISH 1946

WAFAT 2012

مگر فنا کے بالمقابل اتنا لکھنا بھی بے ادبی ہے۔ اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیتے ہیں، اس طرح:

~~AFZAL AHMED SYED~~

~~PEDAISH 1946~~

~~WAFAT 2012~~

❁

Scanned with CamScanner

# آئینہ ساز

امارت کے عظیم ترین آئینہ ساز ہونے کی حیثیت سے اسے امیر سے اپنے فن کی تکمیل میں کسی بھی معاونت کی استدعا کرنے کا استحقاق تھا۔ اس کی درخواست پر اسے نہرِ الماس سے متصل امیر کے محل کے باغ میں لے جایا گیا جہاں امیر کی سب سے چھوٹی بیٹی زیما، جس کے لیے اسے ایک دستی آئینہ بنانے پر مامور کیا گیا تھا، شام کو گل گشت کے لیے آیا کرتی تھی۔ وہ اپنے آئینے کے محرم کو مقابل سے دیکھنا چاہتا تھا۔

اس نے اسے تمکنت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے ایک سیاہ بلوریں محراب سے نکل کر باغ میں آتے دیکھا۔ وہ انار کے ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا اور جب زیما اس کے قریب پہنچ گئی، اس نے آگے بڑھ کر تسلیمات پیش کیں اور اپنا تعارف کرایا۔ زیما نے مناسب الفاظ میں اس کی نیک خواہشوں کا جواب دیا اور یہ کہنے میں تصرف نہیں کیا کہ وہ بے انتہا خوش قسمت ہے کہ فہمیر ام اس کے لیے آئینہ بنائے گا۔ فہمیر ام کی خواہش کے احترام میں وہ کچھ دیر تک اس کے سامنے رکی رہی۔ فہمیر ام بغور اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے اس کی ہمراہ تین کنیزوں پر نظر ڈالی، اور اس نے زیما سے کہا: ''اُس خدا کی قسم جس پر تمھیں اعتبار ہے، میرے آئینے کو ہر صبح سورج کی روشنی میں کچھ دیر ضرور دیکھنا۔'' زیما نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اسے اثبات کا یقین دلایا۔ کنیزوں نے یہی سمجھا کہ آئینہ ساز نے امیر زادی کو اپنے فن کا خراج ادا کرنے کا پابند کیا ہے۔ ان کے چہرے پڑھنے کے بعد فہمیر ام جان چکا تھا کہ وہ زیما سے اس کی اس گفتگو کو کسی سے بیان نہیں کریں گی۔

اس نے امیر کو بتا دیا کہ وہ تشرین الاول میں، یعنی نو ماہ بعد، آئینے کے ساتھ حاضر ہوگا۔ امیر یہ کہتے کہتے رک گیا کہ کیا یہ مدت غیر معمولی نہیں ہے۔

واپسی میں شہرِ فقط میں اس نے اپنے کئی قریبی دوستوں سے ملاقات کیں، جن میں ابن زوکان، مایۂ ناز طبیب اور ماہرِ نباتات، بھی شامل تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے چند نائیوں اور خادموں کے سوا تمام خدام اور کاریگروں کو چالیس دنوں کی تنخواہ پیشگی ادا کی اور انھیں کہا کہ وہ سیر و سیاحت کو جا رہا

Scanned with CamScanner

ہے اور چالیس دنوں کے بعد لوٹے گا؛ انھیں اتنے دنوں کی رخصت ہے۔

قمیرام اور اس کے دوست پہلے شہر فقط کے گرد و نواح میں خیمہ زن ہوے۔ وہ چپے چپے میں گشت کرتے، طرح طرح کے پودوں اور خودرو نباتات کے نمونے جمع کرتے۔ پھر وہ آگے بڑھے اور وادی کو عبور کر کے شہر فلک کے قریب رکے۔ قمیرام ہر رات اپنے خیمے میں مراسلات لکھنے میں وقت صرف کرتا۔ صبح صبح تحائف کے ساتھ اس کے مراسلے لے کر اس کے گماشتے مختلف منزلوں کو روانہ ہوتے۔ سب سے زیادہ مراسلات دماطیہ میں مامون ابن الرباع کو بھیجے گئے جو قمیرام کی نظروں میں اپنے وقت کا علی ابن سینا تھا۔

قمیرام نے آئینہ سازی کی تیاریاں شروع کیں۔ صیدون سے دیودار کی لکڑیوں کے کندے اس کی بھٹی میں ڈالے جانے کے لیے پہنچے۔ مصر سے لائی جانے والی قالی کے خشک پودوں کی بوریاں اتریں۔ کیمیا کے سوداگروں نے قرغیزستان کا خالص ترین سیماب شیشے کے بڑے مرتبانوں میں اس کی شیشہ گاہ میں پہنچایا۔ بلوریں سم الفار، نقرہ، سنگِ سرمہ اور متعدد معدنیاتی اجزا جمع ہوے۔ اکثر آنے والا گماشتہ اپنے ساتھ خشک اور تازہ پودے لے کر آیا۔ تازہ پودے فوراً پائیں باغ میں لگا دیے گئے اور دل و جان سے ان کی نگہداشت کی گئی؛ خشک پودے اس سے زیادہ حفاظت کے ساتھ زر و جواہر کی کوٹھری میں بند کر دیے گئے۔

"یہ امِ کلب الاسود کے کانٹوں کا زہر ہے،" مامون ابن الرباع نے اسے لکھا۔ "اس کا تریاق نایاب ہے؛ ہم دریافت کر لیں گے۔" ہر نیا ملنے والا جواب قمیرام کو متحرک کر دیتا۔ وہ اپنی خوابگاہ میں مختلف کیمیائی مواد اور جڑی بوٹیوں کے ساتھ بند ہو جاتا، جن کی وہ آمیزش کرتا، انھیں جوش دیتا، انھیں جلا کر ان کے دھوؤں کو شیشے کے مختلف اقسام کے ظروف میں مقید کرتا۔

ایک دن گماشتہ جو جواب لے کر آیا، قمیرام شاید اسی کا سب سے زیادہ منتظر تھا۔ اس نے اپنے تمام خدام، نائبین، حتیٰ کہ اپنے ہم وطن افصح کو بھی، جسے وہ آئینہ سازی اپنا جانشین سمجھتا تھا، حکم دیا کہ شہر فقط کے گرد و نواح میں شعلۂ گل کے جتنے بھی پودے ملیں انھیں جڑوں سمیت اکھاڑ کر لے آئیں۔ اس بار بھٹی میں دیوداروں کے کندے نہیں، شعلۂ گل جلایا جائے گا۔

تشرین الاول کی تیسری کو اس نے امیر سے باریابی مانگی اور ملاقات پر کہا، آنے والے

Scanned with CamScanner

دوشنبہ کو وہ شیشے کی سل پر سیماب بچھائے گا۔ کسی بھی قسم کا شور سیماب کی سطح کی ہمواری میں نقص پیدا کر دے گا۔ اس کی گزارش ہے کہ اس دن مسجدِ جامع، جو اس کی شیشہ گاہ کے نزدیک ہے، کے مینار سے اذان موقوف کر دی جائے۔ امیر نے کچھ تامل کے بعد کہا: ''کر دی گئی۔''

دوشنبہ کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ فہمیر ام کی شیشہ گاہ نہیں، بارود کا کوئی کارخانہ ہے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ فہمیر ام، افصح اور دوسرے آئینہ ساز مختلف دھاتوں کے آمیزوں سے بنی چھوٹی چادروں پر بھٹی سے نلکیوں کے ذریعے شیشے نکال کر انھیں اپنی سانسوں سے پھیلا رہے تھے۔ دوپہر تک فلزات کی چادروں پر شیشے کی ہموار تہیں جم چکی تھیں۔ مغرب سے پہلے پہلے ان پر پگھلا ہوا سیماب پھیلا دیا گیا۔

دوسری صبح فہمیر ام کے بیدار ہونے سے پہلے اس کا دوست سرخوش، جو آئینوں کے گرد چوکھٹے بنانے میں وہی مقام رکھتا تھا جو فہمیر ام کو آئینہ سازی میں حاصل تھا، پہنچ گیا۔ دونوں دوستوں نے مل کر ایک آئینے کا انتخاب کیا۔ پھر فہمیر ام اسے اپنی خوابگاہ میں لے گیا، جہاں سے انھوں نے درختِ ربانی کی مسام دار لکڑی نکالی جسے لے کر سرخوش اپنی کارگاہ میں چلا گیا۔

رات گئے آئینہ اپنے چوکھٹے اور دستے کے ساتھ فہمیر ام کی خوابگاہ میں مکمل ہو گیا۔ سرخوش نے دستہ ایک خاص نوع کے نم گیر سنگِ آہک سے بنایا۔ دستے کو اندر سے بہت زیادہ کھوکھلا کر کے اسے بے حد گاڑھے سیال سے پُر کیا گیا تھا۔ چوکھٹے کی لکڑی کے اندر جوف تھے جن میں بلسانِ مکی، بابونہ، چینی جنکو، نیل گوندنی اور بہت سی دیگر نباتات کا سفوف بھر دیا گیا۔

فہمیر ام اور سرخوش شیرازی شراب کے نشے میں ڈوب گئے۔

آئینہ زیما کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ اس نے آئینہ ساز پر اعتبار کیا اور اس کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی پاس داری کی۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کی نیم بینائی کم ہو رہی ہے، شکلیں اسے کسی حد تک واضح نظر آنے لگی تھیں، اور ایک صبح اس کی بینائی پوری طرح بحال ہو گئی۔ اس نے اپنی بینائی کسی پر ظاہر نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ پتا چل جانے پر اس بار امیر اسے کسی بینائی کُش سفوف کی آدھی مقدار ملے ہوئے مشروب کے نہیں بلکہ گرم سلاخوں کے سپرد کر دے گا۔

Scanned with CamScanner

بہت دنوں بعد، تخت نشینی کی سالگرہ کے جشن میں، امیر کے خیمے کے قریب فہمیر ام کو زیما نظر آئی۔ وہ اس کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: ''تمھیں آئینہ پسند آیا؟''

زیما نے بے انتہا حسین مسکراہٹ اور دنیا کے شیریں ترین لہجے میں جواب دیا:

''تم واقعی آئینہ ساز ہو۔''

❁❁

Scanned with CamScanner

## عذرا عباس

# یہ بارش حیران کرتی ہے مجھے

جب آسمان سے زمین پر گرتی ہے
میں خوشی سے جھومتی ہوں
ناچتی ہوں
ایک مورنی کی طرح
ڈالتی ہوں اپنے پاؤں اس پانی میں
جو جمع ہو جاتا ہے
اور کہتا ہے
میں بارش کا پانی ہوں
بارش ہمیشہ میرے لیے ایک نوزائیدہ خبر
لے کر آتی ہے
جو میری بغلوں میں ایسی سرسراہٹ پیدا کرتی ہے
کہ میں خود سے کہتی ہوں
مجھے تو ایک موسم اور جینا ہے
یہ بارش ہی تو ہے
جو مجھے جینا سکھاتی ہے

Scanned with CamScanner

میں نہیں جانتی
کہ اسی سمے جب میں بارش میں بھیگ رہی ہوں
ایک بُلٹ کہیں سے آئے
جو میرے ناچتے ہوئے جسم کو
لہولہان کر جائے
میں یہ بھی نہیں جانتی کہ
بارش کے پانی میں نہاتے ہوئے دو بچے
گٹر میں ڈوب کر مر گئے
میں نہیں جانتی کہ ایک گھر کی چھت
اپنی کمزوری سے ڈھے گئی
اور پورا خاندان ختم ہو گیا
میں تو بس بارش میں بھیگنا چاہتی ہوں
بے شک موت ایسے سمے میری گھات میں ہو بھی تو کیا
موت ان کو بھی آتی ہے
جو بارش میں بھیگنا نہیں چاہتے

## کام سے گھر کی طرف جاتے ہوئے

کام سے گھر جاتے ہوئے
اسے پیشاب لگ رہا تھا
آج کام بہت تھا
اسے پیشاب کرنے کا وقت نہیں ملا

Scanned with CamScanner

اس نے گھنٹوں کا پیشاب اکٹھا کر لیا تھا
شہر کی حالت پہلے سے خراب تھی
وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف جا رہا تھا
گلیوں گلیوں چھپتا چھپاتا
اسے ڈر تھا
کوئی گولی کہیں سے آ کر اس کی کنپٹی پر
ٹک نہ جائے
وہ کبھی کبھی پیچھے بھی پلٹ کر دیکھ لیتا
اسے اپنی گدی پر خوف کی اینٹھن سی محسوس ہوتی
گولی کھانے کا اسے ابھی کوئی تجربہ نہیں تھا
ہوسکتا ہے یہ کوئی گولی ہو
وہ گدی پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھنے لگا
ابھی تک پیشاب کرنے کی کوئی جگہ نہیں ملی
جن گلیوں سے وہ گزر رہا تھا
وہاں صرف گھر تھے
اور ان کے دروازے
کوئی ایسی جگہ نہیں تھی
کہ وہ اپنے مثانے کو خالی کر لے
جو ہر قدم پر پھولتا جا رہا تھا
جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا
مثانہ اپنی حدیں پار کر رہا تھا
وہ جگہ تلاش کر رہا تھا
آخر اس کے بس میں نہیں رہا

Scanned with CamScanner

دو گھروں کے بیچ کی دیوار کی آڑ میں بیٹھ کر
اس نے مثانے پر لگائی ممانعت کو ہٹا لیا
شروعات ہوئی ہی تھی
اسے اپنی گردن پر ایک چبھن محسوس ہوئی
مثانے کو منع کرنا اس کے بس میں نہیں تھا
چبھن تیز ہو چکی تھی
مثانہ خالی ہونے پر تیار
اس نے سنا تھا
گردن کو دھڑ سے الگ کر دیا جاتا ہے
یہ خوف آتے ہی
اس نے مثانے کو ڈانٹا
بس کر، بہت ہو گیا
یہ آواز اس کے حلق سے نکلی
مثانہ رک گیا
جن کے گھروں کے بیچ بیٹھا
وہ مُوت رہا تھا
اس کی آواز سن کر
دروازے کھولنے کے ساتھ
ان کی چیخیں بھی کھل گئیں
اس کا مُوت
گلی میں بہہ رہا تھا
اس کے خون کے ساتھ

Scanned with CamScanner

## آنکھیں کتنا خوش ہوں

پانی پر بنتا ہے بلبلہ
اور پھوٹ جاتا ہے
دیر تک نہیں ٹکتا
آنکھیں اس کو بنتے ہوئے بھی دیکھتی ہیں
اور غائب ہوتے ہوئے بھی
آنکھیں جب یہ دیکھتی ہیں
حیران ہوتی ہیں
کیسے آیا اور گیا بھی
ان کی حیرانی کون دیکھتا ہے
وہ بلبلہ بھی تو نہیں
جس کو آنکھیں دیکھ رہی ہیں
وہ تو آتا ہے
اور بس جاتا ہے
ایسے سمے میں اگر وہ بھی یہ دیکھ لے
کوئی اس کو دیکھ رہا ہے
تو آنکھیں کتنا خوش ہوں

## ایک آنچ کی دوری پر

رہ جاتا ہے
ایک خواب پورا ہونے کو

تب ہی ایک نہ پورا ہونے والا خواب
دہائی دیتا نظر آتا ہے
ساری خوشی ڈھل جاتی ہے
اور شروع ہوتا ہے کراہنے کا موسم
جو لگتا ہے کہ اب کبھی ختم نہیں ہوگا
کہ پھر ایک خواب کھلکھلاتا
آن کھڑا ہوتا ہے
کراہنے کا موسم
جو لگتا ہے کہ اب ختم ہوا کہ جب
کہ ایک بار پھر نامکمل خواب
آنسوؤں میں بھیگا تاک رہا ہوتا ہے
یہی ہوتا ہے ہر بار
یہی ہوتا ہے بار بار
بس ایک آنچ کی کسر ہی تو رہ جاتی ہے
کسی ایسے خواب کے لیے
جو پورا ہو جاتا
اگر دوسرا دہائی دیتا ہوا
نہ آن پہنچتا

# نظم

جن کو ملنا ہوتا ہے
وہ مل جاتے ہیں

Scanned with CamScanner

جن کو بچھڑنا ہوتا ہے
وہ بچھڑ جاتے ہیں
جیسے منٹگمری کے جنکشن پر
رہنے والا آدمی
آکسفورڈ اسٹریٹ کے اسٹیشن پر ملتا ہے
ان آنکھوں سے
جنھیں وہ تلاش کر رہا تھا
پتلی پتلی گلیاں
موڑ کھاتے راستے
پیدل چلنے والوں کے لیے
بنے فٹ پاتھ
لگتا ہے سب اسی کام پر لگائے گئے ہیں
کسی کو کسی سے دور لے جانے
یا کسی کو کسی کے قریب لانے پر
کوئی نہیں جانتا
یہ سب کیوں ہو رہا ہے
کوئی نہیں جانتا
کس کی منشا پر یہ سب ہو رہا ہے

## وقت

دوڑتے دوڑتے اس کی
ٹانگیں بھی جواب دے رہی ہیں

Scanned with CamScanner

بھاگا جا رہا ہے
یوں جیسے کوئی اسے پکڑنے آ رہا ہو
وہ کہاں جانا چاہتا ہے
اور کب تک بھاگے گا
بس بھاگے جا رہا ہے
بلبلاتا ہوا
تھکتا بھی تو نہیں
جیسے کسی سے شرط لگائی ہو
کہیں دھیا چھو کر واپس آنے کی
اسے یہ بھی پتا نہیں
اس سرپٹ دوڑنے میں
کتنوں کو روند گیا
کتنے اس کے واپس پلٹ کر آنے کا
اپنی اپنی چوکھٹوں پر بیٹھے
انتظار کر رہے ہیں
لیکن ایک دن تو ضرور آئے گا
جب وہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر نیچے گرے گا
پھر اٹھ نہیں پائے گا
پھر ہم اسے وہیل چیئر پر
بٹھا کر گھمائیں گے
اور دکھائیں گے
وہ نقصان جو وہ پیچھے کر کے آیا ہے

Scanned with CamScanner

# نظم

ہمیشہ خدا میرے کندھے پر بیٹھا ہوا
کچھ نہ کچھ
مجھ سے کہتا رہا
کبھی سرگوشیوں میں
کبھی علانیہ
میں بھی اس کی سرگوشیوں پر
کان دھرے رہی
ہمیشہ
کبھی ایسا نہیں ہوا
سنی ان سنی کی ہو
ایک دن میں اس سے کہوں گی
یہ ہر وقت کا روکنا ٹوکنا تو اچھا نہیں
کچھ بھی میں اپنی مرضی سے نہیں کر سکی
ہر بار تیری سرگوشیاں مجھے
آگے بڑھنے سے روکتی رہیں
وہ کچھ کرنے سے
جو سب کر رہے ہیں
اور مزے میں ہیں
تیری یہ سرگوشیاں تو مسلسل
میرے کانوں میں سرسراتی ہیں
آج تو میں اس سے کہہ دوں گی

Scanned with CamScanner

آخر کب تک
کب تک یہ روکنا ٹوکنا جاری رہے گا
کبھی تو ایک ایسی سانس لوں
کہ جب یہ سوچوں
کہ تو نہیں ہے
بس اب تو نہیں ہے
میں ہوں
اور میں ہی ہوں

# کسی کو پتا نہیں

آنے والے وقت میں
کیا ہونے والا ہے
ہوائی جہاز میں سفر کرنے والی
عورت کے پاؤں کو بھی
جو ابھی ابھی جوتوں سے باہر آئے ہیں
ااور نہ اس کی مٹھی میں دبے ہوئے سگریٹ کو
جس کو سونگھ سونگھ کر وہ
اپنی سگریٹ پینے کی خواہش کو پورا کر رہی ہے
اس کے سامنے لگے نو اسموکنگ کے سائن کو بھی
جو اس کی سگریٹ پینے کی خواہش کا
مذاق اڑاتا نظر آتا ہے

Scanned with CamScanner

کسی کو پتا نہیں
کیا ہونے والا ہے
اس جہاز کو بھی
جو مسافروں کو دس ہزار میٹر کی بلندی پر
لے جا رہا ہے
اس یقین کے ساتھ
کہ کسی کو پتا نہیں
کیا ہونے والا ہے

## نظم

مجھے میرا دل ہمیشہ بغاوت پر
اکساتا ہے
کہتا ہے
یہ دنیا جہاں میں ہوں
وہ میری نہیں ہے
میں کھوجنے میں لگ جاتی ہوں
ایک اور دنیا
جو بس میری ہو
میرے نام سے جانی جائے
جہاں درختوں کی قطاریں
دور دور تک ہاتھ باندھے کھڑی ہوں
صرف میرے لیے

Scanned with CamScanner

جہاں بچوں کے قہقہوں کی گونج
مجھے ہر طرف سنائی دے
جہاں جنگلوں میں ہرن
بے خوفی سے قلانچیں بھرتے نظر آئیں
جہاں کوئی شکاری نہ ہو
جہاں محبت ایک پراسرار رقاصہ کی طرح
گلیوں اور بازاروں میں
ہر وقت ناچتی پھرے
وہ دنیا کسی کے خوابوں سے جڑی نہ ہو
جہاں موت بے بسی کی چادر اوڑھے
لمبی تان کر سو رہی ہو

## آدمی مرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے

کچھ پیدا ہونے سے پہلے ہی
مر جاتے ہیں
کچھ پیدا ہونے کے بعد
کچھ اور اس کے بعد
اور
اور اس کے بعد
لیکن آدمی جب تک زندہ نظر آتا ہے
وہ ایسے ٹھمک ٹھمک کر چلتا ہے
جیسے کبھی مرے گا ہی نہیں

Scanned with CamScanner

حالانکہ وہ جانتا ہے
آدمی مرنے کے لیے بھی پیدا ہوتا ہے

## کمال کر دیا ہے

ایک ملال نے
مجھے نئی حیرت میں پھینک دیا
سدھ بدھ کھو کر
ایک نئی سدھ بدھ میں
کیا ہے اور کیا نہیں ہے
سب صاف ہو گیا
اب جو ہے
سب نیا ہے
جب میں نئے شہر میں گھر گئی ہوں
سب نیا
سڑکوں، گھروں اور چہروں سے لے کر
آوازیں بھی
ایسی جو کبھی نہ سنی ہوں
ہر چیز چھو چھو کر دیکھتی ہوں
برف کی طرح سرد اور چمکیلی
پوروں کے لمس بھی
پرائی بھاشا بھول گئے
اس نئی حیرت میں

Scanned with CamScanner

وہ ملال بھی گیا
نہیں
وہ تو یہیں کہیں ہے
اسی حالت میں
جیسا کہ ملا تھا
ذرا سا بھی ٹس سے مس نہیں ہوا
بس سب کچھ نیا کر گیا

## غموں کی زبان نہیں ہوتی

غموں کے اشارے ہوتے ہیں
وہ اشاروں کی زبان میں ہم سے
باتیں کرتے ہیں
ان کے اشاروں کی زبان
جو ہم پیدا ہوتے ہی سیکھ جاتے ہیں
تو وہ تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں
اور مل جاتے ہیں
نئے غموں سے
پھر نئے غم ان کی دیکھا دیکھی
مل جاتے ہیں
آنے والے غموں سے
کبھی کبھی یہ سب مل کر
جشن مناتے ہیں

Scanned with CamScanner

ایک دوسرے کی آؤ بھگت میں
یہ بھول جاتے ہیں
کہ یہ تو ہمارے غم ہیں
ایسے سے بس یہ اپنی من مانی کرتے ہیں
ہم بھی خوش ہو جاتے ہیں
کہ کچھ دیر تو ہمیں ان کے اشاروں سے نجات ملی
جو یہ ہمارے لیے ہمیشہ تیار رکھتے ہیں
لیکن ایسا ہوتا نہیں
یہ بہت خوش اسلوبی سے ہمیں
ایسے موقعے پر گھیر لیتے ہیں
جب ہم بھی انھیں بھولنے کا
جشن منانے جا رہے ہوتے ہیں

## نظم

میرا باپ ایک زندگی گزار کر
مر گیا
میری ماں ایک زندگی گزار کر
مر گئی
ان کی زندگی کے لگ بھگ ستر پچھتر سال
ان کی تمام زندگی کا شور شرابہ
ایک نہ ختم ہونے والی خاموشی میں
شامل ہو گئے

Scanned with CamScanner

میں نے بھی تو ایک زندگی گزاری
زندگی کے تمام تماشوں میں حصہ لیا
کوئی کسر نہیں چھوڑی
وقت کے ریلے میں ہمیشہ رہنے کے لیے
کیا ایک اور زندگی
خاموشی کے زنداں میں چلی جائے گی
لیکن مجھے یقین ہے
میری کتابیں کہیں تہہ خانوں میں
دبی ہوئی
آنکھیں میچے مجھے یاد کرتی رہیں گی

## دل بھٹک گیا تو کیا ہوگا

دل اپنے حصے کی سیر کر آیا
اب بیٹھا ہے تھکا ہوا
ایک بنچ پر
اور سوچ رہا ہے
کس نمبر کی بس پر چڑھوں
راستہ بھول گیا تو کیا ہوگا
پہلے بھی تو کتنی بار بھٹک چکا ہے
جب تو دم خم تھا
خود ہی اپنی انگلی پکڑ کر لے آتا تھا
دور نہیں جاتا تھا

Scanned with CamScanner

بیٹھا ہے اب تھکا ہوا ایک بنچ پر
سوچ رہا ہے
اب بھٹک گیا
تو کیا ہوگا

## نظم

ایک چہل پہل ہے
غموں کی وہاں جہاں کبھی
ہم سب اپنی اپنی بیٹھکوں میں بیٹھ کر
کسی بھی عمدہ شاعر کا ذکر
بڑے زور و شور سے کرتے ہوئے
کبھی کبھی تو سڑکوں پر بے ساختہ نکل پڑتے
اور ایک دوسرے کو حیران کرتے ہوئے
اپنی اپنی دانست میں
اس کے مصرعوں کو داد دیتے
ہاں، جب سڑکوں پر چلتے ہوئے
صرف کتوں سے ڈر لگتا تھا
اگرچہ وہ بھی جانتے تھے
کہ یہ صرف موالی ہی نہیں ہیں
وہ بہت حجاب سے ہمارے
گھسٹتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر
ایک طرف دبک جاتے تھے

Scanned with CamScanner

راتیں اپنی تنہائیوں سے تھکی ہوئی
ہمارا انتظار کرتی تھیں
ہم دن کی بھیڑ میں
روزی روٹی کی بھاگ دوڑ سے
تھکے ہوئے ہوتے
لیکن نکل پڑتے
چاند ہوتا یا نہیں ہوتا
ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا
ہاں، وہاں تندور بھی جاگتے
ہمارے انتظار میں
ہم لکڑی کی بنچوں پر بیٹھ کر
کسی عمدہ شاعر کے مصرعوں پر سر دھنتے
ہوا بھی کیسی چلتی تھی
تمکین
اور ایسی جیسے کسی برف کی سل کو
چھوتی ہوئی آئی ہو
اور آسمان بھی انتہائی حد تک
اپنی باچھیں پھیلائے تاکتا تھا
اب وہاں کیا ہے
غموں کی چہل پہل کے سوا
سرپھری موت
جو یہ نہیں جانتی
کہ زندگی تو صرف ایک بار ملتی ہے

Scanned with CamScanner

# ریئے

ریئے کو جوان ہوے
چھ ماہ ہو چکے
ریئے کیوں بھونکتی ہے
ریئے اتنی خوبصورت ہے
کہ اگر اس کی نسل کا کوئی کتا اسے دیکھ لیتا
تو اس پر بری طرح عاشق ہو جاتا
ریئے کو آوارہ کتوں کی طرح
سڑک پر گھومنے پھرنے کی آزادی نہیں ہے
ریئے بہت مہنگے داموں
اس وقت خریدی گئی تھی
جب وہ اپنی ماں کا دودھ ہی پی رہی تھی
اچھی نسل میں پیدا ہونے کی
قیمت چکاتے ہوے
ریئے قید کے دن گزار رہی ہے
جہاں اسے بہترین شیمپو سے نہلایا جاتا ہے
اور اس کا ٹرینر اس کا بدن
قیمتی تولیے سے پونچھتے ہوے
ریئے پر رشک کرتا ہے
ریئے جب اپنے پنجرے میں لیٹی ہوتی ہے
تو کوئی نہیں جانتا کہ
ریئے کس کے انتظار میں ہے

Scanned with CamScanner

ریٹے جب واک پر لے جائی جاتی ہے
تو وہ گلی کے آوارہ کتوں کو دیکھتی ہے
اس کی آنکھیں مخمور ہو جاتی ہیں
بید کی کرسی پر بیٹھی
اس کی مالکن سوچتی ہے
کبھی کبھی ریٹے کے بارے میں
جب وہ ریٹے کی بے تابی کی
گتھی اپنے ذہن میں
سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے
سلجھا رہی ہوتی ہے
رشتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں

## اب جیسے سب کچھ اچھا ہو رہا ہے

اب ہم کسی برے خواب سے
ڈر کر جاگتے نہیں
اب کسی شکست پر ہماری ریڑھ کی ہڈی کے
آخری مہرے میں درد نہیں اٹھتا
اب نفرتوں کی بازی جیتے ہوئے
ہمارے دشمن
ہمیں بھیانک نظر نہیں آتے
ہمارے چاروں اطراف شانت ہیں
یہ

وہ

وہاں

جہاں

کس وقت کی تخریب کاریاں ہیں

ہم شانت رہتے ہیں

نہیں ہوتے بے آرام

بس آنکھیں بند کر کے کسی دعا کو

منھ ہی منھ میں بدبدانے لگتے ہیں

یا ٹی وی آن کر دیتے ہیں

اور فیملی فرچون شو دیکھنے لگتے ہیں

اور انتہائی خوش نصیب شخص کی قسمت پر

زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں

اور ہنستے ہیں

اتنا اتنا کہ ہمارے آنسو نکل پڑتے ہیں

ہم حیران ہوتے ہیں

یہ آنسو تو ہمارے کسی غم پر نہیں نکلے

یہ تو خوشی پر نکلے ہیں

## شاہد علی کو کس نے مارا

شاہد علی شوگر کا مریض تھا

اور آج اس کا ارادہ تھا

جمعے کی نماز میں

Scanned with CamScanner

وہ اپنے خدا سے
اپنی سلامتی اور طویل عمری کی دعا مانگے گا
شاہد علی نے گاڑی اسٹارٹ کی
اور گلی کے نکڑ پر پہنچ کر
وہ بائیں جانب مڑ رہا تھا
کہ کسی نامعلوم سمت سے آنے والی گولی نے
اس کی گردن میں سوراخ کر دیا
شاہد علی بے ہوش ہو گیا
پھر شاہد علی تین دن بعد مر گیا
مرنے سے پہلے
ہوش اور بے ہوشی کے درمیان
وہ سوچ رہا تھا
اگر اس کی گردن میں گولی نہیں لگتی
تو وہ جمعے کی نماز میں
اپنے خدا سے اپنی سلامتی کی دعا
مانگ لیتا

## بے اختیار

ان چیزوں سے میرا کیا لینا دینا
جو میرے ارد گرد نہیں گھومتی ہیں
جیسے وہ جنگ جو روز بہت سے لوگوں کو
موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے

Scanned with CamScanner

جیسے وہ بھوک جو مرنے والے کو
مرنے کی سزا سناتی ہے
جیسے وہ کڑواہٹ
جو کسی کی زبان سے نکل کر کسی کے دل کو
غم سے آشنا کرتی ہے
ان تمام باتوں سے میرا کیا لینا دینا
بے گناہ مارے جانے والوں کی لسٹ میں
ابھی تک میرا نام تو نہیں ہے
اور نہ ان کے ساتھ
جو ان کی زیادتیوں کا شکار ہو رہے ہیں
جو اپنی اپنی قسمت کی زمینوں پر راج کر رہے ہیں
مجھے کیا لینا دینا ان باتوں سے
جن کو مجھ سے دور رکھا گیا
اور ان خواہشوں سے
جن کو میری آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں
مگر چھو نہیں سکتیں
مجھے کیا لینا دینا ان خوابوں سے
جو میری نیند کے علاقے میں بستے ہیں
لیکن کوئی اور شب خون مار کر ہتھیا لیتا ہے
مجھے کیا لینا دینا اس غم سے
جسے بیان کرنا مرے اختیار سے باہر ہے

Scanned with CamScanner

عذرا عباس

# بول میری مچھلی

میں نے اس سے کہا
آٹھ فٹ چوڑے اور پانچ فٹ گہرے
سمندر میں رہتی ہو
کیسا لگتا ہے
اس نے کہا...
نہیں، اس نے کچھ نہیں کہا
بلکہ شیشے کی دیوار سے اپنی
ناک لگا کر مجھے تکنے لگی
مجھے لگا
یہ تو مجھے سن رہی ہے
میں نے اس پر ساری توجہ لگا دی
ارے! کیا واقعی یہ مجھے دیکھ رہی ہے
میں نے اسے اپنی آنکھیں مٹکا کر
پھر اشارہ کیا
تو تم مجھے دیکھ رہی ہو
پھر تو سن بھی رہی ہو گی
کیسی ہے تمھاری دنیا
کیا تم جانتی ہو
یہ پانی تو دھوکے کی ٹٹی ہے
تم جسے سمندر جان کر
اپنا وقت بتا رہی ہو

Scanned with CamScanner

وہ سمندر تو نہیں

یہ سب جھوٹ ہے
یہ نقلی پہاڑیاں
یہ برگ وبار

یہ سب...
تم کو دھوکے میں رکھا گیا
تم جانتی ہو
اور اگر جانتی ہو
تو، تو کیسے کاٹ رہی ہو
یہ زندگی
اس آٹھ فٹ گہرے
اور پانچ فٹ چوڑے سمندر میں
یہ جانتے ہوئے بھی
کہ یہ سب دھوکا ہے

## نظم

نت نئے واقعات کے پھیلاؤ میں
یہ زندگی اور بھی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے
ہونی اور انہونی سمیت
وقت کے سمٹنے کے باوجود
ایک ہوکا ہے
سب جان لینے کا

Scanned with CamScanner

سب دیکھ لینے کا
قدم ساتھ دیں یا نہ دیں
دماغ کی رو
خواہشوں کا گٹھڑ اٹھائے
کبھی یہاں، کبھی وہاں
الجھتی ہے
کبھی خوف کی گھنی جھاڑیوں میں
کبھی موت کی فراوانی میں
کبھی اندھیرے گھپ خوابوں میں
حیرت آتی ہے
دنیا اور دلچسپ ہوتی جا رہی ہے
لیکن وقت ہے کہ سمٹتا جا رہا ہے
یہ جانے بغیر کہ
دنیا ہمارے لیے اور دلچسپ ہوتی
جا رہی ہے

## میرے غم

عادی ہو گئی ہوں
ان کو یاد کرنے کی
جو کبھی بڑے ہوتے ہیں
کبھی چھوٹے
بہت چھوٹے

Scanned with CamScanner

اتنے چھوٹے کہ باریک کرچیوں جیسے
جو چبھ گئے تو کبھی نکل نہ پائے
آج بھی چبھے ہوے ہیں
اور یاد دلاتے رہتے ہیں
اپنے ہونے کی
یہ چھلاووں کی طرح آتے ہیں
کبھی کبھی تو جھنڈ میں
اور ان باتوں کی
جو خوشی بننے والی ہوتی ہیں
اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں
ان کو نہیں پتا
کہ میں بھی ان کو کب بھلا پائی ہوں
جب ہنستی ہوں
تو ان کی یاد مجھے رلاتی ہے
جب روتی ہوں
تو یہ یادیں اور رلاتی ہیں

## جلاوطن

انھیں ان کتابوں سے بے دخل کیا گیا
جن میں وہ چھپی بیٹھی تھیں
ان کے خریدار اپنی اپنی جیبیں بھرنا چاہتے تھے
انکار کے عوض انھیں کیا ملا

## جلاوطنی

وہ سمندر کے راستے
پانیوں پر چلتی ہوئی
کوہ پیمائی کرتی ہوئی بہت دور نکل گئیں
ان سے بھی دور
جو اس مقدمے میں ان کے ساتھ تھے
جب انھیں جلاوطن کیا جارہا تھا
سمندر ان کو کبھی نہیں بھولا
بادل آج بھی وہ جہاں جاتی ہیں
اپنی بوندوں سے ان کا سواگت کرتے ہیں
اداسیوں سے بھری ہیں ان کی جھولیاں
پرندے ان کی جلاوطنی پر
اپنی اپنی آوازوں میں
دکھوں سے لبریز گیت الاپتے ہیں
جب ان سے وہ پناہ گاہیں چھینی جارہی تھیں
جہاں وہ دبکی بیٹھی تھیں
کوئی ان کا ہم راز نہیں تھا
صرف سمندر
اس ناانصافی کے خلاف
اپنے جھاگ اڑا رہا تھا حد نظر تک
وہ جانتی تھیں
سمندر ہی ان کا ساتھی ہے
وہ جانتی تھیں

Scanned with CamScanner

اس آشوبی زمانے میں
کوئی ان کا ساتھ نہیں دے گا
اس وقت بھی
جب ان پر بے لباسی کی تہمتیں لگائی جارہی تھیں
اس وقت بھی
جب انھیں پابہ زنجیر کیا جارہا تھا
اس وقت بھی
جب ان کے دلوں پر وزنی تالے ڈالے جارہے تھے
سب اپنا اپنا منھ چھپائے
برق رفتاری سے انھیں دھکیلنے پر سرگرم تھے
سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے
منھ اندھیرے
جب انھیں بے دخل کیا جارہا تھا
پسپائی کی سازشیں
جب ان کا مقدر بنائی جارہی تھیں
وہ مسکرا رہی تھیں
وہ جانتی تھیں
ناآشنائی کی ان سرحدوں پر
ان کا ساتھ کوئی نہیں دے گا
وقت کی چالیں ان کے ساتھ ہیں
جو ان کو بے بس کر دینا چاہتے ہیں
وہ انھیں لوگوں کی یادداشت سے بھی دور
پھینک دینا چاہتے ہیں

Scanned with CamScanner

آج وہ
وقت کے انتظار سے دور
کہیں دور دراز علاقے میں
سبز گھاس کے ایک ٹکڑے پر بیٹھی ہیں
اور ایک خط لکھ رہی ہیں
انھیں
جنھیں وہ بھلا نہیں سکیں

## نظم

جب کچھ پیسے میرے پاس بچتے ہیں
جاتی ہوں مارکیٹ
خرید لاتی ہوں ایک بڑا خواب
گھر آتی ہوں
تو خواب کو رکھنے کی کوئی جگہ نہیں پاتی
الٹے پاؤں لوٹتی ہوں
اور کم پیسوں میں بیچ دیتی ہوں
وہ خواب
مٹھی میں بچے ہوئے پیسوں سے
خرید لیتی ہوں ایک اور خواب
گھر لاتی ہوں تو دیکھتی ہوں
کہ خواب کو میری طرح بھوک بہت لگتی ہے
سوچتی ہوں

Scanned with CamScanner

یہ تو میرے حصے کا کھانا بھی کھا جائے گا
پھر واپس جاتی ہوں
اور کم پیسوں میں بیچ دیتی ہوں
وہ خواب
مٹھی میں آئے پیسوں سے
پھر خرید لاتی ہوں ایک خواب
گھر کے راستے میں خواب
میری مٹھی سے نکل کر ہوا میں اڑ جاتا ہے
اوجھل ہو جاتا ہے مری نظروں سے
اب میری مٹھی میں کوئی خواب نہیں ہے

## غلام بچہ

وہ ایک تصویر ہے
تصویر اچانک حرکت میں آتی ہے
وہاں ایک شکاری ہے
ساتھ میں ایک شکار کا سامان اٹھائے
غلام بچہ
جو آقا کو اشارے سے دکھا رہا ہے
اس طوطے کو جو ہرے پتوں کے
جھنڈ میں سے نظر آ رہا ہے
آقا بندوق کا نشانہ تیار کرتا ہے
طوطا تاڑ لیتا ہے

Scanned with CamScanner

وہ اور گھنے پتوں میں سرک جاتا ہے
ایک لمحے میں نشانہ اپنی زد پر نہیں رہتا
آقا بلبلا اٹھتا ہے
وہ مڑتا ہے
اس کا نشانہ غلام بچہ
غلام بچہ دہشت میں آنکھیں بند
کر لیتا ہے
غلام بچہ زمین پر گرتے ہوئے
کیا سوچ رہا ہے
یہ تصویر نہیں بتاتی

## ویلنٹائن ڈے

وہ پرانے عہد ناموں کو نیا کر رہے ہیں
پھول خریدتے ہوئے
اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے
کشادہ اور طویل بوسوں کی تیاری کے لیے
ممکن ہے
پھول خریدتے ہوئے
وہ جن ہونٹوں کے بارے میں سوچ رہے ہوں
وہ کہیں دور کسی نئے عہد نامے پر
دستخط کر رہے ہوں
ممکن ہے

Scanned with CamScanner

کبوتروں کی جوڑی کی طرح
راستہ بھٹک گئے ہوں
یا شاید اس تنہا پرندے کی طرح
جو سامنے ٹیمز کے اوپر بہنے والی کشتی کے سرے پر
گردن اچکا اچکا کر
کسی کو ڈھونڈ رہا ہو
کچھ بھی ممکن ہے
اس ٹھنڈی یخ کر دینے والی سرد ہوا میں
پھر بھی گرم جوشی کی کمی نہیں
اب یہ جو عورت اکیلی سردی سے گھبرائی
انگلیوں کو گرم کوٹ کی جیب میں ڈالے
ایک بنچ پر بیٹھی
آنے جانے والوں کو دیکھ رہی ہے
تنہائی کے خوف سے زبان اپنے
دانتوں میں بھینچے
تنہائی کی شرمندگی
اس کی سرخ ہوتی ہوئی ناک سے صاف ظاہر ہے
سامنے سے آتا ہوا ایک جوڑا
جہاں مرد کی باہیں عورت کو دبوچے ہیں
بنچ پر بیٹھی عورت کی یادداشت کے
دروازے کھول رہا ہے
آج یہ کبوتر بھی ویلنٹائن ڈے منانے پر
تلے ہوئے ہیں

Scanned with CamScanner

زمین پر دانہ چگنا بھول کر
ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے ہیں
یہ محبت کا عہد نامہ کہاں سے شروع ہوتا ہے
اور کہاں ختم ہوتا ہے
کیا یہ جان لیتے ہیں
بچھڑنے کے بعد ایک دوسرے کو
اور وہ حاملہ عورت
اس کے باوجود کہ
محبت کا اقرار نامہ اپنے ساتھ لیے ہوئے چل پھر رہی ہے
لیکن وقت گہرا اور نیا ہوتے ہوتے رہ گیا ہے
آسمان کے اس عکس کی طرح
جو پانی پر اپنا پھیکا رنگ ڈال رہا ہے
حاملہ کے چہرے پر اداسی ہے
اس کے ہاتھ میں کوئی پھول بھی نہیں ہے
وہ مسافروں سے بھری بوٹ دیکھ رہی ہے
جو چاہے ان چاہے وزن کو لیے
پانی پر چلی جا رہی ہے

## میرے راز

راز اب دکھ بن گئے ہیں
رازوں کی گٹھڑی لے جاؤں گی ایک دن
کسی میدان میں

Scanned with CamScanner

جہاں چیل کوے اڑتے ہوں
گٹھڑی کھول دوں گی
تو وہ میرے رازوں کو نوچ نوچ کر کھائیں گے
جیسے کسی کے مردہ بدن سے گوشت
اور وہ ایسا کریں گے
اتنے مزے دار اتنے اپنے اپنے رس میں ڈوبے ہوے
یہ دھوپ کے پرندے
چبائیں گے میرے راز
اور ان کی بچی کچی ہڈیاں
یہ کہیں دور بادام کے درختوں پر
یا نیم کے پیڑوں پر
چوس چوس کر تھوکیں گے
مجھے معلوم ہے
بڑا مزہ آئے گا انھیں
میرے راز کسی مردہ جسم کا گوشت سمجھ کر
چبا چبا کر کھانے میں
پھر یہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہوے
لہولہان ہو جائیں گے
میرے رازوں کا نشہ انھیں ادھ موا کر دے گا
اور میں دور اس میدان میں
ایک ٹیلے پر بیٹھ کر
انھیں یکے بعد دیگرے مرتے ہوے دیکھوں گی

❁❁

Scanned with CamScanner

**ارشد محمود**

# ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

## قیمت: 200 روپے

ہم نے اپنے ماحول اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس حد تک جامد، خشک، بور، بے کیف، حسن اور لطف سے عاری کر رکھا ہے کہ بحیثیت حیوان جن جبلی خوشیوں پر ہمارا حق ہو سکتا تھا، یہ کہہ کر کہ ہم حیوان نہیں انسان ہیں، اُن سے خود کو محروم کر لیا، اور انسان ہونے کے ناتے جن خوشیوں پر حق ہو سکتا تھا انھیں یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم انسان نہیں مسلمان ہیں۔ یہ ہے ہمارا ثقافتی المیہ۔ نتیجہ یہ کہ ہم اجتماعی طور پر حسن کے احساس اور خوشیوں کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کے بیری بن چکے ہیں۔ اب سنجیدگی کا مارا، تاریکی پسند اور جمالیاتی حسوں سے محروم انبوہ کثیر، عالمی تہذیب نو سے اپنی ثقافتی، سیاسی اور معاشی دشمنی میں اضافہ کیے چلا جا رہا ہے۔ بربادی اور موت کی علامتوں سے اپنی شاہراہوں کو سجانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ خود ساختہ اخلاقیات اور پارسائی کے خبط نے ماحول میں مُردنی، گھٹن اور بے کیفی اس حد تک پیدا کر رکھی ہے کہ اس کے اندر زندگی اور دنیا کو خوبصورت بنانے یا اسے ترقی دینے کی لگن اور دلچسپی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ایک طرف ہماری طاقتور ایلیٹ (elite) حکمران کلاس ہے، جو حیوانی اور انسانی سطح کی سب جبلی لذتوں سے بہرہ مند ہے۔ اس نے اخلاقیات اور پاک دامنی کے سب اسباق عام آدمی کے لیے رکھ چھوڑے ہیں، تاکہ عوام کے حصے کی خوشیوں پر قبضہ جاری رکھا جا سکے۔ دوسری طرف کروڑوں عوام کا وہ جم غفیر ہے جہالت اور غربت جن کا مقدر ہے، اور یہ مقدر اسی طاقتور طبقے کا لکھا ہوا ہے۔ وہ خوبصورتی اور لذتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ کسی بھی سوسائٹی کی ساری تڑپ، جد و جہد اور امید کی کرن صرف متوسط طبقہ ہوتا ہے۔ وہ کون سا انسان ہے جسے اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے خوبصورتی اور خوشیاں درکار نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں اپنے اوپر سے مسخ شدہ انسان کا چوغہ اتار پھینکنا چاہیے اور خوبصورت بننے، ماحول کو خوبصورت کرنے اور ہر ایک کے اپنے انداز سے خوش ہونے کے حق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اگر اس طبقے کی مزاحمت نہیں کریں گے جو ثواب اور پارسائی کے نام پر پورے معاشرے کو بلیک میل کرتا ہے، اُسے پیچھے رہنے، گھٹن زدہ اور بدنما زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے، تو ہمارے اس وطن میں تہذیب کے جو بچے کھچے آثار ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی کاوش ہے۔

Scanned with CamScanner

## ژولیاں

# منیر جعفری شہید

کوئی گھڑسوار کربلا کے سورج تلے اکٹھے ہوئے ہیں۔ عمر بن سعد ان سے مخاطب ہور ہا ہے: ''سپاہیو، تہانکوں ای فتح تے فخر کرنا چاہیدا! اےنہد اا جر تہانکوں خدا ڈے سی۔'' پھر وہ گویا ہور ہا ہے: ''لیکن ہک کم باقی اے۔ ساڈے امیر دا حکم اے کہ حسینی فوج دیاں لاشاں کوں کچلا ونجے۔ آؤ! میدان دی طرف جلو۔'' یہ حکم داغ دیا گیا اور کوئی رسالہ عمر بن سعد کی کمان میں میدان کی طرف روانہ ہور ہا ہے۔ کربلا کے میدان پر بہتر پاکیزہ میتیں پامالی کی منتظر ہیں۔ کوئی اپنے گھوڑوں کو مہمیز لگاتے ہوئے اس میدان کے قریب آرہے ہیں۔ اور اچانک ایک گھڑسوار عمر بن سعد کو پکارتا ہے، ''حضور، حُرکوں بخشو، او ساڈے قبیلے دا ہے۔'' عمر بن سعد سب کو حکم دیتا ہے، ''حُرکوں بخش ڈیو۔'' پھر ایک دوسرا گھڑسوار عرض کرتا ہے، ''حضور، علی اکبرکوں کچلنا نئیں چاہیدا۔ اندی ماں ساڈے قبیلے دی اے۔'' اور عمر بن سعد علی اکبر کی میت کو بچانے کا حکم دیتا ہے۔ اب ایک تیسرا گھڑسوار ملتمس ہور ہا ہے، ''حضور سائیں، عباس دی والدہ ساڈے قبیلے دی اے۔'' عمر بن سعد عباس کی لاش کو بھی پامالی سے مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ پھر ایک چوتھا گھڑسوار اس کو پکار رہا ہے۔ اور ایک پانچواں۔ اسی طرح، بالآخر، میدانِ کربلا کی ستر میتیں ظلم و جبر اور تذلیل سے بچ جائیں گی اور دو میتیں کوفیوں کے گھوڑوں سے کچلی جائیں گی۔ حسین سید الشہدا کی عظیم اور پُرنور میت اور آپ کے فرزندِ شیر خوار اصغر کی صغیری سی میت۔

میں مجلس کے اس موڑ پر آ کر اپنے آنسوؤں کو اپنی شال کے ایک سرے سے خشک کر رہا ہوں اور ایک پل کے لیے نیچے نظر ڈال رہا ہوں۔ نیچے، میرے پاؤں تلے، کائنات کی لاانتہا وسعتوں

Scanned with CamScanner

میں، منجملہ دیگر ستاروں اور سیاروں کے، وہ کرۂ ارض جگمگا رہا ہے جو پینتیس سال تک، میری پیدائش سے لے کر میرے قتل ہونے تک، میرا مسکن رہا۔ اس کے گرد وہ چاند گردش کر رہا ہے جو ساری عمر میرا دائمی محبوب رہا۔ پھر میں آنکھیں اٹھا رہا ہوں۔ اوپر، رفعتوں میں، باب الشہدا چمک رہا ہے، جس کی دہلیز پر سلطانِ کربلا جناب اپنے بیٹے اصغر کو گود میں اٹھائے کھڑے ہیں۔ وہ میری مجلس کو سماعت فرما رہے ہیں۔ میرے اس بلند منبر کے سامنے سامعین کا کثیر مجمع ہے۔ سب کے چہروں پر اکتاہٹ اور خستگی عیاں ہے۔ سامعین میرے منھ سے بہتر ہزار مجلسیں سن چکے ہیں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں کی کثرت سے بے نور ہوئی ہیں۔ ان کے گلے نعروں کی تکرار سے چھل گئے ہیں۔ ان کے سینے ماتموں کی شدت سے خونم خون ہوے ہیں۔ ان کے قدموں میں ان کا لہو مسلسل بہہ رہا ہے۔ میری مجلسوں نے ان سامعین کا امتحان لیا۔ سامعین وجد میں آئے، اور ان کے وجد میں آنے سے میرے آخری کفارے کی ادائیگی ہوگئی۔ اب جناب سید الشہدا امام حسین اپنی غیبی دہلیز سے ہماری طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔ اب اس دہلیز کو پھلانگنا ہے جس کے آگے ہر عہد کے شہدا ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

مجلس اختتام پذیر ہو رہی ہے۔ یہ میری آخری مجلس ہے۔ میں اسے چند اشعار کے ساتھ ختم کر رہا ہوں:

توحید کی چاہت ہے تو پھر کرب و بلا چل
ورنہ یہ کلی کھل کے کھلی ہے نہ کھلے گی
مسجد کی صفوں سے کبھی مقتل کی طرف دیکھ
توحید تو شبیر کے سجدے میں ملے گی

اس مجلس کے ساتھ میری زندگی کا قصہ تمام ہو رہا ہے۔ اب وقت آیا ہے یہ قصہ سنانے کا۔

ابو بہت عرصے سے دیوانے تھے۔ میری والدہ مجھے جنم دیتے دیتے رحلت کر گئی تھیں۔ ان کی وفات سے ابو کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ اس قدر شدید تھا کہ انھوں نے نہ صرف دوسری شادی سے انکار کر دیا تھا بلکہ دنیا کی کارروائیوں سے کامل سبکدوشی لی تھی۔ وہ پورا دن اپنے کمرے میں بند ہو کر سوگ

Scanned with CamScanner

مناتے تھے۔ ہمارے گھر والے ان کے کمرے کی دہلیز پر پانی کا ایک گھڑا اور تھوڑی سی خوراک رکھ دیتے تھے۔ ابو جھٹ سے دروازہ کھول کر، ان سادہ سی سوغاتوں کو اٹھا کے، اپنے کمرے کی پراسرار تاریکیوں میں ٹھونس لیتے تھے۔ اور جوں ہی ان کا دروازہ کھلتا تھا، ایک موٹا سا بادل اندر سے اڑ کر، گھر کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے کسی دیوار، الماری یا پنکھے سے ٹکرانے جاتا تھا۔ اس بادل کی گزران سے ہمارے درودیوار معطر ہو جاتے تھے۔ یہ بادل مجھے حیران کر دیتا تھا۔ میں اس کو ایک طلسمی بادل سمجھتا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے کچھ لوگوں سے سنا کہ یہ بادل دراصل ایک چلم کی نالی سے خارج ہوتا تھا۔ اس چلم میں ایک ایسی چیز جلتی تھی جسے ہمارے دیہاتی لوگ 'فقیری' کہتے تھے۔ ابو میری والدہ کی بے وقت موت کا غم غلط کرنے کے لیے اپنی چلم میں دن بھر فقیری پیتے تھے، اور مدام اپنے پیدا کردہ بادل کے مخملی ہالے میں رہتے تھے۔

رات کو ابو اپنا دروازہ کھولتے تھے۔ پھر وہ برہنہ پا اور برہنہ سر، ہاتھ میں ایک لاٹھی لیے، لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے تھل کا رخ کرتے تھے۔ تھل ہماری بستی کے گرداگرد پھیلا ہوا تھا۔ ابو رات بھر تھل کے ریتیلے قالین پر اپنی لاٹھی سے عجیب و غریب نقش و نگار تراشتے چلے جاتے تھے۔ ان کی عقل مختل تھی اور ان کی روح بے قابو۔ وہ ایک مجذوب درویش کی طرح تھل کی نادیدہ ڈگروں پر چل کر اپنی انوکھی اور گھائل سی آواز میں ورد کرتے تھے، اور گردوپیش ریت کے بھولے بسرے ذروں سے لے کر عرش کے بے صورت مکینوں تک، سب ان کا ورد سنتے تھے۔ چاندنی بھی گوش برآواز تھی، جسے وہ لاٹھی اٹھا کر گھنٹوں پکارا کرتے تھے:

کہاں پاؤں؟ کہاں پاؤں یار
جن انسان ملائک سارے
کیا سگلا سنسار
حیرت دے قلزم وچ کل تھیے
مستغرق سرشار
صوفی شاغل گیانی دھیانی
گئے اوڑک سب ہار

لیکن چاندنی انھیں جواب دینے کی زحمت نہیں کرتی تھی۔ اور جب رات کے روزنوں سے اجالا جھانکنے لگتا تھا، جب ریت پر شبنم کے اشک صفِ ماتم بچھاتے تھے اور فجر کی اذان اپنے پاک تیشے سے خلا کو چاک کر دیتی تھی تو ابوا پنا ورد منقطع کر کے، ایک ہزیمت خوردہ سپاہی کی شرمساری سے، لاٹھی ٹیکتے ہوئے گھر کی طرف پلٹتے تھے۔ گھر آ کر وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے تھے اور کچھ ہی دیر بعد ان کے خراٹے ان کے کمرے سے بلند ہو کر اہلِ خانہ کو ان کے نیند میں ہونے کی تسلی دیتے تھے۔

وہ جوانی سے ذاکری کرتے آ رہے تھے۔ عالمِ دیوانگی میں بھی انھوں نے ذاکری ترک نہیں کی تھی۔ وہ اب تک منبروں پر دیکھے جاتے تھے۔ لیکن ان کا مجلس پڑھنے کا انداز پہلے سے مختلف تھا۔ پہلے وہ ضبط اور سلیقے سے پڑھتے تھے اور مصائب بیان کرتے وقت بھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے انھیں 'ٹھنڈا ذاکر' کا لقب دیا گیا تھا۔ اب وہ منبر پر بیٹھتے ہی وجد میں آتے تھے۔ ان کی آواز گھن گرجتی تھی اور ان کے الفاظ سامعین پر یوں برستے تھے جیسے فوجِ حسین پر یزیدیوں کے نیزے۔ مصائب کی نوبت نہیں آتی تھی اور ان کے سامعین گریے میں آ چکے ہوتے تھے۔ ان کی آہ وزاری اور ان کی ہچکیاں ابو کی بےخودی کو انگیزتی تھیں، قہر اور جلال ان پر نازل ہوتے تھے۔

وہ عموماً امامِ کربلا کی آخری رات بیان کرتے تھے —— دشت کی ویرانی میں آپ کی عبادت کی رات۔ آپ کے اہلِ خانہ پیاس سے نڈھال تھے اور آسمان نے غم واندوہ کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ کچھ ہی گھنٹے بعد دھرتی گھوڑوں اور پیادوں کے پاؤں تلے ہلنے والی تھی اور دشت لہو میں نہانے والا تھا۔ جوں جوں ابو کا بیان اپنے مراحل طے کرتا تھا، ان کی بےخودی شدت پکڑتی تھی، اور اسی عمل کے ساتھ ساتھ ان کی زبان کی کایا کلپ ہوتی تھی۔ ابو مجلس کے شروع میں ہماری اس سیدھی سادی بولی میں اظہارِ خیال کرتے تھے جس میں سے پھونس، چولھے اور گوبر کی بو آتی تھی۔ پھر وہ اس بولی کو چھوڑ کر اردو کی ابریشمی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ پھر ان پہاڑیوں سے اتر کر وہ فارسی کی شاداب وادیوں میں تھوڑی دیر گھومتے تھے اور آخرکار عربی کے سنگلاخ کوہساروں پر چڑھائی کرتے تھے۔ عربی بولتے ہوئے وہ یوں کانپتے تھے گویا رعد ان کی سماعت میں آ گیا ہو۔ وہ پھر اس مسلسل کپکپی کی وجہ سے اپنی مجلس روکنے پر مجبور ہوتے تھے۔ سامعین ان کی دیکھا دیکھی اپنی آہ وزاری

Scanned with CamScanner

روکتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے۔ دو چار منٹ کے بعد ان کی کپکپی رک جاتی تھی اور وہ اچانک بول پڑتے تھے۔ پیشگوئیوں کی ایک آبشار ان کے منھ سے رواں ہوتی تھی اور سامعین اس آبشار سے ایک ایک لفظ پی جاتے تھے۔

ابو کی پیشگوئیاں مشہور تھیں۔ وہ مجذوب ہو کر حالتِ حال سے زیادہ حالتِ آئندہ کے شناسا ہو گئے تھے۔ اور لوگوں میں ان کا احترام اس قدر تھا کہ وہ منبر سے اترتے ہی دست بوسیوں اور قدم بوسیوں سے دو چار ہو جاتے تھے۔ یہ احترام جھیلنے کے بعد وہ تھل کی راہ لیتے تھے۔

ابو کی دیوانگی دیکھتے ہوئے میں بڑا ہو گیا۔ میرا بچپن گزر گیا۔ میرا لڑکپن شروع ہو گیا۔ اور جب میں پندرہ سال کا ہو گیا، میں نے خود کو ایک دوراہے پر پایا۔ ایک راہ دیوانگی کی جانب جا رہی تھی اور دوسری راہ دنیا کی طرف۔ دنیا والی راہ میں تدریس، زمینداری اور ملازمت کانٹوں کی طرح بچھی ہوئی تھیں۔ دیوانگی والی راہ میں عزت، آگہی اور آزادی پھولوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔ میں نے اپنے ابو کا راستہ اختیار کیا۔ مجھ پر ان کی دیوانگی طاری ہونے لگی۔ میں رات کو چاندنی سے ملنے کے لیے تھل کی طرف جاتا تھا۔

چاندنی مجھے بہت تکلیف دیتی تھی۔ وہ رات گئے مجھے بستر سے اٹھاتی تھی اور کوچ کا حکم دیتی تھی۔ چاندنی سے میں کس طرح حجت کر سکتا تھا؟ میں چاندنی کا حبشی غلام تھا۔ وہ میری سفید فام رانی تھی۔ اس کی حکم عدولی موت کے مترادف تھی، سو میں مجبور ہو کر تھل کے چار پانچ طواف کر کے گھر کی طرف پلٹتا تھا۔ وقفے وقفے سے ایک آواز اندھیرے کی ردا کو چیرتی تھی:

کہاں پاؤں؟ کہاں پاؤں یار؟

وہ ابو کی آواز تھی۔ ان پر بھی چاندنی بہت جبر کرتی تھی۔

چاندنی کبھی کبھی مجھے تڑپانے کے لیے بادلوں میں چھپتی تھی اور میں گھنٹوں تھل کی ظلمتوں میں اس کے درشن کا انتظار کرتا تھا۔ اور جب وہ بادلوں سے نکلتی تھی تو دنیا کے دربار میں سب مخلوق اور سب اشیا اس کے ماتحت ہو جاتی تھیں۔ تھل کے وحشی جانور رکوع میں جاتے تھے اور بستی کے مکانات قدم بوسی کے لیے جھک جاتے تھے۔ مسجد کا مینار سجدہ کرتا تھا اور ریت کے ٹیلے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔

Scanned with CamScanner

دھرتی کی چھاتیوں پر ان سب کا وزن پڑتا تھا۔ ان چھاتیوں سے دودھ کی ایک جھیل امنڈ آتی تھی۔ میں اس جھیل میں تیرنے کا جتن کرتا تھا، لیکن میری غرقابی یقینی تھی۔ میں مولا سے رحم کی اپیل کرنے کے لیے ایک مرثیے کے دلخراش بند سناتا تھا:

حضرت پر ادھر ہوتی ہے اعدا کی چڑھائی
تنہائی، نہ بیٹا نہ بھتیجا ہے نہ بھائی
سیدانیاں دیتی ہیں محمد کی دہائی
اعدا میں یہ غل ہے کہ کرو فتح لڑائی
ڈوبے ہوئے خوں میں شہدا گرد پڑے ہیں
گھوڑے پر اکیلے شہِ ابرار کھڑے ہیں

دودھ کی جھیل یکلخت سوکھ جاتی تھی اور ہمارا تھل دشتِ کربلا کا بھیس دھار لیتا تھا۔ چاندنی بادلوں کے سیاہ خیمے میں بین کرتی تھی اور لڑائی کی آوازیں دشت پر رینگ رینگ کر میرے کانوں تک آتی تھیں۔ نیزے، تیر اور سنانیں ہر سو برستی تھیں اور شہدائے کربلا کی روحیں میرے جسد کے گرداگرد گنگناتی تھیں۔ میں یہ سارا منظر گردوپیش کی مخلوق اور اشیا کے آگے بیان کرتا تھا۔ میں ان راتوں میں تھل کا ذاکر بن جاتا تھا۔

پھر ایک روز جب میں چاندنی کا انتظار کر رہا تھا، ایک شعر میری زبان پر بے اختیار آیا:

وہ ماہتاب جو ڈوبا ہوا ملال میں تھا
مجھے خبر ہی نہیں میں کسی خیال میں تھا

وہ میرا پہلا شعر تھا۔ یہ شعر چاندنی کی طرف سے ایک تحفہ تھا۔ عرش اور فرش کے درمیانی پل پر چل کر وہ سیدھا میرے پاس آیا تھا۔ چاندنی کا آشیرباد مجھے حاصل تھا۔ اور اب میری حالت یہ تھی کہ میں نہ مجازی نہ حقیقی تھا۔ میرے پاؤں ریت کے اسیر تھے اور میرا رخ غیب کی جانب تھا۔

فجر کی اذان فضا میں گونجتی تھی۔ شہدائے کربلا فردوسِ بریں کی طرف لوٹتے تھے اور چاندنی ارشاد فرماتی تھی: ''تخلیہ!'' میں ایک ناکام وزیرِ آتش کی طرح منہ لٹکا کر، سر جھکا کر گھر واپس آتا تھا۔

Scanned with CamScanner

ریت کی لوح پر کچھ پر اسرار تحریریں مرقوم تھیں۔ وہ ابو کی لاٹھی کے نشان تھے۔ ابو اذان سنتے ہی گھر چلے گئے تھے۔ دن کے رائیگاں اجالے اور انسانوں کی فضول گہما گہمیوں سے انھیں سخت الجھن تھی۔ وہ اب اپنے کمرے میں آرام فرما رہے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ جب ہم دونوں ایک ہی تھل میں رات بھر ماہ بینی کرتے تھے، ہماری مڈبھیڑ کبھی نہیں ہوئی۔ تھل کے سمندر میں ہمارے تنکے ہمیشہ دور دور رہتے تھے۔ ہمارے تنکے ایک بار بھی واصل کیوں نہیں ہوئے؟

ابو کی پیشگوئیوں کا چرچا دور دور تک تھا۔ سیاستدان انتخابات سے پہلے ان کی پیشگوئیاں سننے ان کے پاس آتے تھے، کیونکہ یہ مشہور تھا کہ ان کی سب پیشگوئیاں پوری ہوتی تھیں۔ سیاسی حلقوں میں ان پیشگوئیوں کی شہرت بڑھ گئی، اور وہ دن بھی آیا جب ہمارے ملک کا مقبول ترین سیاست دان ابو سے ملنے تشریف لایا۔ دارالحکومت میں اسے ایک اہم وزارت کی پیشکش ہوئی تھی۔ فیصلہ کرنے سے پہلے وہ ابو کی پیشگوئی سننا چاہ رہا تھا۔ اس کے ہمراہ اس کی صاحبزادی تھی۔ دونوں ایک خصوصی ہیلی کاپٹر میں آئے تھے جو اب بستی سے تھوڑے فاصلے پر تھل میں کھڑا تھا۔ بیسیوں پولیس اہلکار چیونٹیوں کی طرح ان دونوں کے گرد وپیش کلبلا رہے تھے۔ سیاست دان اور اس کی صاحبزادی ہماری بستی کی خطرناک دھوپ کا سامنا کرنے کے لیے موٹی کالی عینکوں سے لیس ہوئے تھے۔ دونوں کو جلدی تھی۔ سیاست دان کو شام تک ایوانِ صدر میں اپنا فیصلہ سنانا تھا، اور اس کی صاحبزادی رات کو پڑھائی کے لیے ولایت جا رہی تھی۔ دونوں جلدی جلدی ابو کے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں ان کے دو رکنی وفد کے جلو میں تھا۔ کمرے کا نقشہ عجیب تھا۔ دیواروں پر فارسی اور عربی کے جملے لکھے تھے۔ ایک چارپائی کے سوا کوئی ساز وسامان نہیں تھا۔ ابو فرش پر دراز تھے اور کمرے کی چھت کے پنکھے کو یوں تک رہے تھے گویا وہ عرشِ بریں کا ایک دریچہ تھا۔ ایک بادل ابو کے جسم کی نگہبانی کر رہا تھا۔ فرش پر ابو کی بغل میں ایک چلم پڑی ہوئی تھی۔ سیاست دان اور اس کی صاحبزادی نے ابو کے سامنے اپنی عینکیں اتاریں اور سیاست دان نے دعا سلام کے بعد اپنا سوال پوچھا، لیکن ابو ایک گستاخانہ خاموشی سے عرشِ بریں کے دریچے کو تکتے رہے۔ ہم سب پریشان تھے۔ ابو کی یہ بے لحاظی ہمیں نقصان پہنچا سکتی تھی، ہمارے نام کو مٹی میں ملا سکتی تھی۔ ایک پرانے نوکر نے ہم سب کی پریشانی

دیکھ کر میرے والد کی چلم کو اٹھا کر فقیری سے بھرا۔ پھر اس نے چلم جلائی اور ابو کے مہر بند ہونٹوں کی طرف بڑھائی۔ ابو نے چلم کے سرے کو یوں چوسا جیسے کوئی طفل شیر خوار اپنی ماں کی چوچی کو چوستا ہو۔ ہمارے دونوں مہمان یہ دیکھ کر حیرت کے بت بن گئے تھے اور ہم شرمندہ ہو رہے تھے۔ پھر نوکر نے بے دردی سے ابو کے ہونٹوں سے چلم ہٹائی اور ابو نے منہ سے دھویں کی لمبی جلیبی اگل کر اپنی مجلسوں کی خاص آواز میں ایک کہانی چھیڑی: ''خدا دے فضل نال توں وزیر بن وے سیں، پر ہک غنیم ملک تے قابض تھے سی۔ او تینکوں پھانسی ڈے سی۔ تیڈی پھانسی دے بعد، تیڈی دھی تیڈی جگہ گھن سی۔ پر او بھی بری نظر توں ناں بچ سی۔'' سیاست دان یہ کہانی سن کر تردد میں پڑ گیا۔ پسینے کے موٹے قطرے اس کی پیشانی پر ڈھلک گئے۔ اس کے ہونٹ ٹیڑھے ہو گئے اور ابو کے پوپلے منہ پر ایک ظریفانہ تبسم کھل اٹھا۔ آج ایک نشئی ذاکر نے اپنے عہد کے متکبر سلطان کو شکست و ریخت کا مزہ چکھایا تھا۔ سیاست دان کی صاحبزادی غافل اور بے پروا تھی، گویا ان سب معاملوں سے اس کا کوئی علاقہ نہیں تھا۔ میں اس کی بے حسی پر حیران تھا اور غور سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے تیور اس عظیم اور المناک مستقبل کی علامتوں سے عاری تھے جس کا اعلان ابو نے کیا تھا۔ اس کے کتابی چہرے، لمبی ناک، کالی آنکھوں اور لمبی لٹوں سے ڈھکی ہوئی پیشانی میں نہ کسی درجے کی حکمت تھی نہ کسی قسم کا جلال تھا۔ پھر اچانک ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور میرا تاثر یکدم بدل گیا۔

صاحبزادی کی آنکھیں کیا چیز تھیں! ان آنکھوں کے آئینوں میں فردا کے وعدے وفا ہوتے تھے۔ ان آنکھوں کے آسمانوں میں جرأت کے باز محوِ پرواز تھے۔ ان آنکھوں کے طاسوں میں دانائی کی ندیاں بہا کرتی تھیں۔ ان آنکھوں کے گردابوں میں قہر کے طوفان پلا کرتے تھے۔ ان آنکھوں نے مجھے دو نیم کر دیا تھا۔ ایک حصہ میرے تصرف میں تھا، دوسرا ان آنکھوں میں مقیم تھا۔ میری ذات نے صاحبزادی کی ذات کو سراہا بھی تھا اور قبول بھی کیا تھا لیکن صاحبزادی، چند لمحوں کے بعد، اپنے مضطرب ابو کو ساتھ لے کر، اپنی اڑن طشتری میں ایک شاندار اور پر آشوب مقدر کی جانب روانہ ہونے والی تھیں۔ ان سے میں دوبارہ کب ملنے والا تھا؟ میرے دونوں حصے کب واصل ہونے والے تھے؟ معلوم نہیں۔ شاید مجھے پوری عمر ادھورا رہنا تھا۔ یہ ادھورا پن مجھے برداشت نہیں تھا۔ مجھے تا زیست اپنے دونوں حصوں کو ملانے کی جدوجہد کرنا تھی۔

Scanned with CamScanner

ابو کی پیشگوئیاں ختم ہوگئی تھیں اور وہ اپنی فقیری پی کر سو گئے تھے۔ وہ رات سے پہلے نہیں جاگنے والے تھے۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ سیاست دان اور اس کی صاحبزادی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ہمارا گھر ان کی رونق اور تجلی سے خالی ہوگیا تھا۔ اس گھر میں دو افراد ہمیشہ کے لیے ادھورے تھے۔ ایک میرے خوابیدہ ابو تھے جنھیں میری ماں کی وفات نے معذور کیا تھا؛ ایک میں تھا، ان کا مجبور اور دلفگار صاحبزادہ، ایک نارسا صاحبزادی پر فدا۔

ابو کی پیشگوئیاں حسبِ معمول پوری ہوئیں۔ سیاست دان نے وزارت قبول کی اور ترقی کے زینے طے کیے۔ لیکن ایک غنیم نے زبردستی ہمارے ملک کا تخت سنبھالا۔ اس نے سیاست دان کو اول درجے کا غدار قرار دے کر اپنی دار پر کھینچا۔ صاحبزادی غنیم کی تحویل میں آ گئی۔ ایک غدار کی بیٹی ہونے کی پاداش میں اس کو مہینوں تک ایک صحرائی زنداں میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔

یزیدی ہمارے ملک کے کونے کونے میں موجود تھے اور غنیم نے آتے ہی ان کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی تھی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے قریہ بہ قریہ، کو بہ کو، یزیدیوں کے لشکر پہنچنے لگے۔ سادات ان کے دشمن دیرینہ تھے۔ ہماری بیخ کنی انھیں مطلوب تھی۔ ہمارے علاقے میں سپاہِ شہدا ہمارے خلاف صف بستہ تھی۔ سپاہِ شہدا مقامی یزیدیوں کا لشکر تھا۔ اس کے رضا کار کافی تعداد میں تھے۔ وہ تھل کے علاقے کو ہم سے خالی کروانا چاہتے تھے، اور ہمارے ڈاکٹروں، وکلا، شعرا اور اساتذہ کو دھمکیوں کے خط بھیجتے تھے۔ موصوفین کو کفر چھوڑنے کے لیے چوبیس گھنٹوں کی مہلت ملتی تھی۔ اس خط کی وصولی کے بعد بزدل افراد تھل سے ہجرت کرتے تھے اور جاں نثار اپنی جگہوں پر ڈٹ کر شہادت کا انتظار کرتے تھے۔ سپاہِ شہدا کی مہلت کے ختم ہونے کے بعد یہ جاں نثار لقمۂ اجل ہو جاتے تھے۔

میں اس وقت ایک کالج کا طالب علم تھا۔ تھل میں میری ماہ جبینیاں ختم ہوگئی تھیں۔ میں اپنے کالج کی ماہ جبینوں پر فدا ہوتا تھا۔ میں سینکڑوں غزلیں اور نظمیں ان کے یاقوتی ہونٹوں، سرو قامت بدنوں اور لمبے لمبے بالوں پر نچھاور کر چکا تھا۔ میں عشق کرنے میں مصروف تھا۔ مجھ رومانیت پسند عاشق کے پاس سپاہِ شہدا کے بارے میں سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔ ہر تین دنوں بعد کسی سید کے قتل کی خبر ملتی تھی۔ اس کے ورثا ہجرت پر مجبور ہو جاتے تھے اور مقتول کا چہلم پردیس میں منایا جاتا تھا۔

Scanned with CamScanner

لیکن مجھے ان موجودہ خطروں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مولا کے تحفظ پر میرا بھروسا قائم تھا۔ مولا نے اپنے فضل وکرم سے میرے گھر کو تا حال سلامت رکھا تھا۔ بلائیں بظاہر ہمارے گھر کے راستے سے ناآشنا تھیں۔ اور میرا بھروسا قائم رہتا اگر ایک روز گھر کے پتے پر سپاہ شہدا کی طرف سے ایک چٹھی نہ آتی۔

میں ایک دل پھینک طالب علم تھا اور میرے ابو سرتاپا مجذوبیت میں ملبوس تھے۔ ہم دونوں بلاؤں کا سامنا کرنے کی طاقت سے محروم تھے۔ مجھے اپنی جان عزیز تھی، میں نے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ لیکن ابو نے ہلنے کا نام بھی نہیں لیا۔ وہ ان تھل والے سادات کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھے جو برسوں سے ان کی مجلسوں کو اپنی گریہ وزاری کا شرف بخش رہے تھے۔ میں نے اپنے ابو سے بارہا ساتھ چلنے کا التماس کیا لیکن انھوں نے میری نہیں مانی اور مجھے اکیلے جانا پڑا، آزردہ اور دل برداشتہ، ابو کو سپاہ شہدا کے شکنجوں میں چھوڑ کر۔

طرب نگر ہمارے صوبے کا وسیع ترین شہر تھا۔ میں نے طرب نگر کے ایک کالج میں داخلہ لیا اور مجھے کالج کے قدیم ہوسٹل میں ایک کمرہ مل گیا۔ لیکن کالج میں میری حاضری تھی نہ ہوسٹل میں میرا قیام تھا۔ اس شہر میں شعرا حضرات بڑی تعداد میں تھے اور میں ان کی صحبت میں اپنے شب وروز گزارتا تھا۔

شعرا حضرات کچھ مخصوص چائے خانوں میں منڈلی لگاتے تھے۔ میں چائے خانوں میں ہر وقت بیٹھتا تھا۔ بحثیں گرم تھیں، لیکن چونکہ غنیم کے پولیسے اور پولیسوں کے مخبر سب جگہ موجود تھے، چائے خانوں کے شعرا عموماً ولایتی ادب یا افلاطونی فلسفے کو اپنی بحثوں کا موضوع بناتے تھے۔ اور جب کوئی سرپھرا نوجوان ان طولانی اور بے معنی بحثوں سے اکتا کر غنیم پر تبصرہ کرتا تھا، کوئی نہ کوئی تیوری چڑھانے والا بابا اس سے چائے خانے سے تشریف لے جانے کی گزارش کرتا تھا۔ غنیم کے ڈر سے شعرا حضرات اپنے چائے خانوں میں صدائے احتجاج بلند کرنے سے قاصر تھے۔ لیکن چونکہ زمانے کے ظلم وستم پر سکوت اختیار کرنا ان کے شایانِ شان نہیں تھا، سب اپنے شاہپاروں میں غنیم کو استعاراتی اور کنایتی گالیاں دیتے تھے۔ غنیم کا قانون سخت تھا۔ گستاخانہ یا ناقدانہ باتوں کی پاداش میں مجرموں کو

Scanned with CamScanner

سرِ بازار کوڑے مارے جاتے تھے۔ ان کوڑوں نے سبھی زبانوں سے حق گوئی کی قوت چھین لی تھی۔ اور اس منافقانہ دور میں ایک ہی شاعر اپنی آواز بلند کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔ یہ صاف گو اور بے باک شاعر اصغر بخش تھا۔

اصغر بخش فربہ اور عیاش تھے۔ وہ ہر رات چائے خانوں کے منافقین کو خدا حافظ کہہ کر بازارِ حسن کا رخ کرتے تھے اور صبح تک شراب اور شہوت کے نشے میں دھت رہتے تھے۔ غنیم کی پولیس بازارِ حسن کو ختم کرنے میں ناکام ہوئی تھی۔ سب چکلے بظاہر بند تھے، لیکن پچھواڑوں میں سبھی دروازے کھلے رہتے تھے۔ شوقین لوگ ان دروازوں سے داخل ہوتے تھے۔ اصغر بخش بازارِ حسن کے ایک ایک خفیہ چکلے سے واقف تھے۔ میں ان کا شاگرد بن گیا تھا اور وہ میری تربیت کی خاطر مجھے اپنے ساتھ بازارِ حسن کی سیر کے لیے لے کر جاتے تھے۔ پوری راتیں چکلوں میں بسر ہوتی تھیں۔ وہاں میرے استادِ محترم ٹیڑھی میڑھی شکلوں والے دلّالوں کے ساتھ جوا کھیلتے تھے اور پوپلے منھ والے سازندوں کے ساتھ فقیری پیتے تھے۔ پھر رات بھیگ جاتی تھی۔ وہ وسکی پیتے پیتے حسیناؤں کے مجرے دیکھتے تھے، پھر ایک حسینہ کو چن کر چکلے کی بالائی منزل پر لے جاتے تھے۔ میں نیچے، رقص گاہ میں، گھڑی دیکھتے دیکھتے اپنے استاد کا انتظار کرتا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد میرے استاد رقص گاہ میں رونق افروز ہوتے تھے۔ ہم دونوں رخصت ہوتے تھے۔ استاد کے پاؤں لڑکھڑاتے تھے اور ان کے منھ سے شراب کی ڈکاریں آتی تھیں۔ ممکن نہیں تھا کہ انھیں اس حالت میں گھر بھیجوں، سو میں ان کو اپنے کندھے کا سہارا دے کر اپنے ہوسٹل تک لے کر جاتا تھا۔ میں ان کو اپنے کمرے میں سلاتا تھا، اپنے بستر پر لٹا کر۔ وہ لیٹتے ہی نشے میں سر ہلا کر اور آنکھیں میچ کر، تحت اللفظ ایک لرزاں آواز میں دس بارہ شعر کہتے تھے، جنھیں میں ایک شاگرد کی سی فرمانبرداری سے اپنی کاپی میں حرف بحرف رقم کرتا تھا۔ ان کے تحت اللفظ کہے ہوے اشعار اتنے رعب دار اور عمیق تھے کہ گمان نہیں گزرتا تھا کہ ان کی تخلیق کے وقت شاعر پوری طرح بدمست تھا۔ مصرعے مربوط ہوتے تھے اور الفاظ منظم۔ استاد کی ہنرمندی اور تخلیقیت مجھے پریشان کرتی تھی۔ شاعری ان کے گھر کی لونڈی تھی، جبکہ ملکۂ سخن تک میری پہنچ سطحی اور سرسری تھی۔

Scanned with CamScanner

طرب نگر میں دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ میں ایک بار بھی گھر نہیں لوٹا، اور میں نے آہستہ آہستہ گھر کی خبر لینی بند کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ابو خیریت سے تھے۔ سپاہ شہدا نے انھیں دھمکی دی تھی، لیکن مہلت کے ختم ہونے کے دو سال بعد بھی ان کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ انھیں یقیناً غیب کا نادیدہ تحفظ حاصل تھا۔ کوئی شر پسند ان کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتا تھا۔ ابو کی ماہ بینیاں، تھل نوردیاں اور فقیری نوشیاں بدستور جاری تھیں۔

یہاں طرب نگر میں میری تربیت زوروں پر تھی۔ میں استادِ محترم کے ساتھ باقاعدگی سے بازارِ حسن کی سیر کرتا تھا۔ یہ سیر خطرے سے خالی نہیں تھی، لیکن خطرہ عیاشی کی لذت کو بڑھاتا تھا۔ بازارِ حسن کے چاروں طرف پولیس کے ناکے تھے۔ ہمیں ایک تپلی گلی کے اندر سے گھسنا پڑتا تھا۔ اسی گلی سے ہم نشے کی حالت میں چند گھنٹے بعد نکلتے تھے۔ میں اپنی پہلے والی پاکیزگی کھو چکا تھا۔ میں اپنے استادِ محترم کی طرح جوا کھیلتا تھا، وسکی پیتا تھا، مجرے دیکھتا تھا، اور ڈلر بار رقاصاؤں کو بالائی منزل پر لے کر جاتا تھا۔ میں ہر لحاظ سے اپنے استادِ گرامی کا چربہ تھا۔

ان کا چربہ میں اس لحاظ سے بھی تھا کہ میں رات کے آخری پہروں میں بازارِ حسن سے لوٹ کر شراب کے نشے میں بہکتے ہوئے مشقِ سخن کرتا تھا۔ استادِ محترم کی صحبت میں میری غزلیں معیاری ہو گئی تھیں۔ نہ کوئی شعر معنی سے خالی تھا اور نہ کوئی مصرع وزن سے خارج۔ میں چائے خانوں میں ادبی بابوں کو اپنی غزلیں سناتا جاتا تھا۔ بابے ان کی سماعت فرما کر بہت دادیں دیتے تھے، لیکن سب اندر اندر کڑھتے تھے اور اصغر بخش سے جلتے تھے جس نے دو سالوں میں مجھ جیسے دیہاتی تک بند کو شعر تراشنے کے قابل بنایا تھا۔ پھر میں نے استاد کی معیت میں اپنا پہلا مشاعرہ پڑھا، اور مشاعروں کا سلسلہ چل نکلا۔ مجھے سب جگہ مدعو کیا جاتا تھا۔ میری آواز نوجوانوں کی آواز تصور کی جاتی تھی۔ میرے اشعار نوجوان پیڑھی کے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔ میری خوب حوصلہ افزائی ہوئی۔ میں نے غزلوں کے انبار لگائے۔ ایک مجموعہ خود بخود مرتب ہو گیا۔ حضرت اصغر بخش نے اس مجموعے کا دیباچہ لکھا جس میں وہ اپنے قابل ترین شاگرد کو ایک خراج پیش کر رہے تھے۔ مجموعے کی کافی کاپیاں بک گئیں۔ مجموعے اور مشاعروں نے مجھے بہت نفع دیا۔ میں ذہنی اور معاشی طور پر پوری طرح خود کفیل ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

ان سلسلوں کی بدولت مجھ میں ایک نئی شخصیت ابھری تھی اور میری سابقہ شخصیت حذف ہوگئی تھی۔ گھر کی یاد پوری طرح مٹ گئی تھی اور میرا ماضی میرے پیچھے کھسکتا چلا جارہا تھا۔ ابو، سپاہِ شہدا، سپاہِ شہدا کی دھمکیاں، دھمکائے جانے والوں کی موت، موت کا ڈر، سب ماضی کے قصے تھے۔ یہ انوکھے پرندے میری زندگی کی شاخ سے کب کے اڑ چکے تھے۔ امروز کے دلکش چمن سے دیروز کا کریہہ سایہ کب کا ہٹ چکا تھا۔ لیکن میرے ماضی نے رفت گزشت ہونے سے پہلے مجھ سے انتقام لیا اور میرے چمن نے اس کے وار سے ایک کاری زخم اٹھایا۔

اب میرا ہوسٹل کا کمرہ میرا حقیقی گھر تھا۔ دنیا میں میرے لیے یہی رین بسیرا تھا جہاں میں مشاعروں اور بازارِ حسن سے لوٹ کر قیام کرتا تھا۔ اسی کمرے پر میں رات کے تین چار بجے، رقاصاؤں کے سستے عطر سے معطر ہوکر، ہواؤں میں سگریٹ کے بے معنی چھلے بناتے ہوئے، لڑکھڑاتے پاؤں سے واپس آتا تھا۔ میں اس وسیع وعریض ہوسٹل میں دیر تک اپنا کمرہ ڈھونڈتا تھا اور تلاشِ بسیار کے بعد جب میں کمرے کا تالا کھولتا تھا تو مجھ میں صرف بستر پر لڑھکنے کی سکت ہوتی تھی۔ میں تیزی سے نیند کے ٹھنڈے پاتال میں اترتا چلا جاتا تھا۔ اس میں اکثر مقبول ومقتول سیاست دان کی صاحبزادی مجھ سے ملنے آتی تھیں۔ صاحبزادی صحرائی زنداں میں اپنی سزا کاٹنے کے بعد جلاوطن ہوگئی تھیں۔ وہ ولایت سے اپنے والدِ مرحوم کی سیاسی جماعت چلاتی تھیں۔ وہ اپنی مصروفیات سے فرصت نکال کر میری نیندوں کے پاتال میں اترتی تھیں۔ ان کی نفیس خوشبو پاتال کی شب گزیدہ ہوا پر غلبہ پاجاتی تھی اور پاتال کی تاریکی ان کے چہرے کے نور سے مات کھاتی تھی۔ ان کی آنکھیں جھلمل جھلمل کرتی تھیں اور پاتال منور ہوجاتا تھا۔ اس منور فضا میں صاحبزادی کے تن بدن کا سارا نقشہ آشکارا ہوجاتا تھا۔ ان کے باریک لباس کے آرپار ان کی چھاتیاں، ان کی ناف اور ان کی رانیں نظر آتی تھیں جنھیں دیکھ کر میں بہک جاتا تھا۔ لیکن میری سیدانہ تہذیب نفس صاحبزادی کی پاکیزگی کا دفاع کرنے پر فوراً آمادہ ہوجاتی تھی اور احترام میری امنگوں پر غالب آتا تھا۔ اس اثنا میں صاحبزادی میری نگاہوں کی شہوت سے ناراض ہوچکی ہوتی تھیں۔ وہ بولنے پر راضی نہیں تھیں۔ اظہارِ خیال کے لیے وہ اشاروں سے کام لیتی تھیں اور اشاروں سے پاتال کی ایک دیوار کی طرف مجھے توجہ

Scanned with CamScanner

دلاتی تھیں۔ اس دیوار پر یزیدیوں کی فلم چلتی تھی۔ ان کے کارواں ہمارے وطن کی طرف گامزن تھے۔ ان کے خچروں، اونٹوں اور گھوڑوں پر کلاشنکوف، اسٹنگر اور مشین گن کی لمبی نالیاں چمکتی تھیں۔ یزیدی بیرونِ ملک سے تربیت لینے کے بعد ہمارے وطن کے بیابانوں اور شہروں کی طرف آ رہے تھے۔ وہ بارودی سرنگیں بنانے، دستی بم اچھالنے اور شب خون مارنے میں ماہر ہو گئے تھے۔ وہ نت نئے ظلموں پر کمر بستہ تھے۔ وطن کی معذور سرحدیں اور عاقبت نا اندیش فوج اس لشکرِ جفا کو روکنے کی کہاں اہل تھیں! میں گھبرا جاتا تھا، میری دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں اور میری آنکھیں یکدم کھل جاتی تھیں۔ نیند کے منور پاتال کی جگہ میرے ویران سیلن زدہ کمرے نے لی تھی۔ صاحبزادی اپنی خوشبو اور خاموشی لے کر ولایت چلی گئی تھیں اور یزیدی لشکری ہنوز بیرونِ ملک میں تربیت کے مدارج طے کر رہے تھے۔ مجھے اپنے خوابوں سے پیشگوئیوں کی بو آتی تھی۔ ممکن تھا کہ ابو کی پیشگویانہ صلاحیت میری دسترس میں آئی تھی۔ لیکن جب ابو حیات تھے، مجھے ان کی وراثت کیوں ملی تھی؟

پھر ایک رات صاحبزادی ایک غیر معمولی پوشاک زیبِ تن کر کے میری نیندوں کے پاتال میں آئی۔ اس نے اپنے باریک لباس کی جگہ ایک ڈھیلا ڈھالا برقع پہنا تھا۔ اس کے تن بدن کا حسن سیاہ رنگ میں پنہاں تھا۔ حجاب سے اس کے چہرے کا دائرہ جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوگوار تھیں۔ ان آنکھوں کی سوگ بھری خاموشی مجھے پرسہ دے رہی تھی۔ لیکن یہ پرسہ کس لیے تھا؟ میرا کون سا عزیز ملکِ عدم کا راہی بن گیا تھا؟ میں نے صاحبزادی سے پوچھا، ''میڈا کیہڑا عزیز مر گیا؟'' اور اس نے لب کھولے بغیر پاتال کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک تابوت پڑا تھا۔ تابوت میں ایک کفنائی ہوئی ہستی ابد کی نیند سو رہی تھی۔ اس ہستی کا چہرہ کفن سے ابھرا تھا۔ وہ ایک مانوس چہرہ تھا، ایک غمگین اور دیوانہ، حزیں اور ہزیمت خوردہ چہرہ، جس کو میں نے ہزار بار دیکھا تھا۔ اور وہ کسی مقتولِ جفا کا چہرہ تھا کیونکہ اس کے ماتھے پر ایک گولی کا نشان نمودار تھا۔ وہ میرے والدِ محترم کا چہرہ تھا۔

میری نیند کھلی۔ ایک انجان مخلوق میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ اس کابوس کے بعد کون آدمی مجھ سے ملنے کا خواہاں تھا؟ میں اپنے بستر سے اٹھا اور میں نے دروازہ کھولا۔ میرے ہوسٹل

کے وارڈن صاحب میری دہلیز پر کھڑے تھے۔ وارڈن صاحب ایک عام نوکر کی طرح شرمندہ اور لاچار تھے۔ ان کی آنکھیں دو زخمی ابابیل تھیں، ان کا چہرہ ایک اداس گھونسلا تھا۔ اس سنجیدہ اور رنجیدہ آدمی کے آگے میں کتنا بے ڈھب لگ رہا تھا۔ میں ایک سمندری لٹیرا تھا۔ میرے بالوں کو پردیس کی ہواؤں نے بکھیرا تھا اور میرے تن بدن کو جزیرے جزیرے کی پریوں نے اپنے ناخنوں سے نوچا تھا۔ میرے منھ سے ولایتی مشروبات کی غلیظ بو آ رہی تھی اور میری آنکھوں میں قحبائی وصلتوں کا نشہ باقی تھا۔ لیکن وارڈن صاحب میری خوبو سے سراسر غافل تھے۔ وہ مجھے ایک بری خبر سنانے آئے تھے۔ میری بستی سے ایک کال آئی تھی۔ میرے والد صاحب رات کو قتل ہو گئے تھے اور مجھے شام تک ان کے جنازے میں شریک ہونا تھا۔

میں اپنے بھولے بسرے گھر کی طرف روانہ ہو گیا اور راہِ دور دراز طے کر کے شام کے وقت گھر پہنچا۔ جنازہ میرے آتے ہی اٹھ گیا۔ میں میت اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۔ ابو کی میت انتہائی بھاری تھی، گویا اس میں سادات کی گزشتہ تاریخ کے سارے دکھ سما گئے ہوں۔ جنازے کے تمام شرکا مہر بہ لب تھے اور خاموشی کے بے کنار سمندر پر افسوس کی ناؤ ڈولتی تھی۔ زوال آمادہ سورج لہولہان تھا اور رات سوگ کا لباس پہن کر دبے پاؤں آ رہی تھی۔ قبرستان تھل سے متصل تھا۔ قبرستان تک پولیس کا ایک دستہ ہمارے ہمراہ تھا جس کی ساری نفری خوف سے کانپ رہی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ جہاں جہاں یزیدیوں کے دشمن مجمع لگاتے ہیں، وہاں وہاں موقعے کی تاک میں یزیدی پھرتے ہیں۔

ہم قبرستان پر پہنچ گئے۔ ابو کی خالی قبر میری والدہ کی قبر کی بغل میں میت نگلنے کی منتظر تھی۔ ہم نے اس بھوکی قبر میں میت اتاری۔ میں تلقین کے لیے قبر میں اترا۔ اوپر دھرتی کے پشتے پر ایک ریش دار آدمی دعا پڑھ رہا تھا۔ نیچے زمین تلے میں اپنے بازوؤں کے تیشوں کو جوڑ کر ابو کے کفنائے ہوئے کاندھوں کو اٹھا رہا تھا۔ ابو کی میت حنوط شدہ لگ رہی تھی۔ میت کا انگ انگ اکڑا ہوا تھا۔ میت میں ایک سانپ کی سوکھی ٹھنڈ تھی۔ تلقین کے دوران میں خوب پسینہ بہا رہا تھا اور نیچے میرے پسینے کے قطرے کفن کے سمندر میں جذب ہو رہے تھے۔ اس سمندر پر لہریں ہی لہریں تھیں۔ اور اچانک ان

Scanned with CamScanner

لہروں سے ابو کا چہرہ ابھر آیا۔ ان کا چہرہ کالا تھا، ان کے لب سفید تھے، اور ان کے چوکور ماتھے پر موت کا تلک جھلک رہا تھا۔ فقط ایک گولی اس ماتھے میں اتاری گئی تھی۔ فقط ایک گولی ان بخیل یزیدیوں کی طرف سے ابو پر خرچ ہوئی تھی جس کے وسیلے سے ان کی فلک بجو روح جسدِ خاکی سے رہائی پا گئی تھی۔ اس تلک کو دیکھ کر میں بلک گیا۔ پشیمانی مجھے دھنس رہی تھی۔ افسوس مجھے کھا رہا تھا۔ یہ تلقین ایک کٹھن سزا تھی۔ اچانک میرے کانوں میں ایک آواز گونجی: ''پتر، جی بھر کے رو، پر ایہہ گل یاد رکھیں کہ میدانِ کربلا وچ علی اکبر نے اپنے پیو کول پہلے شہید تھیناں اپنا فرض سمجھیا ہے تے توں شہر دے گشتی خانیاں وچ اپنے پیو دی شہادت دا انتظار کریندا رہیا۔''

دھرتی پر ریش دار آدمی کی دعا جاری تھی۔ دھرتی تلے میں تائب ہو رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے نالائق ہاتھ میرے والد شہید کو کروٹیں دینے کا حق نہیں رکھتے۔ میں ایک گھٹیا آدمی تھا، ایک فرزندِ ناخلف، ایک شہدہ، جبلت اور شہرت کی بندگی کرنے والا۔ شرکائے جنازہ اگر مہذب نہ ہوتے تو مجھ پر تھوک دیتے، اور میں ان تھوکوں کے لائق بھی نہیں تھا۔

ریش دار آدمی کی دعا ختم ہو گئی۔ میں نے قبر کی دائمی گہرائیوں سے نکل کر زمین کی فانی ریت پر پاؤں دھرے۔ شرکائے جنازہ قبر میں مٹی پھینکنے لگے، لیکن میری ندامت نے مجھے ان میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ میرے ابو کو یقیناً میری دوزخی مٹی کی ضرورت نہیں تھی۔ سو میں قبرستان سے رخصت ہو گیا۔ میرے پاؤں بس اڈے کی طرف اٹھ گئے۔ وہاں طرب نگر کی بس میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ بس چل پڑی۔ میں پچھتاوے کی طویل یاترا پر چل نکلا۔

طرب نگر واپس آنے کے بعد میں نے اپنے ہوسٹل کے کمرے میں پناہ لی اور میں اس کمرے میں نظر بند ہو گیا۔ میرا دروازہ مقفل تھا۔ باہر نکلنا میرے لیے حرام تھا۔ میری آنکھوں کو نہ دن نہ رات دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ عزلت میری سلطنت اور میری قید تھی۔

میں دن رات اپنے بستر پر دراز رہتا تھا اور کروٹیں لیتے لیتے عجیب عجیب لفظوں کا ورد کرتا رہتا تھا۔ میرے ابو کی دیوانگی پنچھی بن کے، ان کے جسدِ خاکی سے اڑتے ہوئے، میری ذات کی ڈالی

پر آ گئی تھی۔ اس دیوانہ کیفیت میں ابو کا مردہ چہرہ میری آنکھوں میں ہر وقت پھرتا تھا۔ نیند مجھ سے گریزاں تھی۔ احساسِ گناہ مجھے ایک پل بھی سونے نہیں دیتا تھا۔ میں کبھی خوابوں، کبھی بیداری میں ایک منظر بار بار دیکھتا تھا۔ میں ایک طمنچہ دیکھتا تھا، ابو کے ماتھے کی طرف تنا ہوا۔ ایک منہ ''کافر'' کا لفظ اگل رہا تھا، ایک گولی کی آواز فضا کو چیر رہی تھی، اور تھل کا ریشمی دامن ابو کے خون سے داغدار ہو رہا تھا۔ اب ابو کی روح مجھ سے انصاف مانگ رہی تھی۔ یہ انصاف بھلا مجھ جیسا کمزور اور عیاش انسان کہاں سے لا سکتا تھا؟ اور کس طرح؟ یہ دونوں سوال مجھے دن رات تڑپاتے تھے، اور میں لاجواب رہتا تھا۔

دیوانگی نے عزلت نشینی سے مل کے میرے کمرے کو ایک آبدوز میں بدل دیا تھا۔ یہ آبدوز نہ جانے کن پانیوں میں اترتی جا رہی تھی۔ شروع شروع میں ساحل سے کچھ آوازیں آتی تھیں۔ میرے ہوسٹل کے لڑکے مجھے اپنی آبدوز سے باہر آنے کو کہہ رہے تھے، لیکن آبدوز کسی وجہ سے رک ہی نہیں پا رہی تھی، اور ساحل والوں کی آوازیں یکے بعد دیگرے فنا ہو گئیں۔ ایک اتھاہ خاموشی ہر سو پھیل گئی۔ یہ خاموشی مجھے ایک فیصلہ سنانے پر اکسا رہی تھی۔ میرا دماغ گہرائیوں میں اترتے اترتے آہستہ آہستہ دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو گیا تھا۔ میرے پہلے والے وسوسے ساحل پر رہ گئے تھے اور میں مقدر کے اندوہناک اژدہے کی قدم بوسی پر راضی تھا۔ اگر میں اپنے ابو کو انصاف نہیں دلا سکتا تھا تو کم از کم ان کا جانشین بن سکتا تھا۔ میں نے بستی واپس جانے کا فیصلہ کیا اور ذاکری کرنے کی ٹھان لی۔

ابو کی پہلی برسی بستی میں منائی جا رہی تھی۔ ان کے عزیز اور شیدائی تھل کے اطراف و جوانب سے حاضری دینے آئے تھے۔ اس موقعے پر مجھے اپنی پہلی مجلس پڑھنی تھی۔ بستی کے عزاخانے میں سینکڑوں سیاہ پوش سامعین اکٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ہر طبقے کے لوگ موجود تھے — کسان، چرواہے، دستکار، دکاندار، زمیندار اور افسرانِ بالا — اور سب یکساں طریقے سے دوپہر کی شدید گرمی میں جھلس رہے تھے۔ عزاخانے کے پنکھے خراب تھے۔ ہوا گراں اور تپاں تھی۔ سامعین کے سیاہ کپڑے پسینے میں تر بتر تھے۔

میں بھی سیاہ پوش تھا اور اس گردن جھکانے والی گرمی کے باوجود منبر پر سیدھا بیٹھا تھا۔ میرے

Scanned with CamScanner

شانے ایک پشمینے کی قیمتی شال سے آراستہ تھے۔ یہ شال اس شدید گرمی سے میری بے سروکاری کا ناقابلِ تردید ثبوت تھی۔ سرمے کی آمیزش سے میری آنکھیں شعلہ بار ہوگئی تھیں اور میں پورے زور سے آبدوز میں گزارے ہوئے دنوں کی کیفیت کو اپنے دل و دماغ پر طاری کر رہا تھا۔ آبدوز میں زیرِ آب ہو کر میں نے وقت کے بھنبھناتے لمحوں کو خاموشی کے مرتبان میں قید ہوتے دیکھا تھا۔ اس آبدوزانہ کیفیت کے اثر میں آ کر میں نے اپنی اولین مجلس کا آغاز کیا۔

آغاز ایک لمبی دعا سے ہوا۔ دعا پڑھتے وقت میری آواز سپاٹ تھی اور میرے لبوں سے ایک ماورائی سُر اڑ رہا تھا۔ دعا ابو کی روح کے دائمی سکون کے لیے تھی۔ میں وقفے وقفے سے اپنا ماورائی سُر الاپتے ہوئے سامعین پر نظریں جماتا تھا۔ میں ان کو ایک خوفناک انداز میں دیکھتا تھا، گویا میں نے ان کی صفوں میں اپنے ابو کا قاتل پکڑا تھا۔ میری آنکھیں سرخ تھیں۔ ان آنکھوں نے دشمنوں کا خون بہت پیا تھا۔ یہ مجلس ان دشمنوں کے لیے ایک تنبیہ تھی جنھوں نے ہماری خاندانی ذاکری کو تہس نہس کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

میں نے اپنی دعا ختم کی اور اہلِ مجلس کو بلند ترین آواز میں نعرۂ حیدری لگانے کو کہا۔ فرمانبردار سامعین نے نعرہ لگایا۔ میں نے ان کو فتح مندانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ میرے ماتحت تھے، میرے وفادار سپاہی۔ میں ان کا امام اور سالار تھا۔ نعرۂ حیدری ہمارا اعلانِ جنگ تھا۔ میں لڑائی سے پہلے اپنے مجاہدوں کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ دشمن ہمارے دشت میں خیمہ زن تھے۔ ان کا تعلق سپاہِ شہدا سے تھا۔ سپاہِ شہدا سپاہِ یزید کی ایک پلٹن تھی۔ سپاہِ شہدا ہمیں بہت سے چراغوں کی تابنا کی سے محروم کر چکی تھی۔ ہمارے کتنے روشن دماغ بزرگ اور بھائی ان کی گولیوں سے وفات پا چکے تھے۔ سالوں سے ابلیس کے یہ حواری ہماری گلی کوچوں اور صحراؤں میں پھر رہے تھے اور سادات کی جان لے کر اپنی نئی کارستانیوں کی نوید دینے اپنے یزید کے مکروہ دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ انھی لوگوں نے ایک سال پہلے ایک نیک سید کا خون کیا تھا۔ وہ حضرت میرے والدِ محترم تھے جن کی ناوقت رحلت کا افسوس کرنے ہم سب یہاں موجود تھے... میں بولتا جا رہا تھا۔ میری آبدوزانہ کیفیت مجھ سے بہت کچھ بلوا رہی تھی۔ سامعین میرا ایک ایک فقرہ ذہن نشین کر رہے تھے۔ ایک نیا خون میری رگوں میں رواں تھا۔ ابو کا خون رائیگاں نہیں گیا تھا۔ اس خون کی ایک ایک بوند، میری شریانوں میں جم کر میری ذات کو

ایک نئے جوش سے نوازے جا رہی تھی۔

مجلس کا پہلا حصہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے ڈھیروں سیاسی اور غیر سیاسی باتیں کی تھیں۔ اب اس دنیا کو طاقِ نسیاں پر رکھ کے دین کے تقاضے پورے کرنے تھے۔ مصائب بیان کرنے تھے۔ میں نے آنکھیں میچ لیں، اور میرے آگے کا منظر بدل گیا۔ میں نے پورے سوز و گداز سے منظر کا ایک ایک جزو بیان کیا۔ سامنے ایک دور افتادہ آسمان تھا۔ کربلا کا دلگیر سورج اس آسمان کا اسیر تھا۔ اس سورج تلے میدانِ جنگ میں اکہتر میتیں پڑی تھیں اور خیموں سے سیدانیوں کے بین بلند ہو رہے تھے۔ بین کی آواز میدان میں آپ کے گوشِ مبارک تک آ رہی تھی۔ آپ اکہتر میتوں کی خاموش منڈلی میں تن تنہا تھے اور بارہ کوفی گھڑسوار آپ کو گھیر رہے تھے۔ آپ کا دستِ مبارک آپ کی تلوار کے قبضے پر تھا اور آپ، ان ظالم نیزوں سے غافل جو کہ آپ کے شکستہ تن پر برسائے جا رہے تھے، اور ان جابر پتھروں سے بے پروا جو کہ آپ کے رستے ہوئے زخموں پر پھینکے جا رہے تھے، ملک الموت سے آنکھیں ملا رہے تھے۔ آپ کے مبارک چہرے پر ایک ایسا کرب جلوہ دے رہا تھا جو کہ میں نے اپنے ابو مرحوم کے چہرے پر پہلے دیکھا تھا۔ اور آپ کے خدوخال میرے ابو سے اتنے مماثل تھے کہ میں اس ہم آہنگی سے دھوکا کھانے لگا تھا۔ ابو میرے سامنے تھے۔ وہ امام عالی مرتبت کے لبادے میں ظہور کر رہے تھے۔

میں نے اس وقت آنکھیں کھولیں۔ جو منظر میری پلکوں کی اوٹ میں پنپ رہا تھا وہ اوجھل ہو گیا۔ اس کی جگہ ایک عزاخانہ تھا، رقت اور آہ و بکا کے حصار میں۔ ساری مجلس گریے میں آئی تھی۔ کوئی رومال سے اشک پونچھ رہا تھا، کوئی گلا پھاڑ کر رو رہا تھا، کوئی پورا زور لگا کے چھاتی پیٹ رہا تھا۔ اور ان اشک شوئیوں، آہ و زاریوں اور سینہ کوبیوں نے ایک عجیب شدت سے میرے حوصلے بڑھائے۔ بولتے بولتے میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پشمینے کی شال کو اٹھایا اور یوں مروڑا اور گرداگرد لہرایا گویا وہ کسی یزیدی کا ملعون جسم تھا۔ مجھے اس دشمن بدعہد سے نبرد آزما دیکھ کر سامعین چیخ چیخ کر کہرام مچانے لگے۔ قیامت قریب تھی۔ یہ قیامت میری انتھک محنت کا پھل تھی۔ یہ حشر میرے الفاظ کے اسلحوں نے برپا کیا تھا۔ میں مطمئن تھا۔ میری آنکھیں اور میرے کان جشن منا رہے تھے۔ اور اچانک ایک معجزہ ظہور پذیر ہوا۔ عزاخانے کی چھت کھل گئی اور میرے پاؤں خود بخود منبر سے اٹھ

Scanned with CamScanner

گئے۔ میں ہوا کے زینے پر چڑھ رہا تھا۔ میں بلند سے بلند تر ہو رہا تھا۔ میں سوے فلک جا رہا تھا۔ پھر میرے آگے آسمانی رفعتوں میں ایک درخشاں دروازہ اجاگر ہوا۔ وہ باب الشہدا تھا۔ حضرت امامِ پاک اس کی دہلیز کو پاٹ کر فردوسِ بریں میں داخل ہو گئے تھے۔ اب باب الشہدا کے باہر سینکڑوں متوفی سادات کا جمگھٹا تھا۔ فرشتے باری باری ان کی تفتیش کر رہے تھے۔ صاف باطن سادات فرشتوں سے پروانۂ راہداری لے کر اندر چلے جاتے تھے۔ دعوے کرنے والے سادات زندوں کی سرزمین کی طرف واپس بھیجے جاتے تھے۔ اور اس جمگھٹے میں اچانک میرے ابو مرحوم مجھے نظر آئے۔ وہ عرش کے فرشتوں کا آشیرباد لے کر باب الشہدا کی دہلیز الانگھ رہے تھے۔

ابو کا دیدار مکمل نہیں ہونے پایا تھا کہ کششِ ثقل میرے پاؤں کھینچنے لگی۔ میں منبر پر واپس آ گیا۔ معجزے کے دوران میری مجلس اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ سامعین نے مجھے یوں مبہوت اور بے صدا پا کر تھوڑی دیر صبر کیا تھا۔ پھر جب انھوں نے مجھے اپنی معجزہ بینی میں پوری طرح غرق دیکھا تھا تو وہ سب ایک ساتھ اٹھ گئے تھے۔ اب عزاخانے میں خاموشی کا راج تھا اور اندھیرے کی حکمرانی۔ میں بے یقینی سے اپنے گرد و پیش دیکھ رہا تھا۔ اتنے کم لمحوں میں اتنا وقت کیسے گزر را تھا؟ اچانک فرش پر کچھ کرنیں پڑنے لگیں۔ چاندنی عزاخانے کے ایک دریچے سے جھانک رہی تھی اور وہ مجھے دیدار پر بلا رہی تھی۔ میں عزاخانے سے نکلا اور لمبے قدموں سے تھل کا رخ کرنے لگا۔ تھل میں ریت کے ٹیلے رقصاں تھے۔ چاندنی انھیں نچا رہی تھی۔ اور اب مجھے یقین تھا کہ کسی نہ کسی ٹیلے کے جنباں دامن میں مجھے اپنے ابو کا سایہ دکھنے والا تھا۔

اس مجلس کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا— ذاکری کا دور۔ جس کثرت سے مجھے کچھ عرصہ پہلے مشاعروں کے دعوت نامے ملتے تھے، اب اسی کثرت سے مجلس پڑھنے کی فرمائشیں میری طرف آتی تھیں۔ عزاخانے میری بے خودی کے قائل تھے۔ اہلِ مجلس کو میری آبدوزانہ کیفیت کا انتظار رہتا تھا۔ سارا جہاں میرا مجذوبانہ بیان سن کر وجد میں آتا تھا اور میری مقبولیت صبا رفتاری سے ملک کے اطراف و جوانب میں پھیلتی تھی۔ مجلسیں پڑھنے کے لیے میں ملک کے گوشے گوشے کا سفر کرتا تھا۔ کچھ کوہستانی گوشے تھے، برف سے ڈھکے ہوئے، جہاں اہلِ مجلس کے دانت ہر وقت بجتے تھے۔

Scanned with CamScanner

کچھ سرحدی گوشے تھے جہاں ہمارے علم ہمسایہ ملک کے فوجیوں کے اہداف بنتے تھے۔ کچھ صحرائی گوشے تھے جن کی ویرانیوں میں میری آواز صدائے بازگشت بن کر دس میل آگے سنی جاتی تھی۔ اور کچھ ساحلی گوشے تھے جہاں ہواؤں کی منہ زوری اس قدر تھی کہ مجھے سامعین تک اپنے الفاظ پہنچانے کے لیے چیخنا پڑتا تھا۔ یہ سارے گوشے میرے دیکھے بھالے تھے۔ لیکن کسی گوشے کی مجھ پر چھاپ نہیں پڑی تھی۔ نام اور نقشے مجھے بھول جاتے تھے۔ کہاں کس طرح کے چہرے پائے جاتے تھے؟ کہاں کس طرح کی قدرت دیکھی جاتی تھی؟ مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ بس سفر یاد تھے۔ ان سفروں میں دو چار بندوق بردار میرے ساتھ ہوتے تھے اور ہم ایک بکتر بند گاڑی میں بیٹھ کر دشت و جبل، کوہ و دمن، بحر و بر سے گزر کر مختلف منزلوں پر پہنچتے تھے۔ منزلیں کثیر و متنوع تھیں لیکن سفر ہمیشہ ایک ہی طرح کے تھے اور مجلسوں کے رسم و رواج ایک ہی جیسے تھے۔ پورے ملک میں ایک ہی جیسے منبر تھے جن کو میری شعلہ بیانی بھسم کرتی تھی، ایک ہی جیسے عزاخانے تھے جو میری آہٹیں سنتے ہی میرے سحر تلے آتے تھے، اور ایک ہی جیسے سامعین تھے جو میرے عطا کردہ کرب و اندوہ کے لیے میرے بے حد شکرگذار تھے۔

میری مجلسوں کی طرز کیا تھی؟ سب سے پہلے میں مجلس کو گرمانے کے لیے اعدائے دین کا ذکر کرتا تھا۔ آج کل کے اعدائے دین سپاہِ شہدا کے رضاکار بن جاتے تھے۔ ایک سہ رکنی شوریٰ اس روسیاہ تنظیم کی روح رواں تھی۔ پہلا رکن ملک آفاق تھا جو اپنے تہہ خانے میں بیٹھ کر تباہی کے منصوبے بناتا تھا۔ دوسرا اکرم طرب نگری تھا جو بیرونِ ملک کی تربیت گاہوں میں نوخیز مرتدوں کو تعلیم جنگ دیتا تھا۔ تیسرا مولانا افضل طارق تھا جس کے منافرت انگیز خطبے دیہاتی اور شہری عوام کے ہوش اڑاتے تھے۔ میں ان تینوں ملعونوں کا نام لیتا تھا اور میرے سامعین، جو ان کا تذکرہ کرنے سے بھی ڈرتے تھے، میری دلیری کی داد دیا کرتے تھے۔ اس طولانی تمہید کے بعد میں مقرر سے ذاکر بن جاتا تھا اور اپنے منفرد انداز میں مصائب سنانے لگ پڑتا تھا۔ مصائب چھیڑتے ہی مجھ پر الہام نازل ہوتا تھا۔ میری آنکھوں میں کوہِ طور جیسی دمک تھی، میرے لبوں پر ڈھیروں مقدس نام کھلتے تھے، اور میری آواز میں سوز کے ایسے زیر و بم تھے کہ عرش کے مکین مجھ پر ترس کھا کر اپنی سیڑھیاں میری طرف اتارتے تھے۔ میں ان سیڑھیوں پر چڑھتا تھا اور غیب کی پناہ میں آتا تھا۔ غیب سے میری واپسی تاخیر سے

Scanned with CamScanner

ہوتی تھی۔ سامعین آنسو پونچھ کر مجلس سے اٹھ جاتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں تعجب اور رشک تھا۔ انسان ہو کے میں نے اتنا بلند مرتبہ کیسے حاصل کیا تھا؟

اس اثنا میں غنیم ایک طیارے کے حادثے میں مر گیا۔ جمہوریت بحال ہوگئی۔ صاحبزادی ولایت سے واپس آ گئیں اور واپس آ کر وہ میرے ابو کی پیشگوئی کے عین مطابق اپنے والد مرحوم کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئیں۔ لیکن ان کی حکومت یزیدیوں کا بال بھی بیکا نہ کر سکی۔ یزیدی ملک کے پہاڑوں اور صحراؤں کو اپنی کمیں گاہ بنا چکے تھے۔ کوئی انھیں روک نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنی کمیں گاہوں سے نکل کر ہمارے بھائیوں کو شہید کرتے تھے اور ہمارے مجمعوں کو گولیوں کے میلے بناتے تھے۔ ہمارے عزا خانے کیا، ہمارے قبرستان بھی ان ستم ایجادوں کی زد میں تھے۔ لیکن ہماری دُرگت کی طرف کوئی سیاست دان توجہ نہیں دیتا تھا۔ سب خوفزدہ تھے۔ سب نے اندر خانے یزیدیوں سے معاہدے کر رکھے تھے۔ لیکن ایک صاحبزادی تھیں جو اپنی تقریروں میں ہمارے دشمنوں کے خلاف آواز اٹھاتی تھیں۔ اور ہم ان سے بڑی خوش گمان قسم کی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے تھے۔ میں اپنی مجلسوں میں اکثر ان کی مدح سرائی کرتا تھا۔ میں سیاسی معاملوں میں پہلے سے زیادہ صاف گو اور جانبدار تھا۔ میری بے باکی میری شہرت کی کنجی تھی۔ میں تمام سادات کی نظر میں ایک جری اور سچا آدمی تھا، خوف اور بزدلی سے نابلد۔ میں ایک ملک گیر مسافر بھی تھا، اور ملک کے جس علاقے میں پہنچتا تھا وہاں ہمت اور شجاعت کے گل کھلاتا تھا۔ میں ہواؤں میں جنگ کا علم لہراتا تھا اور جنگ لڑنے کے لیے میں نے اپنے آپ کو آہن میں ڈھالا تھا۔ میری حرکات و سکنات اور میرے الفاظ لوہے کی طرح ٹھوس تھے اور میرا یہ لوہا میری دیوانگی کی حفاظت کرتا تھا۔

صاحبزادی کئی دنوں سے میرے سپنوں سے غائب تھیں۔ ان کی غیر حاضری میں مجھے اپنے سپنوں میں صرف اور صرف یزیدی نظر آتے تھے۔ ہر رات ان کے لمبے قافلے میری خوابیدہ آنکھوں سے گزرتے تھے۔ سب کے شانوں پر اے کے 47 جھولتے تھے، سب کی پیٹیوں پر دستی بم کھنکتے تھے اور سب کے سروں میں قتل و غارت کے خواب چمکتے تھے۔ اور ایک رات، ایک طویل وقفے کے بعد صاحبزادی میرے سپنوں میں واپس آئیں۔

Scanned with CamScanner

اس رات میں نے صاحبزادی کو دارالحکومت کے ایک تاریخی باغ میں تقریر کرتے دیکھا۔ اس تقریر میں وہ اپنے حامیوں اور شیدائیوں کے سامنے اپنے والد صاحب کی مثال پیش کر رہی تھیں جنھوں نے اپنے خون سے عوام کے پیار کا بدلہ دیا تھا۔ صاحبزادی اسی نسبت سے خود کو عوام کی بہن قرار دے رہی تھیں۔ ان کے الفاظ سن کر حامیوں اور شیدائیوں کے دل انس سے چھلک رہے تھے۔ سب وفا اور محبت کے نعرے لگا رہے تھے اور تقریر ان کے نعروں کے ساتھ ختم ہوئی۔ صاحبزادی ایک ذاکرہ کے سے رعب سے اپنے اسٹیج سے اتریں اور اپنی بکتر بند گاڑی کی طرف قدم بڑھانے لگیں۔ لیکن دل جلے حامی اور شیدائی ان کے قرب سے فیض پانے کے لیے انھیں گھیر چکے تھے۔ صاحبزادی کے محافظ بصد مشکل انھیں راستے سے ہٹا رہے تھے۔ صاحبزادی ان محافظوں کے جلو میں سلام کرتے ہوئے، ہلہ شیریاں سنتے ہوئے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے آ رہی تھیں۔ وہ آخرکار اپنی بکتر بند گاڑی پر پہنچ گئیں اور اس میں بیٹھ گئیں۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی، لیکن حامیوں اور شیدائیوں کا بے پناہ پیار صاحبزادی کی گاڑی کو ایک انچ بھی بڑھنے نہیں دے رہا تھا۔ گاڑی کا اتنی دیر تک ہجوم میں کھڑے ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس طرح ایک ناگ کو حامیوں اور شیدائیوں کے آگے پیچھے سے گزر کر اپنے شکار کی طرف رینگنے کی پوری مہلت مل رہی تھی۔ ناگ قریب آ رہا تھا اور صاحبزادی خطرے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھ کر اپنے ڈرائیور سے گاڑی کی چھت کھولنے کو کہنے لگیں۔ چھت فوراً کھل گئی اور صاحبزادی کھڑے ہو کر تمام آنکھوں کا چراغ بن گئی۔ وہ اپنی لمبی اور شائستہ انگلیوں سے وی کا نشان بنا رہی تھیں۔ اور اس نشان کو دیکھنے کے بعد حامیوں اور شیدائیوں پر گویا جنات کا حملہ ہوا۔ سب تڑپ رہے تھے، چیخ رہے تھے اور زقندیں بھر رہے تھے۔ بے ہنگمی کے ان لمحوں سے فائدہ اٹھا کر ناگ اپنے شکار کو ڈسنے کے لیے اچھل پڑا۔ ایک دھماکا ہوا۔ بیسیوں حامیوں کی انتڑیاں پیٹ سے خارج ہو کر زمین پر گر پڑیں۔ بیسیوں شیدائیوں کی کھوپڑیاں تنوں سے جدا ہو کر آسمان میں اڑ گئیں۔ صاحبزادی کی گاڑی اس دھماکے کی زد میں آ کر نذرِ آتش ہو گئی۔ آگ کے لمبے شعلوں تلے صاحبزادی کا خون ڈگمگا رہا تھا۔ باب الشہدا کی دہلیز پر ایک نئی روح پروانۂ راہداری کی منتظر تھی۔ لیکن میرا سپنا یہاں ختم نہیں ہوا۔ اب مجھے وہ میدانِ جنگ، جہاں صاحبزادی اپنے حامیوں اور شیدائیوں کے ساتھ کھیت ہوئی تھیں، رات کے آخری پہر کی پھیکی سی روشنی میں نظر آ رہا تھا۔ میدانِ جنگ شبنم

میں شرابور اور کہرے میں پوشیدہ تھا۔ میدانِ جنگ پر لاشیں اور انسانی اعضا جا بجا بکھرے تھے اور میدان کے اردگرد ایمبولینس اور پولیس کی وین کی بتیاں جھلک رہی تھیں۔ شہر کے تمام سائرن رات کے سناٹے میں بین کر رہے تھے۔ ان کی آواز سے میری نیند کھلی۔ میری آنکھیں نم تھیں۔ غیب سے ایک آئندہ شہادت کا پیغام ملا تھا۔

میں نے طرب نگر کے ایک نو آباد علاقے میں ایک کوٹھی کرائے پر لی تھی۔ میرے سفروں کے سلسلے میں جب کوئی وقفہ آتا تھا تو میں اسی کوٹھی میں آرام کرتا تھا۔ میں اس علاقے میں پوری طرح گمنام تھا۔ نہ میرے ہمسائے مجھے جانتے تھے نہ میرے آشناؤں کو میرے ایڈریس کا علم تھا۔ معاشرے کی نظریں میرے دروازے کی حد تک تھیں۔ میری دہلیز کے ساتھ وہ قیمتی خلوت شروع ہوتی تھی جس میں میں کسی کو مخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں رات بھر اپنی کوٹھی میں شرابیں پیتا تھا اور مشقِ سخن کرتا تھا۔ میری مجلسوں نے میری غزل گوئی کو ختم کیا تھا؛ میں اب صرف نعتیں، منقبتیں اور سلام لکھتا تھا۔ میرے تخیل کے پردے پر علی، حسین اور زینب کے مبارک چہرے ہر وقت روشن تھے۔ میں ان کی شان میں خامہ فرسائی کرتا تھا۔ شرابیں میرے ذہن کو نئے نئے زاویوں سے نوازتی تھیں۔ کچھ نادر سی تشبیہات اور عجیب سے استعارات میرے قلم سے نکلتے تھے۔ کچھ ماورائی مناظر میرے قرطاس سے ابھرتے تھے۔ لیکن میں اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ میں اپنے اشعار مجلسوں میں سناتا تھا، اور اہلِ مجلس رقت میں آنے کے لیے اختصار مانگتے تھے، تو میں دس بارہ بند میں اپنی تخلیقیں سمیٹتا تھا۔ بے تحاشا لکھنے کی مجھے تشنگی رہتی تھی۔ سو میں نے ایک روز پورے مہینے کی چھٹی لی اور اسکاچ کی تیس بوتلیں منگوائیں۔ پھر میں کوٹھی میں محصور ہو کر قرطاس کو سیاہ کرنے لگا۔ مجھے تب تک لکھنا تھا جب تک تشنگی تھی۔ اس تشنگی کو بجھانے کے لیے میں ایک عریض و بسیط نظم میں کائنات کے سارے انقلاب بیان کرنے جا رہا تھا۔ اس کائناتی نظم کو میں نے ''موجِ تخلیق'' کا عنوان دے رکھا تھا۔

میرا قلم تیس دن اور تیس راتیں رواں رہا۔ میں تیس دن اور تیس راتیں شراب کی مستیوں میں مستغرق رہا۔ میں اسکاچ کی بوتلیں ایک ایک کر کے پی رہا تھا اور نشے کی شدت میں کمی آنے نہیں دیتا

Scanned with CamScanner

تھا۔اس نشے کے تسلسل سے میری نظم ارتقا پذیر تھی۔ پہلے پہلے دنوں میں میں نے کائنات کی جگہ ایک خلائے محض دیکھا۔رب ہی یہاں زندہ اور پائندہ تھا۔رب کے سوا ایک ازلی خاموشی تھی اور ایک لامحدود ویرانی۔ پھر رب نے اپنی عبادت کے واسطے کرۂ ارض کو خلق کیا۔اور جلد ہی رب کے بھیجے ہوئے نبی اور رسول بساطِ ارض پر وارد ہوئے۔وہ رب کے پُرنور احکام ساتھ لے کر آئے تھے۔ان احکام کے نفاذ سے رب کی سلطنت صحراؤں، کوہوں اور وادیوں میں استوار ہوئی۔لیکن فتنے نے اس سلطنت کو زیروزبر کر دیا۔حق پرستوں کو مرتدوں کے زہر،تلوار اور تیرونشتر نے مار دیا۔نبی زادوں کی صف اجڑ گئی۔اور حسین بن علی نے اپنے بزرگوں کی طرح جامِ شہادت نوش فرمایا۔اور حسین بن علی کا نام شہادتوں کی خونم خون تاریخ میں جلی حروف میں درج ہو گیا۔شہادت کا نام ہے حسین۔ بغاوت کا نام ہے حسین۔دشمنوں کی مکار صفوں کے آگے شجاعت کا نام ہے حسین۔ میں اپنی کائناتی نظم کو ایک سلام کے ساتھ ختم کرنے پر مجبور تھا۔ذاکری میرے تن من پر غالب آئی تھی۔ میرا مجلسوں میں پروردہ تخیل مجھے ہر پل میدانِ کربلا کی طرف دھکیلتا تھا۔میں تیس دنوں اور تیس راتوں کے بعد شہادتِ حسین بیان کر کے خاموش ہو گیا۔میں نے اشعار سے سجے ہوئے قرطاس کے برابر اپنا قلم رکھ دیا،ایک آخری جام پیا اور ایک آخری سگریٹ جلایا۔کوٹھی کے باہر اس نو آباد علاقے کے مکان نیند سے بیدار ہو رہے تھے۔سورج کا آتشیں سیارہ ان مکانوں کی اوٹ سے ابھر رہا تھا۔سورج رفعتوں کی طرف گرمِ سفر تھا۔میں بہت جلد اسی طرح گرمِ سفر ہونے والا تھا۔شام کو مجھے ایک دور افتادہ قصبے میں ایک مجلس پڑھنی تھی۔

میری بکتر بند گاڑی کے شیشوں میں کچھ دیر تک شہر کے لاتعداد مکانات تانتا باندھتے رہے، پھر دیہات کے پہلے پہلے علاقے دکھائی پڑنے لگے۔فضا یخ تھی، دھند چھائی ہوئی تھی اور اس دھند میں ہماری سڑک عدم سے عدم کو جانے والی ایک راہگزر معلوم ہو رہی تھی۔شراب کا ذائقہ میری زبان تلے دفن تھا اور سفر میرے بچے کھچے خمار کو انگیز کر رہا تھا۔میری مست آنکھیں وقفے وقفے سے بند ہو جاتی تھیں،اور جب وہ کھلتی تھیں،طرح طرح کی زمستانی مخلوقات ان کے آگے شیشوں میں نمودار ہوتی تھیں۔کچھ بے چہرہ مخلوقات سڑک کے متوازی راستوں پر اپنی زنگ آلود سائیکلیں چلا رہی تھیں، کچھ

Scanned with CamScanner

منتظر مخلوقات استاپوں پر ٹرک کے غبار کو تک رہی تھیں، اور کچھ خانہ بدوش مخلوقات خچروں کے دوش پر نقل مکانی کر رہی تھیں۔ خانہ بدوشوں کے قافلے دیکھ کر مجھے ایک قدیم اور پاک قافلہ یاد آرہا تھا۔ آلِ نبی کا قافلہ پردۂ دماغ پر ابھر رہا تھا۔ دشتِ جفا اس سراسیمہ اور پریشان حال قافلے کی منزلِ مقصود تھا۔ پیاس آلِ نبی کو ستا رہی تھی۔ مشکیزے خالی کے خالی تھے۔ میں نے سوچا، شام کو میں کس طرح کی مجلس پڑھنے جا رہا تھا؟ میں شامِ غریباں یا شہادت سنانے والا تھا؟ میں نے یہ فیصلہ شام کے موڈ پر چھوڑ دیا۔

دیہات کی وسعتیں لاانتہا تھیں لیکن میں ایک ہی دن میں ان وسعتوں کو طے کر گیا۔ سورج زوال پر آیا تھا اور دیہاتوں کے بعد دشت کی بساط چار سو پھیل گئی تھی۔ دشت کی ریت میں ریت کا ایک قصبہ کھڑا تھا۔ میری ذاکری مجھے اس خاک نگر تک نہ جانے کیسے لے کر آئی تھی۔ مجلس پڑھ کر مجھے یہاں پر ایک رائیگاں شام گزارنی تھی، شراب اور نشے سے خالی۔ اس شام کے دل دہلانے والے تصور نے مجھے شہادتوں کی جگہ شامِ غریباں سنانے پر مجبور کیا۔

اس دور افتادہ خاک نگر میں میری مجلس اختتام پذیر ہوئی تھی۔ شامِ غریباں سناتے سناتے شام کا بیشتر حصہ بیت گیا تھا۔ سامعین نے میرے بیان کے وسیلے سے حسینی خیموں کو نذرِ آتش ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور خیموں سے بھاگنے والی سیدانیوں کی آہ و بکا سنی تھی۔ سیدانیاں اپنے بچوں کو گود میں اٹھا کر ایک ٹیلے کی چوٹی تک پہنچی تھیں۔ اس اونچی جگہ سے میدانِ جنگ نظر آرہا تھا جہاں اہلِ وفا اور اہلِ ستم کا خوں آشام تصادم ہو رہا تھا۔ میدانِ جنگ سے موت کی بو آرہی تھی۔ سیدانیاں اپنے ٹیلے پر مبہوت تھیں، اور وہ اچانک چونک پڑیں۔ ان کے پیچھے ایک گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔ گھوڑے کا شہسوار ایک لمبے حضرت تھے، ایک عبا میں محجوب، ایک شمشیر سے مسلح۔ زینب نے ان حضرت کو پہچانا۔ وہ ان کے والد محترم تھے۔ وہ سیدانیوں کے نالے سن کر ابدی نیند سے بیدار ہوئے تھے اور نجف سے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے گھوڑے سے اتر کر باری باری سب مستورات کو پیار دیا، اور جب انھوں نے زینب کو دیکھا تو شمشیر سے اپنی عبا کا ایک حصہ کاٹا اور اس عارضی پیوند سے اپنی بیٹی کا برہنہ سر ڈھانپا۔ پھر وہ گھوڑے پہ چڑھ کر اپنی آخری آرام گاہ کی طرف مراجعت کر گئے۔ میری مجلس اس نرالے منظر

Scanned with CamScanner

کے ساتھ ختم ہو گئی تھی۔

خاک نگر کے ناظم نے میرے اعزاز میں اپنے گھر ایک دعوت رکھی تھی۔ اس دعوت میں ناظم نے اس قصبے کی کچھ عظیم ہستیوں کو بلایا تھا — ایک مونچھوں والا چودھری، دو فربہ وکیل، ایک نابینا حکیم، دو بونے قاضی اور ایک گیسو دراز شاعر ان کے مہمان تھے۔ مجھے نوٹنکیوں کے ان سب کرداروں سے متعارف ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور یہ سب اپنے چکنے چپڑے الفاظ اور لیس دار فقروں سے میری تعریف و توصیف کرنے پر مصر ہوئے۔ میری طبیعت مالش کر رہی تھی۔ میں تنہائی کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میری شہرت یافتہ شال میں ایک ولایتی بوتل چھپی ہوئی تھی جو کہ ایک پراسرار مداح نے مجھے مجلس سے پہلے عنایت کی تھی۔ میں پہلی فرصت میں اس بوتل کو کھولنے جا رہا تھا۔ میں صبر و تحمل سے ایک مناسب موقعے کا انتظار کر رہا تھا، لیکن میری بوتل نوش ہونے کے لیے بے تاب تھی۔ وہ اندر اندر سے میری شال کو چاک کر رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اس شال میں ایک بوتل کی جگہ سپارٹا کے دلیر بچے کی لومڑی چھپا رکھی تھی۔

کھانا پروسا گیا۔ بیٹھک کی میز کے چمکیلے دسترخوان پر بریانی کا ایک پہاڑ جلوہ دینے لگا اور حلیم کی ایک جھیل جھلملانے لگی، اور ان دونوں پر کبابوں کے لشکر کا پہرہ تھا۔ میں نے ہاتھ دھونے کے بہانے بیت الخلا کی راہ لی۔ ایک تیرہ و تاریک گلیارے سے گزرا۔ پھر بیت الخلا پہنچا، جس میں داخل ہو کر میں نے اپنی شال کے اندر سے بوتل نکالی۔ میں نے بوتل کھولی اور منھ سے لگائی۔ وہ آتش سیال میرے حلق سے اترنے لگی جس کے سہارے کے بغیر میری شامیں بوریت سے کراہتی تھیں۔ لیکن آتشِ سیال کچھ زیادہ تیز تھی۔ میرا گلا جل رہا تھا۔ میری انتڑیاں اینٹھ رہی تھیں۔ میں نے ضد سے ٹیڑھی میڑھی شکلیں بناتے ہوئے تین گھونٹ پیے اور بوتل خود بخود میرے منھ سے سرک گئی۔ میرے جسم پر قیامت آ رہی تھی۔ میری ٹانگیں لرزاں تھیں، میرا منھ مسخ شدہ تھا، میری کمر خمیدہ تھی اور میری آنکھوں کے آگے سب چیزیں بے تحاشا بڑھ چکی تھیں۔ بیت الخلا کی زنجیر بامِ فلک کی اونچائی پر تھی اور بیت الخلا کا سوراخ سمندر کی طرح گہرا تھا۔ روزن سیاروں کی دوری پر تھے اور بوتل میں گنگا اور فرات کا سارا پانی سما چکا تھا۔ میں نے بوتل بند کی، شال میں چھپائی اور بیت الخلا سے نکلا۔ میں دوبارہ اس تیرہ و تاریک گلیارے سے گزرا جہاں سے میں دس منٹ پہلے نہ جانے کتنی امیدیں لے کر چلا آیا

Scanned with CamScanner

تھا۔ میں دعوت پر واپس جا رہا تھا لیکن میرا قیامت زدہ جسم مجھے ٹھیک طرح چلنے نہیں دے رہا تھا۔ میرا پیٹ ایک آتش کدہ تھا اور میرے حلق میں دو شیطانی انگلیاں گھسی ہوئی تھیں۔ میں ان انگلیوں کو نکالنے کے لیے زور زور سے کھانس رہا تھا۔ اور میں اس گمبھیر حالت میں دعوت کی میز پر پہنچا۔ سب مہمان مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میری طبیعت اچانک کیسے خراب ہوئی تھی؟ میں گرنے کو تھا۔ ایک مہمان میری مدد کو اٹھا۔ میں نے اس کو ہاتھ کے ایک اشارے سے سمجھایا کہ مجھے اس کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت مجھے اس وقت کسی انسان کی نہیں تھی۔ صرف مولا مجھے بچا سکتا تھا۔ اب ایک پورا ہاتھ میرے گلے کو مروڑ رہا تھا۔ کیا وہ ابلیس یا یزید کا ہاتھ تھا؟ معلوم نہیں۔ لیکن میری مزاحمت عبث تھی۔ یہی ظالم ہاتھ صدیوں سے سادات کی بستیوں، نسلوں اور فصلوں کا ستیاناس کر رہا تھا۔ میری ساری قوم اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی۔ میں کون تھا اس کو روکنے والا؟ میرا ذہن ماؤف تھا۔ میری آنکھیں بے نور تھیں۔ کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا سوائے ایک رنگ کے جس میں سب رنگ ضم ہوئے تھے؛ سوائے ایک روپ کے جس میں سب روپ ڈھل چکے تھے، سوائے ایک وجود کے جس میں سارے وجود شامل تھے۔ غیب کا لمس میرے رگ و پے میں گھل چکا تھا۔ میں ایک تڑاکے کے ساتھ زمیں بوس ہو گیا۔ جونہی میرا جسم فرش پر ڈھے گیا، میری شال کھل گئی اور میری بوتل خاک نگر کے ناظم اور اس کے معزز مہمانوں کے سامنے لڑھک گئی۔ اس خفیہ بوتل سے آٹھ دس گھونٹ پیے جا چکے تھے۔ اس بوتل کی دو نمبر شراب میں زہرِ ہلاہل تھوڑی مقدار میں ملا ہوا تھا۔

زہرِ ہلاہل ایک ہمسایہ قصبے کے فوجی ہسپتال میں میرے پیٹ سے نکالا گیا۔ میں اس ہسپتال میں چھ دن زیرِ علاج رہا اور ساتویں دن جب میں شفایاب ہو کر رخصت ہو رہا تھا، فوجی ہسپتال کے سفید داڑھی والے سرجن نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور سرگوشی میں ہجرت کا مشورہ دیا۔ ان کے نزدیک چونکہ میرا نام سپاہِ شہدا کی ہٹ لسٹ میں شامل تھا، تو میری اور میرے گرد و پیش کے لوگوں کی جان مستقل خطرے میں تھی۔ اس بار سپاہِ شہدا کے ستم گروں نے مجھے مارنے کے لیے زہر کا استعمال کیا تھا؛ اگلی بار وہ گولیوں اور بارود سے کام لینے جا رہے تھے اور میرے ساتھ میرے بیسیوں شیدائی کام آنے والے تھے۔ مجلسیں کہاں محفوظ تھیں؟ سپاہِ شہدا کی مار انتہائی لمبی تھی۔ ان کے نشانہ باز اگر چاہتے تو مجھے

Scanned with CamScanner

میرے گھر میں بھی مار سکتے تھے۔ میری ہجرت صرف میری نہیں، بلکہ بہت سارے افراد کی جان بچا سکتی تھی۔ میں تردد کے عالم میں ہسپتال سے روانہ ہوا۔ لیکن مجھے تھوڑی دیر بعد امریکہ کے سادات کی دعوت یاد آئی۔ کئی مہینوں سے وہاں کے کچھ مہاجر سادات مجھے بلا رہے تھے۔ ان کے بقول میں وہاں پرسکون سے مجلسیں پڑھتے پڑھتے کئی سال گزار سکتا تھا۔ پھر میں نے سوچا: کیوں نہیں؟ کچھ عرصے تک وہاں پناہ لی جاسکتی تھی۔ اس دوران شاید سپاہِ شہدا کے بدذات رضا کار مجھے بھولنے والے تھے۔ میں نے جلدی جلدی اپنی کوٹھی خالی کی، اپنا ویزا بنوایا اور امریکہ کے لیے روانہ ہوگیا۔

میں نے ایک طویل سفر کے بعد سات سمندر پار کی اس سرزمین پر قدم رکھا اور میں نے دیکھا کہ عفریت یہاں سے بہت گزرے تھے۔ انھوں نے یہاں کی سب چیزیں تراشی تھیں —— پہاڑ، خیابان اور خرابے —— اور وہ سبکدوشی لے کر، اپنی آخری عمر میں، پتھرانے کے بعد اونچی عمارتوں میں بدل گئے تھے۔ میں نے اسی طرح کی ایک عفریتی عمارت کی بیسویں منزل پر امریکہ میں اپنی پہلی مجلس پڑھی۔ شہر کی افقی اور عمودی روشنیاں اس بیسویں منزل کے عزاخانے میں جگمگا رہی تھیں۔ میں ان روشنیوں کے سحر میں آکر روشن بیاں ہوگیا تھا اور امریکہ کے سادات مجھ سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ امریکہ کے چاروں طرف سے بلاوے آئے۔ ہیوسٹن، ڈیلس، نیویارک اور سان دیاگو میں مجھے یاد فرمایا گیا۔ میں نے ان سب شہروں میں جاکر مجلسیں پڑھیں۔ اور مزید مجلسوں کے لیے مزید شہروں سے بلاوے آئے۔ ایرپورٹ، ہوٹل اور ہائی وے میرے دن رات کے ساتھی بن گئے۔

جہازوں کے دریچوں سے اور کمروں کی کھڑکیوں سے میں اس نئی سرزمین کا معائنہ کرتا تھا۔ شہر یہاں متعدد تھے لیکن جنگلوں، پہاڑوں اور دشتوں کو شمار کرنا ناممکن تھا۔ امریکہ کے پورے پورے صوبے بے آباد تھے۔ انسان کہاں غائب ہوگئے تھے؟ وہ شہروں کے فلک بوس پنجروں اور یکساں مکانات میں مقیم تھے۔ انسانوں کی کم نمائی کی وجہ سے اس سرزمین پہ ایک وسیع تنہائی محسوس ہوتی تھی۔ اس تنہائی کی وجہ سے میں بے حسی کا شکار ہوگیا۔ میں اپنی مرضی کے خلاف مادہ پرست اور مفاد پرست ہوگیا۔ میرے احساسات اور جذبات ہوا ہوگئے۔ میرا دماغ ایک حساب کرنے والی مشین بن گیا۔ اس نئی کیفیت میں میرے شب وروز بے کیف ہوگئے۔ امریکہ میں مجھے تحفظ مل گیا تھا، لیکن اس تحفظ کے عوض میں مجھے اس نئی سرزمین کے پتھرائے ہوئے عفریتوں کی بیگانگی بھی مل گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

میں شروع شروع میں اپنی مجلسیں پڑھنے کے بعد اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر صبح تک سگریٹ پیتے پیتے ٹی وی دیکھتا تھا۔ ٹی وی پر بے شمار کالی، گوری اور سانولی خواتین برہنگی کی حالت میں دعوتِ نفس دیتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے طرب نگر کی رنگین راتیں بے اختیار یاد آتی تھیں جب چند نوٹ دے کر صنفِ نازک کی لذیذ قربت میسر آتی تھی۔ ٹی وی کی خواتین طرب نگر کی رقاصاؤں سے آمیز ہوتے ہوئے مجھے تڑپاتی تھیں۔ اور ایک رات مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے ٹی وی بند کیا اور کمرے سے نکلا۔ ہوٹل کے باہر میں نے ایک کیب روکی اور کیب والے کو کسی رنگین جگہ لے جانے کو کہا۔ اس شہر میں بازارِ حسن ندارد تھا، سو کیب والا مجھے ایک 'جنٹل مینز کلب' پر لے کر گیا۔ اور جب میں جنٹل مینز کلب میں داخل ہوا، میں نے دیکھا کہ اندر شہر کے شب گردوں کا پورا لشکر میری گھات پر لگا بیٹھا تھا۔ نیم مدوّر صوفوں پر ان گنت دل جلے، نوخیز عشاق، طلاق شدہ خاوند اور خزاں رسیدہ شرابی بیٹھے ہوئے تھے، اور سب مصروفِ تماشا تھے۔ ان کے سامنے دو اسٹیج پر دو رقاصائیں ایک نیلی پیلی بیہودہ روشنی میں جھومتے جھومتے بے لباس ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک صوفے پر بیٹھ کر اسکاچ منگوائی اور شب گردوں کے لشکر نے مجھ پر نظریں دوڑائیں۔ میں شرما سا گیا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ حالانکہ میں یہاں پر کسی کو نہیں جانتا تھا، تاہم یہ سب افراد مجھے آشنا لگتے تھے۔ ان میں نہ کوئی تھے اور نہ سیّد، نہ رئیس تھے نہ فقیر، نہ مومن تھے نہ ذاکر، لیکن سب اتفاق سے میرے ہم مسلک معلوم ہوتے تھے۔ ہم سب کی کتاب انجیلِ غم تھی۔ ہم سب زندگی کے ہزیمت خوردگاں تھے، شہروں کے بن باسیے تھے، شراب کے رسیے تھے۔ ہم اپنے بن باس کا دکھ دور کرنے کے لیے شباب پر اپنی سب کمائیاں اڑاتے تھے۔ میں نے اس رات اس جنٹل مینز کلب میں آٹھ سو ڈالر خرچ کیے، اسکاچ اور شمپین کے بے حساب جام پیے، رقاصاؤں کے قدموں میں ان گنت نذرانے رکھے اور سینے سے میرا سارا غبار نکلا۔ اس خوشگوار تجربے کے بعد میں نے سب راتیں کسی نہ کسی جنٹل مینز کلب میں گزاریں۔ میرے لسانی وسائل محدود تھے۔ کسی سے گپ لگانا میرے بس سے باہر تھا۔ اور جب کوئی رقاصہ اپنا مجرا پورا کر کے اسٹیج سے اتر کر میری میز کے قریب آتی تھی اور پوچھتی تھی: ''ہاؤ آر یو ٹوڈے؟'' تو میں مسکرانے یا سر ہلانے پر قناعت کرتا تھا۔ میں اشاروں میں اس کو بیٹھنے کی دعوت دیتا تھا اور اپنی طرف سے اس کو شمپین پلاتا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے جام ٹکراتے تھے۔ اور جلد ہی شمپین کا دیا ہوا سرور

Scanned with CamScanner

ہمارے بیچ ایک بے لفظ مکالمہ بن لیتا تھا۔ میں ہر رات مدہوشی کی حالت میں اپنے شبستان پر واپس آتا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر مجھے قلق ہوتا تھا کہ برسوں پہلے میری پہلی عیاشیوں میں میرے استادِ محترم میرے شریک تھے اور اب ان پختہ بے راہ رویوں میں میرا ساتھی میری اجنبیت ہی تھی۔

میری شہرت امریکہ کی حدود سے آگے بڑھ گئی۔ بیرونِ ملک سے دعوتیں آئیں۔ ٹورنٹو، وینکوور، لندن اور اوسلو کے عزاخانوں میں میری آواز گونجی۔ پھر خلیج فارس اور افریقہ کے سادات مجھے یاد کرنے لگے۔ سو میں نے دوبئی، دوحہ، ماریشس اور مڈگاسکر کا سفر کیا۔ پھر دور دور کی جگہوں سے دعوتیں آنے لگیں اور میں سنگاپور، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے سادات کے پاس چلا گیا۔ میں اب ایک بین الاقوامی ذاکر بن گیا۔ میں ہر روز ایک نئے ملک میں پایا جاتا تھا۔ طیارے کے ناتمام سفروں کے دوران میں بزنس کلاس کی ایک آرام دہ سیٹ میں بیٹھ کر پشت پیچھے کر کے اسکاچ پیتے پیتے دیس پردیس کے اخبار کھنگالتا تھا، اور مجھے کہیں نہ کہیں وطن کی کوئی نہ کوئی خبر ملتی تھی۔

وطن کی خبریں حوصلہ شکن تھیں۔ میرے ملک پر ایک نیا غنیم قابض ہو گیا تھا جو پچھلے غنیم سے نسبتاً نرم مزاج تھا۔ اس کی نرمی دیکھ کر یزیدی بے لگام ہو گئے تھے۔ انھوں نے پورے ملک میں دھماکوں کا ایک ایسا سلسلہ چھیڑا تھا کہ ہماری دھرتی ایک قبرستان بن گئی تھی اور ہماری ندیاں شہدا کے خون سے سرخ ہو گئی تھیں۔ اخبار پڑھ کر میرا دل رنج و غصے سے پھڑکتا تھا۔ یہ رنج و غصہ مجلسوں میں اپنا پورا کام دکھاتا تھا۔ خیر و شر کی جنگ میری آواز کے میدان میں لڑی جاتی تھی۔ اس جنگ و جدل میں اہلِ خیر شر پسندوں سے ہمیشہ مات کھاتے تھے۔ سادات اور دیگر احرار ہزاروں کی تعداد میں کھیت ہوتے تھے۔ میرے الفاظ سن کر دنیا بھر کے سادات رو پڑتے تھے۔ اہلِ مجلس کو ایک گہرا صدمہ پہنچتا تھا، اور اس سے پہلے کہ وہ اس صدمے سے جانبر ہو جائیں، میں منبر سے رخصت ہو جاتا تھا۔ مجلس میں جو نیاز اور نذرانے ملتے تھے، میں جنٹل مینز کلب میں جا کر شراب اور رقاصاؤں پر خرچ کرتا تھا۔

صاحبزادی کے متعلق اخباروں میں مجھے اکثر خبریں ملتی تھیں۔ وہ غنیم کی آمریت سے بچنے کے لیے پردیس آئی تھیں اور میری طرح جہاں گردی میں مصروف تھیں۔ وہ اپنے بین الاقوامی جلسوں میں انھی سادات کی ڈھارس بندھاتی تھی جن کا میں اپنی مجلسوں میں دل توڑ چکا تھا۔ اور عجیب یہ تھا کہ

Scanned with CamScanner

ہم جو جہاں بھر میں ایک ہی نسل کے سامعین سے مخاطب ہوتے تھے، ہمیں کبھی باہم ہونے کا اتفاق نہیں ہوا۔

میں نے بہت سفر کیے تھے۔ مجلسیں پڑھنے کے واسطے میں نے کرۂ ارض کا دو تین مرتبہ طواف کیا تھا۔ اب آرام ضروری تھا۔ میں اپنے کچھ کرم فرماؤں کے خرچ پر میامی میں مہنگے سورج تلے استراحت کرنے چلا گیا۔

میامی میں سمندر کنارے کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں میرے لیے ایک سوئیٹ بک ہوئی تھی۔ سمندر سوئیٹ کی کھلی کھلی کھڑکیوں میں جھومتا تھا۔ سمندر میں سینکڑوں لوگ اشنان یا تیراکی کرتے تھے۔ ساحلوں پر ہزاروں سیاح ٹہلتے تھے۔ ان میں بہت سارے رستم تھے جن کے سینے فراخ تھے اور شانے کشادہ، اور بہت سی اپسرائیں تھیں جو کہ اپنے بدنوں پر سونے کا ایک لیپ لگاتی تھیں، اپنے شمس ناآشنا حسن کو دھوپ سے بچانے کے لیے۔ میں ان اساطیری کرداروں کو دیکھ کر احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا تھا، اور اس ناگوار احساسِ کمتری کے علاج کے لیے میں شام ڈھلے جنٹل مینز کلبوں میں بیٹھتا تھا۔ وہاں کوئی احساسِ کمتری نہیں تھا۔ سب لوگ میری طرح ہزیمت خوردہ تھے۔ میں جنٹل مینز کلبوں میں ناکام اداکاروں، غربت زدہ لکھ پتیوں اور جنونی جواریوں کے ساتھ جام ٹکراتا تھا۔ میں مقامی زبان بہتر طریقے سے بولتا تھا اور نسلوں کی پہچان رکھتا تھا۔ میں محض ایک نظر ڈال کر کسی کو ہسپانوی، آئرش، اطالوی یا یہودی بتا سکتا تھا۔ میں اسکاچ پیتے پیتے اور ننگی رقاصائیں دیکھتے دیکھتے رات بھر اپنے ہم مسلکوں کی رام کہانیاں سنتا تھا۔ میری عقل غافل تھی، میری مخمور آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں، لیکن میں ہر کہانی آخر تک سنتا تھا۔ ان لوگوں کی صحبت مجھے صرف اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے درکار تھی۔ میری ذات اس وسیع و عریض ملک کی آباد اور غیر آباد ویرانیوں میں بہت اکیلی تھی۔ اور حقیقت یہ تھی کہ اتنی ساری ننگی رقاصاؤں کا نظارہ کرنے کے بعد میں ایک عورت کی ہم بستری کے لیے تڑپنے لگا۔ ایک رات جنٹل مینز کلب کے ہم سبو نے مجھے بتایا کہ شہر سے کافی ہٹ کے ایک بدنام علاقے میں کچھ کالی عورتیں اپنا جسم بیچتی تھیں۔ میں نے جھٹ سے ایک بکاؤ جسم خریدنے کی ٹھان لی۔

اگلی رات جنٹل مینز کلب جانے کے بجائے میں نے ایک کیب میں بدنام علاقے کا رخ کیا۔

Scanned with CamScanner

جب میں اس علاقے میں پہنچا تو میں نے ایک کھیل کے میدان کے پاس ایک ویران بس اسٹاپ دیکھا۔ کچھ دوری پر ایک اشارے کی لال ہری روشنیاں دمک رہی تھیں۔ بس اسٹاپ اور اشارے کے درمیان ڈھیر ساری سیاہ فام کسبیاں سرگرداں تھیں۔ ان کی پیتل کی ٹانگیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں، ان کی آبنوس کی چھاتیاں انگیاؤں سے چھلک رہی تھیں، ان کی سرمہ آگیں آنکھیں گردوپیش کا جائزہ لے رہی تھیں، اونچی ایڑیوں والی جوتیاں ایک بے پناہ ضد کے ساتھ فٹ پاتھ کو جھاڑ رہی تھیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور فٹ پاتھ پر چلتی ایک سادہ سی دخترِ حبش پسند کر لی۔ میں اس کو کیب میں بٹھا کر اپنے ہوٹل لے کر گیا۔ پورے راستے میں اس کو گھورتا گیا۔ وہ گزارے کے لائق ہی تھی۔ جسامت معقول سی تھی، چہرہ نمک سے عاری نہیں تھا، جلد کافی حد تک تروتازہ تھی لیکن اس کی رانیں اور چھاتیاں اس قدر گول اور نرم تھیں کہ ان کو دیکھ کر میں انھیں سہلانے، چاٹنے اور چومنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ میری سوئیٹ میں آتے ہی میری دخترِ حبش نے غسلخانے کی راہ لی۔ غسلخانے کا دروازہ اس کی لاپرواعجلت کی وجہ سے کھلا رہ گیا اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنا بیگ کھول رہی ہے اور اندر سے ایک چھوٹی سی چلم نکال رہی ہے۔ پھر وہ چلم میں ایک خفیف سا دانہ ڈال رہی ہے، چلم جلا رہی ہے اور ایک لمبا کش لے رہی ہے۔ اسی لمحے ایک عجیب بو چاروں طرف پھیل گئی، ایک ربڑ کی سی بو جو کہ ہمارے یہاں کی فقیری کی بو سے دس گنا تیز تھی۔ دخترِ حبش اپنی چلم چھوڑ کر غسلخانے سے نکل آئی۔ وہ میرے وار سہنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ میں بے قابو تھا۔ رات بڑھتی گئی اور ہمارے جسم ملتے گئے، جڑتے گئے، ٹکراتے گئے، پلٹتے گئے۔ پروگرام پر پروگرام ہوئے، اور میری لذتوں نے مجھے بامِ فلک پر چڑھایا۔ ہر پروگرام سے پہلے دخترِ حبش نے غسلخانے میں جا کر اپنی چلم کے کش لیے۔ اور آخر کار مجھے کرید ہوئی۔ میں نے چلم پینے کی تمنا ظاہر کی، اور اس نے تھوڑی سی حجت کے بعد چلم بھری اور میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے ایک گہرا کش لیا اور اچانک اس نیارے مقام پر پہنچ گیا جہاں ابو اپنی چلم کے دوش پر پہنچا کرتے تھے۔ یہاں سب چیزیں وحدت کی غماز تھیں۔ دیروز، امروز اور فردا ہمنوا تھے اور خارج داخل کا آئینہ تھا۔ ابد کی صدائیں سن سن کے سب چیزیں چپ ہو گئی تھیں۔ بس آبِ حیات کے فواروں کی مدھم مدھم سرگوشیاں سماعت تک آتی تھیں۔ فوارے اپنی کانچ کی سی آواز میں ہردم گنگناتے تھے۔ میں نے دخترِ حبش کے ساتھ پو پھٹنے تک

Scanned with CamScanner

پروگرام کیے۔ پھر جب بڑی بڑی کھڑکیوں میں سویرے کی روشنی آنکھ مارنے لگی تو دخترِ حبش ایک گراں انعام لے کر میری سوئیٹ سے رخصت ہوگئی۔ میں نے احتیاطاً اس کا نمبر لیا تھا۔ اگلے دنوں میں میں نے اس کو روز بلایا۔ میں اس کے لذیذ جسم کا جتنا احسان مند تھا، اس کی طلسمی چلم کا بھی اتنا ہی ممنون تھا۔ دونوں نے اپنی فیاضی میں مجھے ہفت افلاک کا تماشائی بننے کا اعزاز بخشا تھا۔

میامی میں میری چھٹیاں لمبی ہوگئی تھیں۔ میں سات ہفتوں سے عزاخانوں سے غائب تھا۔ میں نے بے راہ روی کو اپنی روش بنا رکھا تھا۔ دخترانِ حبش کے تماش بینوں اور ولایتی فقیری کے خوگروں میں میرا شمار تھا۔ لیکن میرا دل آہستہ آہستہ پشیمان ہونے لگا تھا۔ سو میں نے ایک دن اپنے کرم فرماؤں سے رابطہ کیا۔ اتفاق سے ماہِ محرم چل رہا تھا اور میری مجلسیں امریکہ کے تمام عزاخانوں میں درکار تھیں۔ ایک طویل پروگرام میرے لیے مرتب ہوا۔ میں نے میامی سے اجازت لی اور نت نئی مجلسیں پڑھنے مختلف شہروں کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے اپنے پروگرام کی پہلی مجلس کینسس سٹی میں پڑھی۔ عزاخانے میں ریش دار حضرات اور محجوب مستورات دیکھ کر مجھے دھچکا لگا، کیونکہ سات ہفتوں سے میرے آس پاس میں صرف عریانیاں تھیں۔ لیکن مجلس کے دوران میری دبی ہوئی شرافت نے سر اٹھایا اور میرے مزاج نے میامی والے شہدے پن کو خیرباد کہا۔ اس مجلس کے بعد مہتمموں نے مجھے ایک دیسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھلایا، اور وطن کی خبریں سنائیں۔ تازہ خبریں یہ تھیں کہ غنیم نو نے عوام کو اپنی اعتدال پسندی کا قائل کرنے کے لیے صاحبزادی کو وطن آنے کی اجازت دی تھی۔ صاحبزادی جس دن وطن آئی تھیں، یزیدیوں نے ایک خودکش حملے سے ان کی پذیرائی کی تھی۔ وہ بال بال بچی تھیں لیکن ان کے بیسیوں حامی اور شیدائی اس حملے میں وفات پا گئے تھے۔ اب چونکہ صاحبزادی غنیم نو کی نااہلی اور یزیدیوں کی طاقتوری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی تھیں، اس لیے عوام لاکھوں کی تعداد میں اپنی جان داؤں پر لگا کر ان کے جلسوں میں آتے تھے۔ عوام کا ہر کس وناکس سرفروشی سے ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ غنیم نو اور یزیدی صاحبزادی کی مقبولیت سے خفا تھے۔ ان روسیاہوں کی نگاہِ بد صاحبزادی پر جمی تھی۔ کینسس سٹی کے مہتمموں سے یہ خبریں سن کر میں کانپنے لگا۔ بہت سال پہلے کا ایک خواب مجھے اچانک یاد آیا تھا۔

Scanned with CamScanner

کینسس سٹی سے میں سان فرانسسکو چلا گیا، اور سان فرانسسکو چھوڑ کر میں نے آٹھ دس شہروں کا پھیرا لگایا۔ سب عزاخانوں میں سامعین آپس میں صاحبزادی کی باتیں کرتے تھے۔ ان کی سرفروشی اور ان کے شوقِ شہادت کو سراہا جاتا تھا۔ میں یہ تعریفیں سن کر پریشان ہو جاتا تھا۔ میں اندر اندر صاحبزادی سے جلنے لگا۔ لیکن اس جلن کی ضرورت ہی کیا تھی؟ میں کس معاملے میں ان کی برابری کر سکتا تھا؟ میں محض ایک لذتیا ذاکر تھا۔ میں نے اتنی شہادتیں سنائی تھیں کہ شہادت میرا نام سن کر بھاگ جاتی تھی۔ اور میں نے اتنے گناہ کیے تھے کہ احساسِ گناہ ختم ہو گیا تھا۔ موت میری دانست میں ایک انعام نہیں بلکہ ایک ناانصافی تھی۔ میری زندگی دنیاوی مزوں کی محتاج تھی۔ دنیا کے سوادتیا گنے پر میرا دل آمادہ نہیں تھا۔ سو میں اس اجنبی سرزمین پر موجیں کرتا رہا، مزے لوٹتا رہا۔ میں نے مزید مجلسیں پڑھیں، اور مزید جنٹل مینز کلبوں کا جائزہ لیا۔ مزید اسکاچ پی۔ پھر ایک روز یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

میں اس دن مجلس پڑھنے واشنگٹن جا رہا تھا۔ میں نے طیارے میں اپنی سیٹ کے پاس ایک تازہ اخبار دیکھا۔ اخبار اٹھا کر میں نے شہ سرخیاں پڑھیں، اور ایک خبر نے مجھے چونکا دیا۔ میرے وطن کی صاحبزادی دارالحکومت کے ایک تاریخی باغ میں ایک عوامی جلسے کے بعد شہید ہو گئی تھیں۔ آخر کار یزیدی، جو ازل سے ان کے تعاقب میں تھے، ان کی جان لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اخبار کی شہ سرخیاں دم کے دم میں میرے بے بس اور نکمے آنسوؤں سے تر ہوئیں۔ ایک ڈراؤنا خواب پورا ہو گیا تھا۔ ایک رُلانے والے ذاکر کو رُلایا گیا تھا۔ میرا صنم، میرا آدرش رحلت کر گیا تھا۔ میرا نصف حصہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا۔ میں آنسوؤں کے سیل کو روکنے کے لیے آنکھیں میچ رہا تھا۔ اور طیارے میں ایک اعلان ہوا۔ ہم کچھ ہی دیر میں واشنگٹن کے ہوائی اڈے پر اترنے والے تھے۔ یہ اعلان کسی دور افتادہ برف زار سے آ رہا تھا۔ جاڑا پڑنے لگا۔ میرے اعضا تھرتھرانے لگے، اور میرے وجود میں کہرے کا پردہ گر پڑا۔ ٹھنڈ کی شدت کو جھیلنے کے لیے مجھے پینا تھا، بے حساب پینا تھا۔ نیچے، زمین پر، واشنگٹن شہر کے شراب خانے کھل رہے تھے اور اوپر، طیارے میں، میں ان میں آسرا لینے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

واشنگٹن شہر اندھیرے کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ بارش شروع ہوئی تھی اور ہوائیں جاگ اٹھیں

تھیں۔ فٹ پاتھوں پر چھتریوں کا میلہ زوروں پر تھا۔ فٹ پاتھوں کی بھیگی بھیگی چمڑی پر گاڑیوں اور دکانوں کی بوقلموں بتیاں عکس ریز تھیں۔ میں نہ جانے کب سے، اس مجلس سے سراسر بے نیاز جس کے لیے میں اس شہر میں آیا تھا، اپنے غمگین اور گراں دل کی سولی اٹھا کر روشن اور سیال فٹ پاتھوں پر قدم بڑھائے جا رہا تھا۔ میرا پورا دن شراب خانوں کی زیارت میں بیت گیا تھا۔ میں سخت نشے میں تھا۔ شہر کے راہگیر میری آنکھوں سے اوجھل تھے۔ میں ان سے ٹکراتا تھا، وہ چند الفاظ بول دیتے تھے۔ ان الفاظ کو میں سن نہیں پاتا تھا، چونکہ میں مزید راہگیروں سے ٹکرانے کے لیے آگے بڑھ چکا ہوتا تھا۔ اس میلے جھمیلے میں مجھے لگ رہا تھا کہ ہر کوئی میری طرح بدمست ہے۔ اس انجان شہر میں مدہوشی میری خضرِ راہ تھی اور میرا املال زدہ دل ایک آخری آسرے کا متلاشی تھا۔ اچانک ایک سڑک کے نکڑ پر 'آرچی بالڈ جنٹل مینز کلب' کا بورڈ مجھے دکھائی پڑا۔ کیا میں کرب والم کی اس کیفیت میں عورتوں کی فحاشیوں کی پذیرائی کر سکتا تھا؟ میں کر سکتا تھا شاید۔ فحاشی میں ازل سے بڑے بڑے راز اور پیغام مضمر ہیں۔ فحاشی کا سامنا کرنا ناگزیر تھا۔ میں نے آرچی بالڈ کا بھاری دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

اندر تاریکی کا ریشم پھیلا ہوا تھا اور گرمی بہت شدید تھی۔ یوں لگا گویا میں حضرت یونس کی مچھلی کے پیٹ میں پہنچا تھا۔ اس مچھلی کے تاریک اور گرم پیٹ میں دو عریاں جسم جلوہ خیز تھے۔ دو الگ اسٹیج پر، دو پول کے گرداگرد، دو بے لباس رقاصائیں گھوم رہی تھیں۔ میں اسٹیج کے درمیان بیٹھ گیا، اور میں نے آرچی بالڈ کے بے نام ساقی سے ایک اسکاچ مانگی۔ اسکاچ کا ایک ڈرنک میرے پاس آیا جسے میں نے دو گھونٹ میں پی لیا۔ میرے نشے نے ایک اور مرحلہ طے کیا۔ میں نے اپنی ڈانواڈول نظریں بائیں والے اسٹیج کی رقاصہ پر جمائیں۔ رقاصہ ایک دخترِ حبش تھی جس کا کل پہناوا دو لمبے چمڑے کے بوٹوں پر مشتمل تھا۔ اس کی بے عیب اور بے داغ جلد، چوبِ صندلی میں ترشی ترشائی، اس کی اصلی پوشش تھی۔ وہ اپنے پول کے گرد گھومتے گھومتے ایک ٹانگ اٹھا کر رانوں کا سنجوگ دکھاتی تھی، اور میرا جی بہت چاہ رہا تھا کہ میں اس کے آگے کوئی نذرانہ پیش کروں، لیکن میرے ضمیر نے مجھے روکا۔ اس دخترِ حبش کی عریانی بے مطلب تھی، اس کا رقص رائیگاں اور بے معنی تھا۔ اس کا جسم روح سے عاری تھا۔ اس کا وجود بے بنیاد تھا۔ اس کے سامنے کیا نذرانہ پیش کرنا تھا؟ میں نے دوسرے اسٹیج پر نظریں دوڑائیں۔ دوسرے اسٹیج کی رقاصہ بے حد شانت تھی۔ وہ حاضر اور غیبی تماش بینوں کی شہوانی

Scanned with CamScanner

نظروں سے بے پروا، ست روی سے اپنے پول کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس کی عریانی علامت تھی اس کے عجز کی۔ اس کا رقص فنا کی طرف ایک دعوت تھا۔ میں نے اس کو غور سے دیکھا۔ بدن نازک تھا، بال سیاہی مائل تھے، چہرہ سانولا تھا، مژگاں دراز تھے اور آنکھیں سرمہ آگیں تھیں۔ یہ حلیہ بشرہ دیکھ کر مجھے طرب نگر کی لڑکیاں بے اختیار یاد آئیں۔ اسی طرح کی دوشیزائیں سر پر چادر لیے، بانہوں کو لمبی آستینوں سے ڈھانپ کر طرب نگر کے کالجوں کے گرد ونواح میں سویرے سویرے دیکھی جاسکتی تھیں۔ وہی لڑکیاں شام کو اپنی ماؤں کے ساتھ بازاروں کی افراتفری میں خریداریاں کرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ رات میں وہ درگاہوں کے صحنوں میں پاک درختوں پر دھاگے باندھتی تھیں۔ ماہِ رمضان میں وہ سارے روزے رکھتی تھیں اور ماہِ محرم میں ٹی وی میں مجھ جیسے ذاکروں کی مجلسیں دیکھ کر بدکتی تھیں۔ یہ رقاصہ ایک نذرانے کی مستحق تھی۔ میں جیبیں ٹٹول ٹٹول کر اس کے اسٹیج کی طرف پاؤں بڑھانے لگا۔ سو ڈالر کا ایک نوٹ دائیں جیب سے نکلا۔ یہ نوٹ تھام کر میں اسٹیج کے سامنے کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا۔ رقاصہ اپنا پول چھوڑ کر میرا نذرانہ قبول کرنے میری طرف آئی، اور میں نے اس کے سینے میں کوئی ڈگمگاتی چیز دیکھی۔ وہ ایک تعویذ تھا۔ رقاصہ نے قریب آ کر ایک مخصوص محویت سے اپنی دائیں ٹانگ میری طرف پھیلائی۔ اس ٹانگ پر ایک سفید گارٹر نمایاں تھا جس میں میری سحر زدہ انگلیوں نے بے دھیانی سے سو ڈالر کا نوٹ گھسیڑا۔ دراصل میری آنکھیں اس کے تعویذ کی جانب نگراں تھیں۔ تعویذ میں جو دعا محبوس تھی، اس کا ایک ایک حرف میری آنکھوں میں آشکارا ہو رہا تھا۔ اس دعا کے راستے خالقِ کون ومکاں کی تجلیاں میری ذات پر نازل ہو رہی تھیں۔ ان تجلیوں کی توانائی ایسی تھی کہ میری ذات ان کے ہالے میں آ کے اتنی ہی برہنہ تھی جتنی کہ میرے آگے اس تعویذ والی رقاصہ کا تن۔

کیا میں ایک غیبی سازش کے دام میں آیا تھا؟ جی ہاں۔ لیکن اس سازش میں میری اصلاح مقصود تھی۔ میرے وطن کی ایک شائستہ دوشیزہ نے اس تعویذ کا مظاہرہ کرنے کے لیے لاتعداد پردیسیوں کے سامنے اپنے سارے کپڑے اتارے تھے۔ اور اس مظاہرے سے میں بے حد متاثر ہو رہا تھا۔ میرا خالق مجھے اپنی متعدد آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کے سامنے میں ندامتوں کا ایک پلندہ تھا۔ میرے پاؤں تلے زمین آہستہ آہستہ سرک رہی تھی اور میں سوالوں کے نرغے میں تھا۔

Scanned with CamScanner

میں اس پردیسی مجرا خانے میں کیا کر رہا تھا؟ میں اپنے وطن میں کیوں نہیں موجود تھا؟ جب صاحبزادی شہید ہوگئی تھیں، اور میرے وطن کے سادات روسیاہوں کی زد میں تھے، تو میں یہاں عیاشیوں کی افیم پینے میں کیوں مصروف تھا؟ مانا کہ شہادت میری پہنچ سے باہر تھی، لیکن میں کم از کم اپنے بھائیوں کا ساتھ دے سکتا تھا۔ خبردار! اگر میں نے وطن واپسی میں مزید تاخیر کی، صاحب لازوال میرا کوئی گناہ نہیں بخشیں گے۔ میں نے راضی بہ رضا گھر لوٹنے کا فیصلہ کیا۔

وطن کا ماحول خون آلود تھا۔ صاحبزادی کی شہادت کے بعد یزیدیوں کی کارروائیاں تیز اور وسیع ہوگئی تھیں۔ وہ اب سرکاری عمارتوں کو ہدف بناتے تھے۔ عدالتیں، تھانے، اسکول، اسٹیشن اور تفتیشی مراکز ان کے خودکش حملوں سے تباہ ہو رہے تھے۔ غنیم نو ان کے آگے بے بس تھا۔ اس کی پولیس اور اس کی فوج ساحلوں سے اس سیل بلا کا نظارہ کر رہی تھی۔

اس ماحول میں سادات بہت ہراساں تھے۔ ان کی پوری صفیں تلف ہوئی تھیں۔ مزید اِتلافوں کا خدشہ تھا۔ اب سب کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ پہلی والی جاں نثاری بگڑتے حالات کی نذر ہو گئی تھی۔ سادات نے اپنے تحفظ کی خاطر کچھ تدبیریں اپنائی تھیں۔ تعزیے پولیس کی نفری کے ساتھ نکالے جاتے تھے، جلسے خفیہ جگہوں پر برپا ہوتے تھے اور مجلسیں صرف اہم موقعوں پر پڑھی جاتی تھیں۔ اپنے وطن لوٹ کر میں نے ذاکری کو جاری رکھنا چاہا تھا، لیکن اس دہشت زدہ ماحول میں مجھے مہینے میں صرف دو یا تین بلاوے آتے تھے۔ مجلسوں سے مجھے کوئی خاص آمدنی نہیں ملنے والی تھی۔ میری خوش نصیبی تھی کہ میں نے پردیس میں ایک خاطر خواہ سرمایہ جمع کیا تھا جس پر برسوں تک میرا گزارہ چل سکتا تھا۔ میں ان دنوں میں فارغ کا فارغ تھا۔ لیکن اس فراغت کے باوجود شعر مجھ سے لکھے نہیں جاتے تھے۔ ملکۂ سخن مجھ سے روٹھی ہوئی تھی، اور میں اسے منانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کرتا تھا۔

وطن لوٹ آنے کے بعد میں نے طرب نگر کے سب سے بڑے ہوٹل میں سکونت اختیار کی تھی۔ یزیدیوں نے مجھے اپنی طرف سے واجب القتل ٹھہرایا تھا۔ میں اب صرف ایک بند اور ناقابل رسائی عمارت میں محفوظ تھا۔ اس ہوٹل میں، جس کے گرد و پیش ایک اونچی فصیل کھڑی تھی، اور جس کے

Scanned with CamScanner

چاروں دروں پر سکیورٹی والے نوواردوں کی تلاشی لیتے تھے، میں سلامت تھا۔ میں صرف مجلسیں پڑھنے کے لیے اپنے ہوٹل سے باہر آتا تھا، اور جب مجلسوں کی خاطر دور دور علاقوں کے لیے نکلتا تھا تو پورے راستے میں پولیس کی گاڑیوں کا ایک لمبا قافلہ میرے ہمراہ ہوتا تھا۔ میں اپنے ہوٹل میں محفوظ تھا، لیکن ہر رات ملک الموت میرے سرھانے آنے میں کامیاب ہوتا تھا۔ وہ میرے چہرے کے آگے اپنا چہرہ رکھتا تھا۔ اس کی زرد آنکھیں میرا خوفزدہ گوشت تولتی تھیں۔ اس کی یخ سانسیں میری گرم سانسوں کا محاصرہ کرتی تھیں۔ اس کے نیلے لب مجھے ساتھ آنے کو کہتے تھے۔ میں اپنی جاں بخشی کے لیے منتیں کرتا تھا۔ میں جھوٹ بول کر مہلت مانگتا تھا۔ میں عرض کرتا تھا کہ میرے کچھ کام تا حال تکمیل کے محتاج تھے۔ کچھ لازمی فرائض کو نبھانا تھا۔ کچھ اہم خدمات کو انجام دینا تھا۔ ملک الموت رحم دل ہونے کے علاوہ زود اعتبار بھی تھا۔ وہ میری باتوں میں آ تا تھا۔ مجھے اپنی مطلوبہ مہلت ملتی تھی۔ میں پھر آگے اپنے بیان سے مکرتا تھا۔ نہ فرائض کی ادائیگی ہوتی تھی، نہ خدمات کی انجام دہی۔ میں ست کا ست تھا اور کل وقتی فرصت کا مزہ لوٹتا رہتا تھا۔

میں فراغت کے اس عالم میں دن بھر اپنی کھڑکی سے دنیا دیکھتا تھا۔ ہوٹل کی فصیلوں کے آگے ایک خیاباں گزرتی تھی۔ اس خیابان پر بیشتر وقت ایک بے ہنگام سا ٹریفک رواں تھا۔ میں گھنٹوں وسکی پیتے پیتے خیابان کا نظارہ کرتا تھا اور اس زمانے کو یاد کرتا تھا جب میں ٹریفک میں شریک ہونے کا مجاز تھا۔ شام کے وقت میامی کی فحش یادیں مجھے ستانے لگتی تھیں اور مجھے کھڑکی اور خیابان کے سامنے یہ اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ اس شہر کی سیاہ فام کسبی اور اس کی پردیسی چلم کی صحبت میں میں نے اپنی زندگی کے عمدہ ترین لمحے گزارے تھے۔ اس زندگی میں بے راہ روی ہی مجھے خوش کر سکی تھی۔ سو میں نے کسبیوں کے ساتھ پھر سے ربط وضبط بڑھایا۔

کسبیاں میرے ہوٹل میں آتی رہتی تھیں۔ ہوٹل کی انتظامیہ مہمانوں کی سہولت کے لیے ان کی آمدورفت سے آنکھیں پھیرتی تھی۔ ہوٹل کے ویٹر اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ہر ایک کے پاس دس بارہ لڑکیوں کے فون نمبر تھے۔ میں ان ویٹروں کے ذریعے ہر ہفتے عموماً تین چار لڑکیاں منگواتا تھا۔ مجھے نت نئے جسموں کا سواد لینے کا شوق تھا۔ میں ہر لڑکی کے ساتھ فقط ایک رات گزارتا تھا۔ اور میری راتیں اتنی رنگین اور فاعل تھیں کہ ملک الموت شرمندہ ہو کر میرے سرھانے سے

Scanned with CamScanner

پلٹتا تھا۔صبح ، جب میرا سارا بدن ٹوٹنے کو ہوتا اور میرے کان لڑکی کی نقلی آہیں سن سن کر پک چکے ہوتے ،تو میرا دل تنہائی کے لیے بے چین ہوتا تھا۔ میں لڑکی کو بڑے بڑے نوٹ پکڑا کر بھگا دیتا تھااور اپنی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر، ایک آخری جام پیتے پیتے، چڑھتے سورج کا نظارہ کرتا تھا۔ اذانیں تنبیہوں کی سی درشتی سے فضا میں گونجتی تھیں۔خیابان پر صرف کتے اور جمعدار نظر آتے تھے۔ میں اپنا جام خالی کرنے کے بعد نیند کے پاتال میں اتر جاتا تھا۔اور نیند کا پاتال ان دنوں میں اس قدر تیرہ اور تاریک تھا کہ خواب اس کی گہرائیوں سے گزرنے میں ناکام رہتے تھے۔

ایک دن میرے کمرے کے دروازے پر ایک دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک لڑکی میری دہلیز پر کھڑی تھی۔اس نے اپنے دوپٹے سے ڈھانکے ہوئے سینے سے ایک کاپی کے ساتھ میرا پہلا مجموعۂ اشعار چمٹایا تھا۔اس نے فوراً کہا،'' سلام علیکم۔سر، میرا نام ثنا تبسم ہے۔میں ایم اے اردو کی طالبہ ہوں۔ میں آپ کی غزلیات کے متعلق ایک مقالہ لکھنا چاہتی ہوں۔آپ سے کچھ سوال پوچھنے تھے۔''میں نے اس کو بے یقینی سے دیکھا۔جب میں یہاں پوری حفاظت سے رہتا تھا، یہ لڑکی میرے پاس کیسے آئی تھی؟ بہرحال اس لڑکی سے کوئی ایسی بو نہیں آ رہی تھی۔وہ مڈل کلاس کی ایک پڑھی لکھی لڑکی نظر آ رہی تھی۔اس کے گالوں میں شرمساری کی سرخی تھی اور فرطِ انکسار اس کا سر جھکا رہی تھی۔میں نے اس کو اندر آنے کو کہا اور اپنے کمرے کے صوفے پر بٹھایا۔ میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا،اور اس سے پہلے کہ میں چائے پانی کا پوچھوں، وہ گویا ہوئی:'' سر، میں آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گی۔سر، مجھے آپ کے تخلیقی سفر کے حوالے سے کچھ پوچھنا تھا۔''میں نے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔اس کے پاکیزہ لباس کے اندر اس کا مزیدار جسم پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔اس کی لمبی آستینوں میں دو نفیس بازو بل رہے تھے۔اس کی چست شلوار میں دو گداز رانیں جھوم رہی تھیں۔اس کی باریک قمیص میں : جاندار چھاتیاں ڈول رہی تھیں۔ یہ لڑکی میری تیکھی نظروں کے آگے آرچی بالڈ کی تعویذ والی رقاصہ کی طرح برہنہ تن تھی۔ میں نے کہا،''پوچھیے،''اور اس نے اپنا پہلا سوال داغ دیا:'' آپ نے پہلا شعر کس عمر میں کہا؟''میں نے سنجیدگی سے جواب دیا، ''چودہ سال کی عمر میں۔'' ''اس کی شانِ نزول یاد ہے؟''میں نے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ

Scanned with CamScanner

کہا، ''میں ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا تھا۔ وہ بالکل آپ کی طرح تھی۔'' ثنا اپنی کاپی میں میرے جواب قلمبند کر رہی تھی۔ میرے اس جواب کے بعد اس کی پنسل رک گئی اور اس کے حیادار گالوں کی سرخی تیز ہوگئی۔ میں اچانک اپنی کرسی سے اٹھ کر صوفے پر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اب اس کی سانسیں قریب تھیں اور میری گردن ان سانسوں سے مس ہو رہی تھی۔ ان سانسوں کے لمس اور مشک سے میں مدہوش ہوتا جا رہا تھا۔ میں رفتہ رفتہ بہک رہا تھا۔ ثنا نے میرے عجیب رویے کو درگزر کر کے اپنا اگلا سوال پوچھا: ''آپ نے کن استادوں سے اصلاح لی؟'' اب میں ہوش کھو بیٹھا تھا۔ میں نے ثنا کو اپنی آغوش میں لیا اور اس کے معصوم لبوں پر اپنے بزرگانہ لب جمائے۔ اس نے پورے زور سے اپنا منھ ہٹایا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں اس کام کے لیے نہیں آئی ہوں۔'' لیکن بے خودی نے میرے کان بند کر دیے تھے۔ میں نے اس کو اپنی بانہوں میں گھیرا، اس کے لبوں کو اپنے لبوں سے مسدود کر دیا، اور اس کی قمیص کے گلے میں ایک ہاتھ ڈالا۔ ثنا ہانپ رہی تھی۔ وہ پوری طرح میرے نرغے میں تھی۔ میرا ہاتھ اس کی چھاتیوں کو دبوچ رہا تھا اور میرے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر چسپاں تھے۔ میری خشک زبان ان ہونٹوں سے پرے ایک نخلستان کی تلاش کر رہی تھی۔ ثنا کی کاپی، پنسل اور کتاب باری باری فرش پر گر گئی، اور اس نے واجبی سی مزاحمتوں کے بعد یہ کہہ کر ہتھیار ڈالے: ''سر، میں کنڈوم کے بغیر پروگرام نہیں کروں گی۔''

ثنا نے دم کے دم میں اپنے کپڑے اتارے۔ پھر وہ صوفے پر دراز ہوگئی اور میں نے اس کی ذات میں اپنے بدن کے کانٹے پیوست کیے۔ ثنا اختلاط کے دوران خاموش اور بے پروا تھی۔ نہ وہ لذت کی آوازیں نکال رہی تھی نہ درد کی آہیں بھر رہی تھی۔ وہ ایک عجیب فرمانبرداری سے، زبان پر ایک حرف لائے بغیر، اپنے جسم سے مجھے استفادہ کرنے دے رہی تھی اور اس کی خاموشی مجھے تمام جنسی کام کرنے کی اجازت دے رہی تھی۔

میں فارغ ہوگیا۔ ثنا نے میرے تخموں کو صوفے کے ایک تکیے سے پونچھا اور فوراً اپنے کپڑے سمیٹنے لگی۔ اس نے کہا، ''مجھے جانا ہے۔'' میں اس کو افسوس سے دیکھ رہا تھا۔ ایک غیر متوقع اداسی مجھ پر حاوی ہو رہی تھی۔ وہ فی الحال کپڑے پہن رہی تھی۔ وہ چند منٹ میں میرے دائرے سے نکلنے والی تھی، اور میں پہلی دفعہ ایک عورت کو اپنے پاس روکنا چاہ رہا تھا۔ روکنا خیر ناممکن تھا۔ میں نے

Scanned with CamScanner

اس سے صرف نمبر مانگا، اور اس نے ایک موبائل نمبر دے کر کہا، ''یہ میری امی کا موبائل نمبر ہے۔ موبائل گھر پر ہوتا ہے۔ آپ نے صرف خدیجہ کا پوچھنا ہے اور میری امی آپ سے میری بات کرائے گی۔'' اب وہ دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے سینے سے چمٹی ہوئی پنسل، کاپی اور کتاب مجھے الوداع کہہ رہی تھی۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے اس نے شرمندگی سے پوچھا، ''اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ برا تو نہیں منائیں گے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا اور وہ اپنے اُوازار لہجے میں گویا ہوئی، ''میری ماں بیمار ہے۔ گھر میں اس کی دوائیوں کے پیسے نہیں ہیں۔ مجھے پانچ ہزار روپے ادھار دیں گے؟'' میں نے اپنے بٹوے سے پانچ نہیں بلکہ دس ہزار روپے نکالے۔ اس نے نوٹ پکڑے، ''تھینک یو'' کہا اور دروازہ کھول کر چل پڑی۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ وہ کون تھی؟ کوئی کسبی یا کوئی شریف لڑکی؟ اور وہ میرے پاس آنے میں کیسے کامیاب ہوئی تھی؟ یہ سوالات فی الحال اپنے جوابوں سے محروم تھے۔ اور یہ سوالات ویسے بھی غیر ضروری تھے۔ ایک سودا میرے سر میں سما چکا تھا۔ ثنا کی آرزو ایک ناگ کی سی بے رحمی سے مجھے ڈس رہی تھی۔

لیکن ثنا سے میری اگلی ملاقات کب ہو سکتی تھی؟ مجھے آنے والے دنوں میں طرب نگر سے غیر حاضر ہونا تھا۔ وطن کے ایک جنوبی شہر میں ایک مجلس پڑھنی تھی۔ بلاوے آج کل اتنے کم آتے تھے کہ اپنی کوئی بھی مجلس منسوخ کرنا مناسب نہیں تھا۔ سو میں جنوب کی طرف چل پڑا، پولیس کی بکتر بند گاڑیوں کے ایک قافلے کے ساتھ، اور میں نے سارے راستے میں سکوت اختیار کیے رکھا۔ لاتعداد موڑ آئے، لاتعداد قصبے گزر گئے، سورج ڈوب گیا اور کچھ گھنٹوں کے بعد ابھر آیا، اور میں اجالے اور اندھیرے سے بے خبر ساکت اور گم صم رہا۔ ثنا میری خاموشی کی وجہ تھی۔ اس کے متعلق سوالات کا ایک انبار میرے سر پر کھڑا تھا۔ یہ انبار بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے وزن سے میرے سر میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ اور آخر کار جب میں تیرہ گھنٹوں کے سفر کے بعد اپنی منزل پر پہنچا، میرا سر دراڑوں کی بھرمار کی وجہ سے پھٹنے کو تھا۔ اور جب میں نے اپنی مجلس چھیڑی، مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ میری آخری مجلس تھی۔

میرے پاس کم فرصت باقی تھی۔ یزیدیوں کا دام روز بروز پھیل رہا تھا۔ میں اس دام سے

Scanned with CamScanner

بچنے والا نہیں تھا۔ میری عمر گھٹ رہی تھی اور میرے گناہ بڑھ رہے تھے۔ اس آخری مجلس میں میں اپنے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔ سو میں نے اپنی پوری قوت سے سامعین کو رلایا۔ میدانِ کربلا پر سرجمع ہوئے تھے۔ پھر شہنشاہِ کربلا کا بریدہ سر اس انبار سے نکالا گیا تھا۔ سرِ حسین نے ایک سنان کی انی پر کربلا سے دمشق تک کا راستہ طے کیا تھا۔ راستے میں بے شمار صحرا، کوہسار، بیابان اور قصبے عبور ہوئے تھے اور آپ کے سرِ مبارک سے خون کے قطرے جابجا گرے تھے۔ اور قطرے جہاں جہاں گرے تھے وہاں وہاں یا کوئی گلزار ابھرا تھا یا کوئی چشمہ پھوٹا تھا۔ آپ کی نم آنکھیں پورے راستے میں کھلی رہ گئی تھیں، اور جن جن کوفیوں نے ان پاک نینوں سے اپنی گستاخ آنکھیں ملانے کی جسارت کی تھی، وہ توبہ کر کے ریگستانوں میں چھاؤں ڈھونڈنے چلے گئے تھے۔ میں ایک عجیب وحشت میں مبتلا تھا۔ میں نے مجلس کو سرِ حسین کی یاد میں طمانچے مار مار کر اپنے سروں کو پھوڑنے کو کہا، خونِ حسین کی عبادت میں اپنے خون سے عزاخانے کا فرش سجانے کو کہا، اور چشمانِ حسین کے احترام میں آنسو بہا بہا کر اپنی آنکھیں تباہ کرنے کو کہا۔ اور یہ کہتے کہتے میں نے منبر پر طمانچے مار مار کر اپنے سر کو لہولہان کیا، اپنی رگیں دانتوں سے کاٹ کر اپنے اردگرد خون کا ایک ہار بنایا، اور غضب کے آنسو رو رو کر اپنی آنکھوں کو نابینا کر دیا۔ میں اپنے موجودہ اور گزشتہ گناہوں کا کفارہ ادا کیے جا رہا تھا۔ میں کفارہ ادا کیے جا رہا تھا اپنی فطری بزدلی، اپنی مجرمانہ لاپروائی اور ام الخبائث سے اپنی دوستی کا۔ میں کفارہ ادا کیے جا رہا تھا بازارِ حسن میں اپنی عیاشیوں، مجرا خانوں میں اپنی فضول خرچیوں اور ہوٹلوں میں اپنی بے راہ رویوں کا۔ اور ہر کفارے کے بعد میرے کان خالقِ کون ومکاں کے دہانۂ منور کے قریب آ رہے تھے۔ اور اب ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ فرما رہے تھے کہ میری شہادت مزید تاخیر گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ میری بے کار زندگی اب صرف شہادت کے ذریعے رنگ لا سکتی تھی۔ اس خیر و شر کی طویل جنگ میں مجھے جلد از جلد اپنے عزیزوں کی طرح کھیت ہونے کا شرف حاصل کرنا تھا۔ لیکن اس شرف کے حصول سے پہلے مجھے ایک بار، ایک آخری بار، ثنا سے ملنا تھا۔ میں نے اپنی مجلس کے فوراً بعد طرب نگر کی طرف مراجعت کی۔

•

ہوٹل پہنچتے ہی میں نے ثنا کا نمبر ملایا۔ اس نے خود ہی فون اٹھایا۔ لیکن وہ میرے پاس آنے

Scanned with CamScanner

سے معذور تھی۔ اس کے سارے پیسے اس کی امی کی مہنگی دوائیوں پر خرچ ہوئے تھے۔ وہ بہت دور رہتی تھی اور اس کی جیب میں ویگن کے ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ان جملوں نے مجھے بہت دکھ پہنچایا، لیکن میں نے ڈھیروں اصرار کیا۔ وہ کہاں رہتی تھی؟ میں اس سے وہاں مل سکتا تھا۔ اس سے ملنا میرے لیے اشد ضروری تھا۔ اس کی ملاقات سے میری موت مشروط تھی — میری مطلوبہ موت۔ ثنا آخرکار میری ضد میں آ گئی۔ اس نے شہر کے ایک نو آباد علاقے کی نشان دہی کی۔ وہ اس علاقے کے ایک خالی فلیٹ میں مجھ سے ملنے آ سکتی تھی۔ مجھے اکیلے آنا تھا، اپنے محافظوں کے بغیر، تاکہ ہمسایوں کو شک نہ پڑے۔ میں نے اس کی ساری باتیں مان لیں۔

میں نے فون رکھا۔ میں اپنے آپ پر حیران تھا۔ جب مجھے معلوم تھا کہ خارجی فضا لعنتوں سے پر تھی، میں ایک مشکوک لڑکی سے ملنے کی غرض سے تن تنہا ایک انجان جگہ جانے پر کیوں بضد تھا؟ کیا پتا؟ ممکن تھا کہ ثنا یزیدیوں کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ ممکن تھا کہ یزیدی اس نو آباد علاقے کے کسی نکڑ پر میری گھات پر لگے بیٹھے تھے۔ عورت میری سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر یزیدی مجھے ختم کرنے والے تھے۔ ایک عورت سے ملنے کی جلدی میں میں ان کی گھات میں آ رہا تھا۔ میں نے احتیاطاً اپنا حلیہ بدلا، آنکھوں کو کالی عینک میں چھپایا، سر کو ایک نمازی ٹوپی سے ڈھانکا اور چہرے کو ایک پشمینے کی شال میں غائب کر دیا۔ پھر میں نے ایک آخری جام پی کر اپنی خطرناک منزل کا رخ کیا۔

ثنا کے فلیٹ پہنچنے میں مجھے پورے دو گھنٹے لگ گئے۔ میں ایک معمولی سے رکشے میں بیٹھ گیا تھا اور یہ رکشہ رخصت ہونے کے فوراً بعد شہر کے رش میں پھنس گیا تھا۔ ہر اشارے پر ہزاروں گاڑیاں رکی تھیں اور ہر گاڑی کے سوار ایک دائمی انتظار میں گرفتار تھے۔ شہر کی سب گھڑیاں گرمی سے پگھل چکی تھیں، لہٰذا شہر کے تمام سوار لازمانی کے اسیر ہو گئے تھے۔ لیکن میں لازمانی کی حدود میں نہیں تھا۔ مجھے جلدی تھی۔ میرا وقت تنگ تھا۔ رش سے بچنے کے لیے رکشہ والا کالونیوں کے اندر سے یا سروس روڈوں سے اپنی گاڑی نکال رہا تھا اور میں اس کے کندھے پر اپنا دستِ شفقت رکھ کر اس کو شاباشیاں دے رہا تھا۔ رش میں پھنسے ہوئے لوگ شیشوں سے گردنیں نکال کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میرا ضدی رکشہ تیز جا رہا تھا اور اس کے آگے شہر کو رش بجالانے پر مجبور تھا۔

ثنا ایک عمارت کی تیسری منزل کے ایک خالی فلیٹ میں میری منتظر تھی۔ آس پاس کی کھڑکیوں اور دروازوں سے روتے بچوں اور گھریلو لڑائیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں ثنا کے قرب کا انتہائی مشتاق تھا۔ میں نے اس کو اندر آتے ہی اپنی آغوش میں لیا اور فرش پر لٹا یا۔ پھر میں نے اس کی شلوار اتاری اور، فوراً، کھردرے فرش پر اس کے ساتھ ایک پروگرام کیا۔ ثنا، اپنی عادت کے مطابق، ایک برف کی سل بنی تھی۔ وہ نہ خوشی نہ غم کا اظہار کر رہی تھی۔ میں بے چین اور بے دم تھا۔ میں اس کے جسم کے کواڑ پر یوں دستک دے رہا تھا جیسے مفلس خیرات کے واسطے مزاروں کے دروازوں پر دیتے ہیں۔ اور جب ثنا کا کواڑ کھل گیا، میرے بیج پھوٹ پڑے اور میری آئندہ نسلیں ثنا کی کوکھ میں پھیل گئیں، میری تشنگی یکدم بجھ گئی۔ میری روح مطمئن تھی۔ میں نے موت کو ہرا کیا تھا۔

میں کھڑا ہو گیا اور ثنا کو تکنے لگا۔ وہ فرش پر لیٹی ہوئی تھی، میلی اور بدحواس۔ میں نے اپنے بٹوے سے دس ہزار روپے نکالے اور ثنا کو دکھاتے ہوئے درشتی سے کہا، ''یہ سارے نوٹ تمھیں مل جائیں گے، لیکن ایک بات بتاؤ۔ تم کون ہو، اور میرے پاس تمھیں کس نے بھیجا؟'' میرے نوٹوں نے ثنا کو حق گوئی کی راہ دکھائی۔ اس نے کمر سیدھی کر کے کہا، ''میں اصل میں نائیکہ کرتی ہوں۔ حالانکہ میں بی اے پاس ہوں، میری مجبوری ہے۔ میری کچھ دوست آپ کے ہوٹل میں کام کرتی تھیں۔ انھوں نے آپ کا بتایا اور...'' ''بس ٹھیک ہے!'' میں نے اس کا قطع کلام کیا۔ اس کا پول کھل گیا تھا۔ اس کا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ ثنا ایک معمولی سی کسبی تھی۔ اس نے مجھے اپنے ہی مفاد کے لیے پھنسایا تھا۔ یزیدیوں کے ساتھ اس کا جوڑ توڑ نہیں تھا۔ میں نے اس کو اپنے نوٹ پکڑائے۔ نوٹ پکڑتے وقت وہ پشیمان لگ رہی تھی، لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کس بات پر پچھتا رہی تھی۔ مجھ سے جھوٹ بولنے پر یا میرے سامنے سچ اگلنے پر؟ میں دروازے کی طرف بڑھ گیا اور دروازہ کھول کر مڑ گیا۔ میں نے ثنا کو الوداع کہا۔ پھر میں فلیٹ کے باہر آیا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

رات ہو گئی تھی۔ سیڑھیوں میں ایک آہنی اندھیرا میری گھات لگا رہا تھا۔ پھر ایک کھڑکی سے چاندنی جھانکنے لگی اور چاندنی کی نظریں کرنوں کا روپ دھارتی چلی گئیں۔ کرنیں مجھے زینوں کی ظلمت میں راہ دکھا رہی تھیں اور میرا سایہ میرے پاؤں گھسیٹ کر مجھے آگے لے جا رہا تھا۔ میں آخری سیڑھی سے اترا اور سڑک پر چلنے لگا۔ اب سڑک پر ہو کا عالم تھا۔ طرب نگر کے اس نو آباد علاقے کے مکیں اپنی

کمیں گاہوں میں چپ بیٹھے تھے۔ مجھے کوئی سواری ڈھونڈنی تھی۔آ گے،ایک چوک پر، دو تین رکشوں کی بتیاں دکھائی پڑیں۔ میری آس جاگ گئی۔ اس چوک پر سواری کا بندوبست ممکن تھا۔ میں اس کی طرف تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔ اس شانت سی سڑک پر چلتے ہوئے مجھے اچانک اپنے علاقے کا تھل یاد آیا—— وہ خاموش تھل جس کی پہنائیوں میں مَیں اور میرے ابورات کو پھرا کرتے تھے۔ ہمارے تھل کے سکوت اور اس سڑک کی شانتی میں کوئی بڑا فرق نہیں تھا۔ سڑک دراصل انتظار میں تھی۔ یہاں کوئی وی آئی پی حضرات عنقریب تشریف فرما ہونے والے تھے، جن کے لیے راہگیروں اور سواریوں کی آمدروفت کو پوری طرح معطل کیا گیا تھا۔ پھر، اچانک، ایک مشین میرے پیچھے گرج گئی۔ میں نے مڑکر دیکھا۔ ایک بائیک میری طرف آ رہی تھی جس پر دو نقاب پوش افراد سوار تھے۔ ڈرائیور کے پیچھے ایک فرد بیٹھا ہوا تھا جو کہ ایک بندوق سے لیس تھا۔ میں نے سانس روکی اور نادِ علی پڑھی۔ یزیدیوں کو میری ٹوہ لگی تھی۔ یزید کا رسالہ میرے پاس آ رہا تھا۔

یزید کے شہسوار مجھے قتل کر کے فرار ہو گئے تھے اور اب میرا جسم سڑک پر پڑا تھا۔ میں ہلنے سے قاصر تھا اور ایک ٹھنڈی ہوا میرے انگ انگ میں نفوذ کر رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ ایک لاش کی شکل اختیار کر رہا تھا اور گزشتہ ساعتوں کی فلم میرے تصور کے پردے پر مسلسل چل رہی تھی۔ یزیدیوں کی بائیک میری بغل میں رکی تھی اور جس فرد نے ہاتھ میں بندوق اٹھائی تھی اس نے مجھ پر نشانہ تان لیا تھا اور لبلبی دبائی تھی۔ گولیوں کے ایک برسٹ نے میرے تن کو جگہ جگہ سے چھلنی کر دیا تھا اور میں زمین پر گر پڑا تھا۔ ''شیعہ کافر!'' کا نعرہ ہوا میں گونج گیا تھا اور بائیک، ایک خشمگیں دیوتا کی طرح، گھن گرجتے ہوئے نکل پڑی تھی۔

میں سپاہِ شہدا کے رضاکاروں کی گولیوں سے مرا تھا۔ سلطانِ کربلا جنابِ عرشِ بریں پر مجھے بلا رہے تھے۔

میری روح میرے قفسِ فانی سے اڑ گئی اور اڑان کے دوران میری لاش ایک نقطے کی طرح خفیف ہو گئی۔ میری روح برق کی رفتار سے پرواز آزما تھی۔ وہ سڑک جس پر میری لاش پڑی تھی، سمٹتی گئی اور طرب نگر شہر کا پورا نقشہ اجاگر ہو گیا۔ چوک، سڑکیں، تالاب، محلے اور نالے دائروں، لکیروں،

Scanned with CamScanner

نقطوں اور مربعوں کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ پھر طرب نگر شہر مختصر ہوتے ہوتے کرۂ ارض کی پیشانی پر ایک تلک بن گیا اور اوپر آسمان میں ایک بے کراں گنبد آشکارا ہو گیا۔ اس گنبد کے بام پر ایک درخشاں دروازہ جلوہ نما تھا۔ اس کی دہلیز سے تجلی برس رہی تھی۔ میں اس دروازے کو پہچان گیا۔ وہ باب الشہدا تھا۔ میں نے اپنی پہلی مجلس میں اس کو دیکھا تھا۔ دہلیز پر بہتر سائے منڈلا رہے تھے۔ ان کے پیچھے ہزاروں قدیم اور جدید ہیولے میرے منتظر تھے۔ مجھے شک پڑا: کیا میری روح شہدا کی روحوں کی مانند فردوسِ بریں میں داخل ہونے والی ہے؟ اچانک، ہوا کے ایک زوردار جھونکے نے میری روح کو باب الشہدا کی مخالف سمت میں دھکیل دیا، اور اوپر سے ایک آواز گونجی۔ شہدا کے سردار مجھ سے میری بولی میں مخاطب ہو رہے تھے۔ وہ فرما رہے تھے: ''توں ساڈے کول آون دے لائق نئیں۔ تیڈی آخری مجلس تیڈے گناہواں دے کفارے واسطے کافی نئیں۔ تیڈے کفارے دے واسطے تینکوں اتھاں ای بہتر ہزار مجلساں پڑھن پوسن۔''

❋❋

## انتخاب

| | | | |
|---|---|---|---|
| منتخب تحریریں | گابریئل گارسیا مارکیز | ترتیب: اجمل کمال | (زیرطبع) |
| منتخب تحریریں | نرمل ورما | ترتیب: اجمل کمال | Rs.280 |
| منتخب کہانیاں | ویکوم محمد بشیر | ترتیب: مسعودالحق | Rs.180 |
| پریم وانی | میرابائی | ترتیب: سردار جعفری | Rs.395 |
| کبیر بانی | کبیر | ترتیب: سردار جعفری | Rs.395 |

## ناول

| | | |
|---|---|---|
| بیس سو گیارہ | محمد خالد اختر | Rs. 70 |
| گنگا جمنی میدان | اختر حامد خاں | Rs.120 |
| دائرہ | محمد عاصم بٹ | Rs.100 |
| نمبردار کا نیلا | سید محمد اشرف | Rs.60 |

## ناولوں کے ترجمے

| | | | |
|---|---|---|---|
| تمس | بھیشم ساہنی | ترجمہ: شہلا نقوی | Rs.180 |
| قلبِ ظلمات | جوزف کونریڈ | ترجمہ: محمد سلیم الرحمن | Rs.80 |
| بوف کور | صادق ہدایت | ترجمہ: اجمل کمال | (زیرطبع) |
| خیمہ | میرال طحاوی | ترجمہ: اجمل کمال | Rs.75 |
| نوکر کی قمیض | ونود کمار شکل | ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال | Rs.100 |
| پہلی بارش | خولیولیاما زاریس | ترجمہ: اجمل کمال | Rs.95 |
| سرزمین مصر میں جنگ | یوسف القعید | ترجمہ: اجمل کمال | Rs.125 |
| درخت نشین | اتالوکلوینو | ترجمہ: راشد مفتی | Rs.175 |
| شہزادہ احتجاب | ہوشنگ گلشیری | ترجمہ: اجمل کمال | Rs.70 |
| انگی کے دیس میں | ولاس سارنگ | ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال | Rs.150 |
| امید اور دوسرے خطرناک مشاغل | لیلیٰ العلمی | ترجمہ: محمد عمر میمن | Rs.100 |

Scanned with CamScanner

# آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

Scanned with CamScanner

## شاعری

| | | | |
|---|---|---|---|
| پریم وانی | میرابائی | ترتیب: سردار جعفری | Rs.395 |
| کبیر بانی | کبیر | ترتیب: سردار جعفری | Rs.395 |
| کلیات اختر الایمان | اختر الایمان | ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت | Rs.350 |
| مٹی کی کان | افضال احمد سید | (کلیات) | Rs.500 |
| روکوکو اور دوسری دنیائیں | افضال احمد سید | | Rs.50 |
| آدمی کی زندگی | فہمیدہ ریاض | | Rs.70 |
| ساری نظمیں | ذی شان ساحل | (کلیات) | (زیر طبع) |
| جنگ کے دنوں میں | ذی شان ساحل | | Rs.125 |
| ای میل اور دوسری نظمیں | ذی شان ساحل | | Rs.150 |
| نیم تاریک محبت | ذی شان ساحل | | Rs.100 |
| رات | سعید الدین | | Rs.50 |
| سائے چراغ کے | احمد عظیم | | Rs.150 |
| مٹی کا مضمون | فرخ یار | | Rs.150 |
| سویرے کا سیاہ دودھ | پاؤل سیلان | ترجمہ: آفتاب حسین | Rs.150 |
| بارہ ہندوستانی شاعر | (انتخاب) | ترتیب: اجمل کمال | (زیر طبع) |
| خودکشی کے موسم | زاہد امروز | | Rs.120 |

Scanned with CamScanner

# نئی کتابیں

## آج
(پہلی جلد)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.795

## ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ
ارشد محمود
R s.200

## تیسری جنس
سندھ کے خواجہ سراؤں کی
معاشرت کا ایک مطالعہ
مؤلف: اختر حسین بلوچ
Rs.200

## شہزادہ احتجاب
(ناول)
ہوشنگ گلشیری
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.70

## ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)
قاسم یعقوب
Rs.160

## اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)
(تیسرا ایڈیشن)
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs.250

## امید اور دوسرے خطرناک مشاغل
(ناول)
لیلیٰ العلمی
انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن
Rs.100

## اِنکی کے دیس میں
(ناول)
ولاس سارنگ
مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال
Rs.150

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 73 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، برزل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 800 روپے
بیرون ملک: 80 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

## بے یقین بستیوں میں

Rs.150

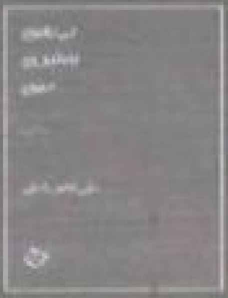

ذی شان ساحل

## وجہِ بیگانگی

Rs.150

فرخ یار

## مٹی کا مضمون

Rs.150

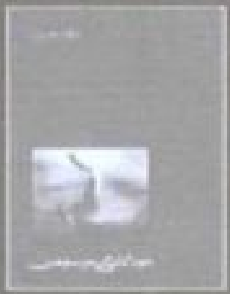

زاہد امروز

## خودکشی کے موسم میں

Rs.120

تنویر انجم

## زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی

Rs.350

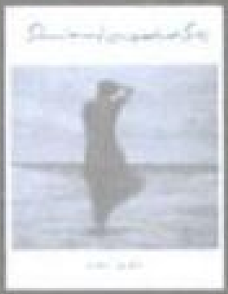

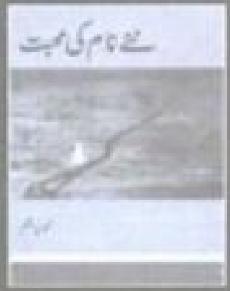


تنویر انجم

## نئے نام کی محبت

Rs.350

علی اکبر ناطق

## یاقوت کے ورق

Rs.200

Scanned with CamScanner

۴۷

قیمت

۳۸۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰